جَوہرِ اقبالؒ

جوہرِ اقبالؒ

جس میں

حکیم الامت علامہ اقبال کے چند ایسے رفیع الشان اور معرکۃ الآراء موضوعات فکر و نظر کی تفصیل سے تشریح و توضیح کی گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح میں ایک بنیادی عظمت و اہمیت رکھتے ہیں !!

تالیف

عبدالرحمٰن طارق

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ——— حیدر آباد ——— کراچی

طابع .. .. شیخ نیاز احمد

مطبع .. .. علمی پرنٹنگ پریس، اسپتال لاہور

اشاعت سوم ۱۹۷۸ء

قیمت .. .. ۲۵ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پبلشرز

ادبی مارکیٹ چوک انارکلی - لاہور

مردِ مُسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وُہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وُہ طوفان!

اقبالؒ

جوہرِ حکمت

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تُو!
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو!
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حُور!
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو!

اقبالؔ

فہرستِ مضامین

دیباچہ

میں تعلیماتِ اقبالؒ پر اس مجموعۂ مقالات میں زیادہ تر ایسے موضوع پیش کر رہا ہوں۔ جن کی عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو اشد ضرورت ہے اور جن کے بغیر ہمارے بنیادی عقائد اور اعمال بری طرح سے کمزور و متزلزل ہو رہے ہیں۔ قرآن و اسلام نے ہماری دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لیئے جو اصولی و اساسی عقائد و اعمال ہمیں نہایت خالص، روشن و واضح اور سہل و آسان صورت میں عطا کیے تھے۔ وہ زمانے کی کج رفتاری کے ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ مقتضیاتِ ہوا و ہوس، تاثراتِ رسم و رواج، بدعات و خرافات، جاہلانہ و غیر ذمہ دارانہ خطبات و مواعظ اور اثرِ صحبتِ اقوامِ غیر سے انتہائی طور پر غیر مستند و غیر خالص، تاریک و مکدر، دشوار و پیچیدہ اور ناقابلِ عمل دکھائی دینے لگے۔ پس میں نے اسی نوع کے عنوان منتخب کرتے ہوئے حتی المقدور پوری تفصیل و تشریح سے ان پر بحث کی ہے۔ مثلاً ہمارے وہ بنیادی عقائد و اعمال جن پر ہماری دنیوی و اُخروی فلاح و بہبود کا انحصار ہے، مندرجہ ذیل چیزوں پر مبنی ہیں۔

(۱) توحید:۔ میں نے اس موضوع کا ہر ممکن پہلو "اقبال کا فلسفۂ توحید" میں روشن و واضح کر دیا ہے۔

(۲) **اُسوۂ رسولؐ** ۔ توحید کے بعد دوسری اہم چیز ہے اتباعِ اسوۂ رسولؐ ۔ چنانچہ اس کی وضاحت " اقبال اور عشقِ رسولؐ " میں کر دی گئی ۔

(۳) **تقلید** ۔ نگاہِ انصاف سے دیکھیے تو تقلید نے ہمیں اصولِ توحید اور اتباعِ رسولؐ ہر دو سے محروم و بیگانہ کر دیا ہے ۔ اس موضوع کی وضاحت " اقبال اور مذمّتِ تقلید " میں ہوئی ہے ۔

(۴) **یقین** ۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ عہدِ حاضر میں مسلمان کے عقائد و اعمال سے روحِ یقین بالکل غائب ہو چکی ہے اور ہر عقیدہ و عمل پر شک و شبہ، تخمین و ظن اور تذبذب کا پورا غلبہ ہے ۔ چنانچہ " اقبال کی حکمتِ یقین " میں ایمان و یقین کی اصلاحی و تعمیری خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے شکوک و شبہات کے تخریبی عناصر کی مذمت کی گئی ہے ۔

(۵) **سرمایہ و محنت** ۔ دورِ حاضر میں معاشرہ کا اقتصادی و معاشی نظم و توازن کچھ ایسی بری طرح پراگندہ ہو رہا ہے اور عدل و حق شناسی اس حد تک نابود ہے کہ نوعِ انسانی حقیقی امن و عافیت سے بالکل محروم ہو چکی ہے ۔ ان حالات میں بالخصوص " اسلام " کا نظامِ معاشی دنیا کی موجودہ اقتصادی بدنظمی کا کیا حل پیش کرتا ہے ؟ —— اس کا ایک واضح اور غیر مبہم جواب " اقبال اور سرمایہ و محنت " میں ملاحظہ فرمائیے ۔

(۶) **درسِ حریّت** ۔ حریّت مسلمان کا ایک فطری و پیدائشی حق ہے ۔ بلکہ یوں کہیے کہ مسلمان کی تخلیق و تولید ہی عنصرِ حریّت سے ہوئی ہے ۔ پس مضمون ۔ ــ

"اقبال کا درسِ حریت" جہاں حریت کے اسلامی و فطری تاثرات و مفادات کو واضح کرتا ہے، وہاں غلامی و محکومی کے تباہ کن مضرات کا اندازہ بھی کراتا چلا جاتا ہے۔

(۷) آرزو۔ آرزو اور ایک صالح و صحت مند آرزو کا جذبہ مومن کے خمیر میں موجود ہے۔ مومن کی آرزو فرد و قوم کے حق میں ہر لحاظ سے مفید و ترقی بخش ہوا کرتی ہے، اور اس لیے وہ بڑے بڑے عظیم الشّان اور بلند و تغیر خیز مقاصد کو اپنا نصب العین بناتی ہے اور پھر ہر سچّا اور زندہ دل مسلمان آرزو کو "جستجو" (جد و جہد) سے بھی مربوط و ہم آہنگ رکھتا ہے۔ چنانچہ "اقبال کی حکمتِ آرزو" میں اسی حیات افروز حکمت کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۸) ہجر و فراق :۔ جب تک انسان اپنے مقصود و مطلوب یا "منزل" سے دور رہتا ہے۔ وُہ محوِ جستجو اور وقفِ جد و جہد بھی رہتا ہے۔ جو قومیں اپنے وظائفِ حیات اور مقاصدِ زیست پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کسی مرحلے پر یہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ اپنی "منزل" کو پہنچ لیں اور ان کے علم و فن کی "تکمیل" ہو چکی۔ وہ روز بروز رو بہ زوال ہوتی ہیں اور تحقیق و جستجو کے مفقود ہونے سے وُہ خود بھی نتیجہ کارزیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ بخلاف اس کے جو قومیں اپنے وظائفِ حیات اور مقاصدِ زیست کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کائنات میں اپنی تحقیق و جستجو اور مہمِ دریافت و تسخیر کو غیر متناہی طور پر جاری رکھتی ہیں اور کسی "مرحلۂ تکمیل" یا "منزل" کی قائل ہی نہیں ہوتیں۔ وُہ یقیناً زندہ و بیدار قومیں ہیں۔ مقصدِ فطرت پر عامل ہیں اور اصولِ ارتقاء کی صحیح ترجمان۔

لہذا وُہ قدرتی طور پر روز بروز رُو بہ ترقی ہُوا کرتی ہیں اور غافل و پس ماندہ اقوام کے لیئے اصلاحِ حال اور اقدامِ حیات کا ایک عملی نمونہ !

چنانچہ غور کیجئے تو مسلمان قوم کے تنزل و پس ماندگی کا حقیقی سبب ہی یہ ہے کہ وُہ مذکورہ بحث میں اوّل الذکر قوم ہے اور اگر اس کے افراد خود کو زندگی کے حقیقی مقاصد سے محروم و دور افتادہ (یا باصطلاحِ اقبال "مہجور") نہیں سمجھتے، تو پھر دلوں میں "احساسِ زیاں"[1] کیوں نہیں ہے روزمرہ عمل میں تلافیِ مافات اور ازالۂ زیاں کے آثار کیوں دکھائی نہیں دیتے ؟

پس قوم کی عام علمی و فنی پستی و محرومی کو دیکھتے ہوئے جب تک ہم میں "ہجر و فراق" کا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی ہم خود کو "منزل" سے دور سمجھ کر تحصیلِ علوم و فنون اور تحقیق و تسخیرِ کائنات میں محو نہیں ہو جاتے تب تک ہمارے لیے قومی و اجتماعی ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ مضمون "اقبال کا فلسفۂ ہجر و فراق" اسی حکمت کی تشریح و توضیح کرتا ہے جو اگرچہ اپنی نوعیت کا نادر و نوا اور قدرے دقیق مبحث ہے، لیکن ہمارے قومی عروج و استقلال کے لیے ہے بے حد کام کی چیز !

(۹) **فلسفۂ خطر** :- علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ "خطر انسان کی تاب و تواں کا امتحان ہے اور ممکناتِ جسم و جان کے ظہور کا بہترین معیار اور اس لیئے عم

---

[1] وا۔ئے محرومی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا — اقبالؔ

اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

میں نے مضمون "اقبال کا فلسفۂ خطر" میں "خطر" کا بلند ترین اور مفید ترین مظہر "جہاد" کو قرار دیا ہے اور اس کے حقیقی مقاصد و مفادات پر مفصل بحث کی ہے۔ قرآنِ مجید کا کوئی پارہ ایسا نہیں جس میں مسلمانوں کو جہاد کی متواتر تاکید و تلقین نہ کی گئی ہو۔ لیکن کئی صدیوں کی غلامی، معانیِ قرآن سے جہالت و غفلت اور عجمی تصوّف کے سُکر آمیز اور پُرجمود تاثرات نے اب تک مسلمانوں کو "جہاد" کے روحانی، عملی، اخلاقی اور تعمیری و اصلاحی عناصر سے غافل و محروم رکھا۔ چنانچہ میں نے اس مضمون میں واضح کیا ہے کہ ہمارے اسلاف نے دنیا میں جتنی بھی فتوحات اور کامیابیاں حاصل کیں۔ وُہ اسی ذوقِ خطر (جذبۂ جہاد) سے لبریز ہو کر، اور آج بھی مسلمانوں کے لیے ٹھوس اور دیرپا ترقی و سرفرازی کا کوئی مستقل زینہ ہے تو یہی!

(۱) **تخریب و تعمیر**۔ جب تک ایک ایسی کُہنہ و بوسیدہ عمارت کو بالکل منہدم نہ کر لیا جائے۔ جس کے گرنے کا ہر وقت امکان ہے اور جو رہائش کے قابل ہی نہیں، اس جگہ ایک نئی اور مضبوط عمارت بنائی ہی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح جب تک اُس نظامِ باطل کی مکمّل طور پر بیخ کنی و تخریب، نہ ہو جو کسی ملک یا قوم کے لیئے مسلسل فتنہ و فساد، معاشرتی انتشار اور تنزل کا باعث ہے، دستورِ حق کی صحیح تشکیل و تعمیر ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ پہلے تصادمِ حق و باطل کا عمل ہر جہت سے مکمّل ہو اور پھر تعمیرِ حق کے لیے عزم و استقلال سے اقدام کیا جائے۔ میں نے "اقبال کا فلسفۂ

تخریب و تعمیر" میں اسی مفہوم قرآنی کی وضاحت کی ہے۔

اس کتاب کے مقالات میں اکثر جگہ آیاتِ قرآنی سے استدلال و استشہاد کیا گیا ہے۔ اور اس اصولِ تشریح و توضیح کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ آپ ہی فرمائیے کہ جب تک توحید، اسوۂ رسول۔ تقلید، یقین و ایمان، سرمایہ و محنت، حریت اور جہاد جیسے عنوان جن کی صحیح و مستند، مکمل اور جامع وضاحت قرآن کے بغیر کسی اور کتاب میں ہو ہی نہیں، آیاتِ قرآنی سے مدلل و منشرح نہ کیے جاتے۔ اِس ضمن میں کلامِ اقبال کی بصیرت افروز اور تسلی بخش وضاحت کیونکر ممکن تھی؟ اور بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ خود اقبال کا حقیقی منبع و مخزن بھی قرآن ہی ہو۔

علامہ اقبال کے متعلق میری گزشتہ تالیفات کو دیکھتے ہوئے بعض صاحبِ بصیرت اور مخلص اصحاب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ اقبال کے فارسی اشعار کا اُردو ترجمہ ضرور دیا کریں، تاکہ قوم کی وُہ اکثریت جو فارسی زبان سے بے بہرہ ہے، ایسی مثالوں سے خاطرخواہ طور پر مستفید ہو۔ چنانچہ میں نے اس کتاب میں اُن کے ارشاد پر بایں طور عمل کیا ہے۔ کہ فارسی کا کوئی ایک شعر بھی بلا ترجمہ پیش نہیں کیا۔ اور اس طرح طلباء اور محدود علم و استعداد کے لوگ بھی کلامِ اقبال کے معانی و مطالب سے خاطر خواہ طور پر مستفید ہو سکیں گے۔

بالآخر یہ عرض کر دینا نہایت ضروری ہے کہ اس کتاب کے دوسرے

ایڈیشن کے لیے جہاں میں نے اس پر بنگاہِ غائر نظرِ ثانی کی ہے، وہاں دو نہایت اہم عنوانات یعنی "اقبال کا فلسفۂ سخت کوشی" اور "اقبال کی حکمتِ لَا و اِلَّا" کا اضافہ بھی کر دیا ہے!

عبدالرحمٰن طارق

اقبالؒ کا درسِ توحید

رہے گا تُو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا

اُتر گیا جو ترے دل میں "لاشریک لہٗ"

اقبالؔ

اقبال کا درسِ توحید

چونکہ توحید کے موضوع پر علامہ اقبال کی تعلیمات کا حقیقی منبع و مخزن قرآنِ مجید ہے، لہٰذا کلامِ اقبال پیش کرنے سے پہلے توحید کے اسلامی اور قرآنی مفہوم و مقصد کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

توحید ہر مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے

یاد رہے کہ توحید ہر مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے اور شجرِ اسلام کی بیخ و بُن۔ اسلام کے تمام دیگر فرائض اور نوافل شاخوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور توحید سب کی جڑ ہے۔ اگر حسبِ تعلیمِ کتاب اللہ اور حسبِ ارشاداتِ رسولؐ ایک مسلمان کا عقیدۂ توحید درست ہے، تو اُس کے تمام دیگر عقائد و اعمال بھی صحیح و مستند اور مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں، ورنہ مردود و لاحاصل۔

دنیا کے ان تمام دیگر مذاہب و ادیان کے بالمقابل، جو محض اوہام و تصورات، شکوک و شبہات، اور خود ساختہ رسم و رواج کے پابند ہو کر شرکیات میں مستغرق ہو گئے، اسلام کا امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ تخمین و ظن اور رسم و رواج کے تمام بتوں کو پاش پاش کرتے ہوئے، آپ کو توحیدِ الٰہی اور یقین و ایمان کے ایک ہی متعین اور غیر متزلزل مرکز پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس مرکزِ توحید پر تمام مصنوعی اور غیر مستند عقائد و تصورات از خود فنا ہو کر "اجزائے ایمان" بن

جاتے ہیں :-

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں! (غالب)

توحید کا مفہوم و مقصد

"مفہومِ توحید" یہ ہے کہ آپ اپنے خالق و مالک کو ذات و صفات میں یکتا اور بے مثال سمجھیں۔

ذات میں بے مثال اس طرح کہ نہ تو ازل سے اس جیسا کوئی اور خدا ہے اور نہ وہ کسی قسم کا کوئی "رشتہ دار" (مثلاً بیٹا بیٹی وغیرہ) رکھتا ہے۔ چونکہ اس کے سمع و بصر، علمِ کُل اور قوت و سطوت تمام کائنات پر حاوی ہیں۔ لہٰذا اُسے ماسوا اللہ کی مدد و اعانت کی کسی لمحے ضرورت ہی نہیں۔ الغرض وُہ ایک مستقل اور دائمی و ابدی ذاتِ احد ہے۔ نہ خود کسی کی اولاد ہے اور نہ اپنی کوئی اولاد رکھتا ہے۔ اور نہ کارِ تخلیق اور تدبیر و تنظیم کائنات میں کوئی اس کا شریک مددگار ہے۔ چنانچہ یہی مفہوم ہے اس سورۂ اخلاص کا جو بحسبِ احادیثِ نبویؐ قرآن کا تیسرا حصہ ہے :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○	اے پیغمبرؐ! کہیئے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا۔ اللہ کا ہم پایہ و ہم مرتبہ (شریک) بھی اور کوئی نہیں ہے!

بعد ازاں "توحیدِ صفاتی" میں اللہ تعالیٰ کو بے مثال اس طرح سمجھا جائے

کہ اُس کے اپنے ہی "اسمٰاء الحسنیٰ"[1] "(خوبصورت ناموں) کے مطابق صرف وہی "حیّ القیوم" (ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا) ہے۔ صرف وہی رزّاق (تمام مخلوق کو رزق عطا کرنے والا) ہے۔ صرف وہی سمیع (تمام مخلوق کی التجاؤں کو سننے والا) ہے، صرف وہی بصیر (مخلوق کی تمام ضروریات و تکلیفات کو دیکھنے والا) ہے۔ صرف ہی قریب[2] (انسان کی شاہ رگ سے بھی قریب تر) ہے۔ صرف وہی مجیب (مخلوق کی دعاؤں کو قبول کرنے والا) ہے۔ صرف وہی وکیل (ہر قسم کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کرنے والا) ہے۔ صرف وہی کریم (حقیقی معنوں میں سخی اور فیّاض ہے) صرف وہی اوّل (سب کی پیدائش سے پہلے بھی موجود) ہے، صرف وہی آخر (سب کے فنا ہو جانے کے بعد بھی زندہ و باقی) ہے، صرف وہی ظاھر (تمام عالمِ ظاہر پر حاکم و حاوی) ہے۔ صرف وہی باطن (تمام عالمِ باطن پر حاکم و حاوی) ہے۔ صرف وہی محیی (تمام مخلوق کو پیدا و زندہ کرنے والا ہے)۔ صرف وہی ممیت (تمام مخلوق کو مارنے والا ہے)۔ الغرض تمام قسم کے خزائنِ ارض و سما، اور انہیں تقسیم کرنے کے مکمل اور دائمی اختیارات صرف

---

[1] وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (پ۹ - ع۱۲)

"اور اللہ کے کچھ حسین و جمیل نام ہیں۔ تم انہیں سے اس کو پکارا کرو۔"

[2] وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (پ۲ : ۲۲)

"اے پیغمبر! جب میرے بندے میرے متعلق آپ سے سوال کریں (کہ خدا کہاں ہے) تو (فرمایئے کہ) میں (اُن سے) بالکل قریب ہوں۔"

دستِ خداوندی میں ہیں اور بحیثیتِ خالق و مالک جو صفات اس کی شانِ خداوندی کے ساتھ خاص ہیں، وُہ مخلوق پر کسی حالت میں چسپاں نہ کی جائیں۔ جب وُہ خود ہر قسم کی نعمتیں بکثرت رکھتا ہے، سب کی دعا و التجا کو سنتا ہے، اور ہر حاجتمند کی حاجت روائی کرتا ہے تو پھر اس سے روگردانی اور بے وفائی اختیار کر کے مخلوق کی دہلیز چاٹتے پھرنا اور اُسے "حاجت روا" اور "مشکل کشا" سمجھنا، کہاں کا انصاف ہے ؟ کیا یہ صفاتِ الٰہی کی بدترین توہین اور بے انتہا انعاماتِ خداوندی کی ناقابلِ معافی تحقیر و ناشکری نہیں ہے ؟

اور جب ہم روزانہ پانچ وقت کی نماز میں فرائض کے علاوہ سنتوں اور نفلوں میں بھی پے در پے یہ کہتے ہیں کہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" تو بوقتِ حاجت و مصیبت اس عہدِ وفا کو توڑ کر غیر اللہ، حتّٰی کہ فوت شدہ بزرگوں سے مدد و مشکل کشائی کیوں چاہتے ہیں ؟

ہاں، تو مفہومِ توحید سمجھ لینے کے بعد "مقصدِ توحید" یہ ہے کہ انسان کے جذبات و احساسات اور ضروریات و خواہشات مخلوق میں سے مختلف چیزوں کی طرف آوارہ و پراگندہ رہنے کی بجائے ایک ہی ہستیِ مختار پر مرتکز ہو جائیں۔ اور اس طرح وہ یکسوئی، دلجمعی اور سکون و اطمینان کا وُہ عیشِ جاوداں حاصل کرے جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔

لہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور ہر مشکل و ضرورت میں، صرف تجھی سے امداد و اعانت چاہتے ہیں۔

تمام انبیاء کی بعثت کا اصل منشاء احیائے توحید تھا

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنے بھی انبیا بھیجے، ان کی بعثت کا حقیقی مقصد و منشاء احیائے توحید تھا۔ جب بھی کسی قوم کی طرف کوئی نبی آیا، اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کے اوامر و نواہی اُسے سنائے، اور مروجہ شرکیات و بدعات کی شدت سے تردید و بیخ کنی کی اور اپنا فرضِ نبوت ادا کرکے واصل باللہ ہو گیا، تو ایک مدت کے بعد وحیِ آسمانی کی حقیقی اور مستند تعلیم دوبارہ فراموش کی جانے لگی، بزرگوں، دیوتاؤں اور "مشکل کشاؤں" کے خودساختہ تصورات و عقائد دوبارہ دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگے، اصولِ توحید کو چھوڑ کر انسانیت شرکیات کی جانب راغب ہونے لگی، دستورِ شریعت کی پابندیوں سے باغی ہو کر افراد "رسم و رواج" کی مصنوعی رعایات و سہولیات میں راحت پذیر ہونے لگے اور اس طرح سابقہ پیغمبر کی وہ تعلیمات گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دی گئیں جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کا سرمایہ لیئے ہوتے تھیں۔

بہرکیف اقوام کی گمراہی و کج روی کا بنیادی سبب ہمیشہ شرک ہی رہا ہے اور شرک ہی تمام اعتقادی اور عملی خباثت کی جڑ ہے۔ دنیا کے جس دور میں بھی شرک زور پکڑ گیا اور خالقِ حقیقی کو چھوڑ کر مخلوق خداوندوں کی پرستش عام ہونے لگی، تو اللہ تعالیٰ نے فوراً ایک نبی مبعوث کیا، تاکہ وہ صحیفۂ سماوی کے ذریعہ لوگوں کو شرک و کفر کی ظلمات سے نکال کر توحید و ایمان کے نور میں لا بسائے، جہاں وہ حق و باطل، صدق و کذب اور خیر و شر کا واضح طور پر امتیاز کر سکیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے تمام نوعِ انسانی کا مشترک مذہب و مشرب ایک ہی چلا آیا ہے اور وہ مذہب تھا: خدائے واحد کی پرستش

اور اس کے اوامر و نواہی کی مخلصانہ تعمیل ۔ لیکن بعد میں اقوام و افراد کے درمیان جس قدر بھی مذہبی اور اعتقادی اختلافات رونما ہوتے، ان کا ذمّہ دار میں نہیں، بلکہ تمہارے اپنے ہی شکوک وشبہات، توہمّات، بدعات و خرافات اور اتباعِ ہوا و ہوس ہے ۔ پس مجھے ہر موقع پر ایک رسول بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تا کہ وُہ بدعات و توہمات کی تردید و بیخ کنی کرے اور صحیح و مستند اصولِ توحید اور اصولِ اعمالِ حسنہ کی طرف گمراہ انسانیت کو دعوت دے جس سے بے بنیاد اختلافات رفع ہوں اور اولادِ آدم اپنے ازلی و ابدی مذہب یعنی توحید کی طرف دوبارہ رجوع کرے ۔ چنانچہ یہی مفہوم مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ میں نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے :-

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً	(پہلے پہل) تمام لوگ ایک ہی مذہب و
فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ	مشرب پر تھے (لیکن جب وہ عقائد و اعمال
وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ	میں اختلاف پیدا کرنے لگے) تو اللہ نے
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ	پیغمبروں کو بھیجا ۔ جو (مومنوں کو رضائے
النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ	حق اور بہشت کی) خوشخبری سناتے تھے
وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ	اور (کفّار کو غضبِ حق اور دوزخ سے
اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ	ڈراتے تھے ۔ اور خدا نے ان کے ساتھ
الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى	ایک سچی کتاب بھی نازل کی تا کہ جن باتوں
اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا	میں وُہ لوگ (بوجہ جہل و نادانی) اختلاف
فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ	کر رہے ہیں، ان کا فیصلہ کر دیں اور صاف
يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ	صاف احکام الٰہی پہنچنے کے بعد بھی آپس

مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (پ۲ - ع۱۰)

کی ضد سے انہی لوگوں نے اختلاف کیا جن کو یہ کتاب دی گئی تھی۔ پس اللہ نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو ان باتوں میں سے جن میں وُہ اختلاف کر رہے تھے، صحیح اور سچّی بات بتا دی اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (پ۱۷ - ع۲)

اور ہم نے تجھ سے پیشتر کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس پر بھی یہی وحی نازل کرتے رہے کہ میرے علاوہ کوئی سچا معبود نہیں پس صرف میری ہی پرستش کرتے رہنا۔

روزِ قیامت خدا کے سامنے اس حجّت و اعتراض کی گنجائش نہ رہے کہ ہماری طرف تو کوئی رسول ہی نہیں آیا تھا، جو صحیح اور غلط میں امتیاز کر کے دکھاتا۔

چنانچہ آیۂ ذیل اس مفہوم پر شاہد ہے:۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ۚ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ

اور ہم نے (نوعِ انسانی کی طرف) کئی پیغمبر بھیجے۔ جن کا حال ہم قبل ازیں تجھ سے بیان کر چکے ہیں اور کئی پیغمبر ایسے بھیجے جن کا حال ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا۔ اور موسیٰؑ سے تو اللہ نے باتیں بھی کیں۔ ہم نے یہ سب پیغمبر (جو مومنوں کو) خوشخبری سنانے والے اور (کافروں کو) ڈرانے والے

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ٥

پ۶ : ع۳

تھے۔ اس لیے بھیجے کہ پیغمبروں (کی تبلیغِ حق)، کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کسی قسم کا عذر باقی نہ رہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

پس تاریخِ عالم کی یہی کیفیت رہی کہ ہر نبی کی بعثت کے وقت چاروں طرف شرک وکفر کا طوفان تھا۔ خدائے واحد کو فراموش کرکے بتوں کی عام پرستش کی جاتی تھی، اور مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ چونکہ یہ تمام بزرگ اللہ کے سچّے دوست رہے ہیں، شب و روز اس کی پرستش کرتے رہے ہیں، نیکوکار اور پرہیزگار رہے ہیں، راہِ حق میں انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور ان کے ہاتھوں بڑے بڑے معجزات اور کرامات کا ظہور ہُوا ہے، لہٰذا ہم بھی اُن کی شکل وصورت پر ان کی مورتیاں اور مجسمے تیار کرکے اُن کے سامنے مناسب آداب واحترام بجا لاتے ہیں، تاکہ وُہ ہمیں بھی درگاہِ الٰہی سے قریب تر کردیں، اور پیشِ حقِ تعالیٰ ہماری سفارش کرکے ہمیں وُہ سب کچھ دلادیں، جس کی ہمیں ضرورت ہے اور پھر چونکہ ہم خود "دنیادار" اور گناہگار" لوگ ہیں لہٰذا خدا ہماری التجا کو اتنی جلدی نہیں سنتا، جتنی جلدی ان بزرگوں کی درخواست کو سنتا ہے۔ پس ہم اسی تصوّر سے ان بزرگوں کو اپنے اور اللہ کے درمیان ایک "واسطہ" بنا کر درگاہِ الٰہی میں اپنی حاجات وضروریات عرض کرتے ہیں۔

یقین جانیئے کہ شرک وکفر کے اسی مروّجہ تصوّر کو توڑنے اور اس کے مادی مظاہر کو پاش پاش کرنے کے لیے تمام انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے

ورنہ آپ ہی فرمایئے کہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں آزرؔ و نمرودؔ کے صنم کدوں میں بے شمار بتوں کی پرستش کیوں کی جا رہی تھی؟ عہدِ موسیٰؑ میں فرعون، آلِ فرعون اور بنی اسرائیل کن کن شرکیہ خرافات کے حامل بن رہے تھے؟ حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں شرک و کفر اور اصنام پرستی کا کس قدر زور تھا؟ اور پھر سب سے زیادہ عبرت انگیز صورت یہ کہ عین اُس حریمِ کعبہ کے اندر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ جیسے موحدین نے اپنے دستِ مبارک سے تعمیر کی تھی، اور ربِّ واحد کی پرستش کے لیے تعمیر کی تھی، ہبل، قبل، لات اور منات جیسے کتنے ہی بُت تھے، جن کی بے تحاشا پوجا کی جا رہی تھی؟ اور اس تمام اصنام پرستی کی اصل غرض و غایت کیا تھی؟ خود قرآن بھی ان کی غرض یہی بتاتا ہے کہ وہ بُت ہمیں اللہ سے قریب تر کر دیں، اُس کے دربار میں ہماری سفارش کریں اور ہمارے مصائب کو رفع کرتے ہوئے ہماری تمام ضروریات خدا سے دلا دیں۔

پس یہ صورتِ حال دیکھ کر ہر نبی نے، جو دنیا میں صرف احیائے توحید کے لیئے آیا تھا، اپنی قوم کو سمجھایا کہ:

"اے قوم! تمہارا ہر عام فرد بھی خدائے عادل کی مخلوق اور بندہ ہونے کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی طرف اتنا ہی قریب، اتنا ہی قابلِ رحم اور اتنا ہی مستحقِ حقوقِ زندگی ہے، جتنا کہ تمہارا کوئی بزرگ تھا۔ خدائے حاضر و ناظر اپنے ہر بندے سے اس کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ وہ ہر وقت تمہاری ہر دُعا و التجا کو سننے اور اُسے قبول کرنے کے لیئے تیار ہے، بشرطیکہ تم بوقتِ حاجت صرف اسی کی امداد و اعانت پر کامل بھروسہ رکھو۔ بلکہ وہ

خدائے فیّاض وکریم تو اپنے دستِ سخا کو ہمہ وقت دراز کیئے ہوئے بذاتِ خود تمہیں صلائے عام دیتا رہتا ہے کہ "کوئی ہے، جو مجھ سے اپنی ضروریات طلب کرے اور میں اُسے دوں؟ کوئی ہے جو اپنی تکالیف میرے حضور عرض کرے، اور میں وُہ تکالیف رفع کردوں؟ کوئی ہے جو مجھ سے بخشش مانگے اور میں اُس کے قصور معاف کردوں"؟

"الغرض اے قوم! آسمان اور زمین کے تمام خزانے خدا کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اور چونکہ وُہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے، تمہاری شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے، اور تمہاری ہر حاجت کو رفع کردینے کا وعدہ بھی فرما رہا ہے۔ لہٰذا اُس خالق و رزّاق سے روگردانی اختیار کرکے مخلوق کے سامنے اور بالخصوص فوت شدہ مخلوق کے سامنے عرضِ حاجت کرتے ہوئے توحیدِ الٰہی سے انحراف مت کرو۔ جب خدا تمہاری ہر التجا کو بُراہِ راست "سننے اور قبول کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے تو پھر تمہیں کوئی "واسطہ" یا "سفارش" اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ —

اے قوم! تمہارے مفروضہ "واسطے" اور "سفارشیں" صرف دنیوی چیزیں ہیں اور یہ طریقے صرف اُن دنیوی بادشاہوں اور حاکموں کے لیے اختیار کیئے گئے ہیں، جن کے یہاں براہِ راست باریاب ہونا عموماً دشوار ہُوا کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو دنیوی بادشاہوں پر، اور خالق کو مخلوق کے عادات و اطوار پر قیاس کرتے ہوئے صفاتِ الٰہی کی توہین مت کرو۔ وہ ذات میں یکتا ہے، صفات میں یکتا ہے، اپنے خواص میں یکتا ہے، شانِ رزّاقی و حاجت روائی میں یکتا ہے،

وُہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے، سب کی سُنتا ہے اور سب کی دعائیں (بشرطیکہ وُہ ان کے حق میں مضر نہیں بلکہ مفید ہوں) قبول بھی کرتا ہے۔ لہٰذا خالق کے لیئے مخلوق کی مثالیں بیان نہ کیا کرو، اور بحیثیتِ مومن ہر حالت میں اُسی پر "توکّل" رکھو۔ وُہ تمہارے یقینِ محکم، حُسنِ اعتقاد اور وفاداری کی خاطر خواہ قدر کرتے ہوئے تمہاری دادرسی کرے گا، اور ہر مشکل میں تمہارے کام آئے گا۔"

"توحید" کے متعلق ہر پیغمبر کی تعلیمات کا مندرجہ بالا خلاصہ، ذیل کی آیات کے ذریعے مدلّل و محکم کیا جا رہا ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝

(پ ۲ : ع ۷)

اے پیغمبرؐ! جب میرے بندے میرے متعلق آپ سے سوال کریں (کہ خدا کہاں ہے)، تو فرمائیے کہ (میں ان سے) بالکل قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس دُعا کو قبول کرتا ہوں۔ لوگوں کو بھی چاہیئے کہ میرے احکام کو مانیں اور میری ذات (اور صفات و اختیارات) پر ایمانِ محکم رکھیں۔ تاکہ وُہ راہِ راست کو پالیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ

اور (مشرک لوگ) اللہ کے سوا ان انسانوں اور چیزوں کو پوجتے ہیں جو آسمان اور زمین

وَالْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ط اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ط (پ ۱۴ : ۱۶ع)

سے روزی دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں رکھتیں اور نہ اُن کو یہ قوت و استطاعت حاصل ہے۔ (بنا بریں) اللہ تعالیٰ کے لیے (مخلوقات کی) مثالیں بیان نہ کیا کرو (حقیقتِ حال کو) اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ○

(پ ۲۴ : ۱۱ع)

اور اے لوگو! تمہارا خالق و مالک فرماتا ہے کہ (ہر ضرورت کے لیئے) میرے حضور دعا کرو۔ میں تمہاری دُعا قبول کرونگا (بخلاف اس کے) جو لوگ اپنے غرور و تکبر میں میری طاعت و عبادت سے گریز کرتے ہیں۔ وُہ ذلّت و خواری سے دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ط وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۔

(پ ۱۱ : ۱۶ع)

اگر خدا کی طرف سے تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو اللہ کے سوا اسے رفع کرنے والا اور کوئی نہیں اور اگر خدا تجھے کوئی فائدہ پہنچانے کا ارادہ کرے تو اس کے انعامات کو کوئی (تجھ سے) روک نہیں سکتا۔

توحید کے اعتقادی، عملی اور اجتماعی فوائد

توحیدِ الٰہی کی صحیح پیروی میں انسان کے لئے اس قدر برکات و مفادات پنہاں ہیں کہ الفاظ میں اُن کی وسعت کا احاطہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اور توحید بے پایاں مفادات کی حامل کیوں نہ ہو، جب کہ تمام کائنات کا ناموس ووقار اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا حقیقی ناموس ووقار توحید!

بہرکیف توحید کے فہم و اتّباع میں جو بڑے بڑے فائدے مضمر ہیں، وہ درجِ ذیل کئے جارہے ہیں۔ چونکہ یہ تمام عنوانات اور مفاداتِ توحید کا نی غور وخوض کا نتیجہ ہیں، اور بجائے خود یقینی، قطعی اور غیر مشکوک ہیں، لہٰذا آپ بھی اوّل توانہیں نہایت غور سے سمجھیں اور پھر ان کی صحت وافادیت کے متعلق بھی اطمینانِ کلّی رکھیں۔

(۱) یقین و ایمان کی روح

توحید انسان کے یقین و ایمان کی روح ہے۔ جو شخص خدائے واحد کا پرستار نہیں، اور اس کی ذات وصفات اور کلام اللہ میں اس کے مذکورہ وعدوں پر یقین واعتماد نہیں رکھتا، اس کے دل میں کسی اور چیز کے لئے بھی یقین وایمان کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھیے کہ جس شخص کو ہستیِ باری تعالیٰ اور اس کے مواعید پر یقین نہیں اُسے کائنات کی کسی اور چیز پر بھی یقین نہیں، حتّٰی کہ اپنے مقامِ انسانیت، صفاتِ انسانیت، ممکناتِ زندگی، قوتِ عمل، قوتِ تسخیر اور روشن وکامیاب مستقبل پر بھی اُسے کوئی یقین نہیں۔ مردِ موحّد، پیکرِ عزم ویقین ہے، تو مشرک مجسمۂ تذبذب وشک۔ موحّد ہر چیز کو

رجائیت کی روشنی میں دیکھتا ہے تو مشرک قنوطیت کی تاریکی میں۔ موحّد کا دل اُمّید و آرزو کا سرمایہ دار ہے، تو مشرک ہمہ وقت یاس و افسردگی سے مغلوب رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موحّد ایک ہمیشہ زندہ و مختار خدا کا پرستار ہے اور مشرک ایک مردہ وموہوم "دیوتا" (حاجت روا) کی آس لگائے بیٹھا ہے۔

(۲)، فرد کی یکتائی و بے مثالی

"توحید" کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وُہ مرد موحّد کو خود اللہ تعالیٰ کی طرح تمام نوعِ انسانی میں "یکتا" اور "بے مثال" بنا دیتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب ایک شخص توحیدِ الٰہی کے مفہوم ومقصد پر عامل ہو تو جس ہستی سے وُہ ہمہ وقت وابستہ ووفا ہے، اُس کی "انفرادیت" مردِ مومن کی انفرادیت پر بھی اس قوت سے اثر انداز ہوتی ہے کہ وُہ اپنے ہم جنسوں میں ایک منفرد، یکتا اور بے مثال مقام ومرتبہ حاصل کر لیتا ہے اور فہم وشعور کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جس شخص کے عقائد وافکار، جذبات واحساسات، عشق ومحبت، اطاعت وعبودیّت ضروریات، ومطالبات اور ذوق وشوق کا واحد مرکز ومرجع ذاتِ باری تعالیٰ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی صفات وخصوصیات اس میں عکس ریز یا منتقل ہو کر اُسے بھی دیگر لوگوں کے مقابلے میں یکتا اور بے مثال کیوں نہ بنا دیں؟ — چنانچہ، آپ ہی فرمائیے کہ تمام انبیائے کرام بالعموم اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد (صلعم) بالخصوص تمام نوعِ انسانی میں ایک یکتا اور فقید المثال مقام نہیں رکھتے؟ اور انبیاء ہی پر کیا موقوف ہے، اُن کے اُمتیوں اور پیروکاروں میں سے بھی خلفائے راشدین، صحابۂ کرامؓ، اور دیگر اولیائے اُمّت

کی مثال نوعِ انسانی کے دیگر ملقوں میں کہیں دستیاب ہوتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ اولادِ آدم میں سے تمام انبیاء، صدیقین، شہدا، صالحین اور اولیاء اللہ کو کس خاص شے نے اس قدر یکتا، منفرد اور عدیم النظیر بنا دیا؟ اُن کے کارنامے، اُن کی خدمات اور ان کی فتوحات کس بنا پر آج تک معجز نما حد تک محیّر العقول اور بے مثال واقع ہوئی ہیں؟ اس کا سادہ و واضح جواب یہ ہے کہ صرف "توحید" کے معنوی فیوض اور اس کی عملی قوت و برکت سے!

تو اس مبحث سے ثابت یہ ہوا کہ صرف "توحید" ہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام نوعِ انسانی میں ایک یکتا اور بے مثال مرتبہ عطا کرتی ہے اور صرف توحید کی ناقابلِ تصور قوتِ تسخیر سے انسان کے عملی کارنامے لوحِ عالم پر روشن اور غیر فانی نقوش ثبت کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے مثنوی "اسرار و رموز" کے آخر میں سورۃ اخلاص کے نکات و حِکَم بیان کئے ہیں اور اس کے ہر لفظ سے وہ حکمت اور روحِ معانی اخذ کی ہے کہ باید و شاید۔ چنانچہ "توحید" کی برکت و قوت سے فرد کو جو شانِ یکتائی جو انفرادیت اور جو عظمت و فوقیت حاصل ہوتی ہے، اُسے وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ کے زیرِ عنوان بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں:-

چشمِ مسلم از جہاں بربستہ چیست؟ فطرت ایں دل بحق پیوستہ چیست؟

وہ چشمِ مسلم جو غیر اللہ کے لئے بالکل بند ہے آخر ہے کیا چیز؟ اور جس نے اپنا دل فقط خدا سے وابستہ کیا ہے اسکی فطرت کیا ہے؟

لالۂ کوہسار کو ہے دمید گوشۂ دامانِ گلچینے نہ دید

وہ ایک ایسا لالہ ہے جو پہاڑ پر پیدا ہوا اور جس نے کسی گلچین کا دامن کبھی نہیں دیکھا

آتشِ او شعلہ گیرد بہ بر
از نفس ہائے نخستینِ سحر

اس لالہ کی آگ اپنے سینہ میں مزید شعلہ پیدا کرتی ہے
بادِ سحر کے پہلے چند سانسوں کے اثر سے

آسماں از آغوشِ خود نگذاردش
کوکبِ واماندۂ پنداردش

آسماں بھی اس لالہ کو اپنی آغوش سے جدا نہیں ہونے دیتا
اور اسے ایک پیچھے رہا ہوا ستارہ سمجھتا ہے

بوسدش اول شعاعِ آفتاب

اسے آفتاب کی پہلی شعاع بوسہ دیتی ہے

شبنم از چشمش بشوید گردِ خواب

اور شبنم اس کی آنکھ سے گردِ خواب دھوتی ہے

رشتہ با "لم یکن" باید قوی
تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی

تجھے لم یکن کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط رکھنا چاہیے
تا کہ اس کی برکت سے تو اقوامِ عالم میں بے نظیر ہو

آنکہ ذاتش واحد است و لا شریک
بندہ اش ہم در نسازد با شریک

وہ ہستی جو کہ ایک ہے اور لا شریک ہے
اس کا وفادار بندہ بھی اپنا شریک گوارا نہیں کرتا

مومنِ بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

وہ ایسا مومن ہے جس کا مقام بلند لوگوں سے بھی بلند تر ہے
اور اس کی غیرت اپنے ہم پایہ شخص کو برداشت نہیں کر سکتی

خرقۂ لَاتَحْزَنُوْا اندر برش[۱]
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش

وہ اپنے جسم پر لاتحزنوا کا لباس پہنے ہوئے ہے
اور اس کے سر پر انتم الاعلون کا تاج رکھا ہے

۱؎ آیۂ شریفہ وَلَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (پ ۴ : ع ۵)

«نہ تو سست و افسردہ ہو اور نہ رنجیدہ اور غمناک ہو۔ کیونکہ اگر تم سچے مومن ہو تو (کفار پر) فتح تمہیں کو نصیب ہو گی۔»

می کشد بارِ دو عالم دوشِ او — بحر و بر پروردۂ آغوشِ او
اس کا کاندھا دونوں جہان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے — سمندر اور زمین نے اسی کی آغوش میں پرورش پائی ہے

بر غوِ تندر مدام افگندہ گوش — برق اگر ریزد ہمی گیرد بدوش
وہ ہمیشہ بجلی کی کڑک پر کان رکھے ہوئے ہے — اور اگر بجلی گرتی ہے تو وہ اسے اپنے کاندھے پر لیتا ہے

پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر — امر و نہیِ او عیارِ خیر و شر
وہ باطل کے سامنے تلوار ہے اور حق کے سامنے ڈھال — اور اس کا امر و نہی دنیا میں خیر و شر کا معیار ہے

در گرہ صد شعلہ دارد اخگرش — زندگی گیرد کمال از جوہرش
اس کا کوئلہ اپنی گرہ میں سو شعلے سمیٹے ہوئے ہے — اور زندگی اسی کے جوہر سے کمال حاصل کرتی ہے

در فضائے ایں جہانِ ہائے و ہو — نغمہ پیدا نیست جز تکبیرِ او
اس ہائے و ہو (شور و شغب) کی دنیا میں — اس کی تکبیر کے علاوہ کوئی صحیح نغمہ سنائی نہیں دیتا

عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم
اس کی بخشش، انصاف، سخاوت اور احسان عظیم و وسیع ہیں — حتیٰ کہ غصے میں بھی اس کا مزاج سخی رہتا ہے

سازِ او در بزم ہا خاطر نواز — سوزِ او در رزم ہا آہن گداز
اس کا ساز محفلوں میں دل کے لیے باعثِ فرحت ہے — اور اس کا سوز میدانِ جنگ میں لوہے کو پگھلا دیتا ہے

در گلستاں با عنادل ہم صفیر — در بیاباں جرّہ بازِ صید گیر
وہ باغ میں بلبلوں کے ساتھ ہم آواز ہے — اور جنگل میں وہ شکار پکڑنے والا شاہین ہے

زیرِ گردوں می نیاساید دلش — بر فلک گیرد قرار آب و گلش
آسمان کے نیچے اس کا دل مطمئن نہیں ہوتا — لہذا اس کا جسم بالائے آسمان پرواز کرتا ہے

طائرش منقار بر اختر زند — آنسوئے ایں کہنہ چنبر پر زند
اس کا پرندہ ستاروں پر چونچ مارتا ہے — اور اس پرانے خیمے (آسمان) سے آگے پرواز کرتا ہے

تو بہ پرواز ے پرے نکشودۂ | کرمک استی، زیرِ خاک آسودۂ
مگر تو نے تو پرواز کیلئے کبھی پر ہی نہیں کھولے | تو ایسا کیڑا ہے جو خاک کے نیچے ہی آسودہ ہے

خوار از مہجوریِ قرآں شدی | شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
قرآن کو چھوڑ کر تو دنیا میں ذلیل و خوار ہوا | مگر شکوہ و شکایت کرنے لگا گردشِ زمانہ کی

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ | در بغل داری کتابِ زندۂ
اے کہ قطراتِ شبنم کی طرح زمین پر گرا ہوا ہے | تو تو بغل میں ایک زندۂ جاوید کتاب رکھتا ہے

تا کجا در خاک می گیری وطن
تو کب تک مٹی کو اپنا وطن بنائے رہے گا

رخت بردار و سرِ گردوں فگن!
اپنا سامان اٹھا اور آسمان کے اس پار پھینک

(رموزِ بیخودی)

۳- ملّت کی وحدت و قوّت اور جذبۂ اخوّت و اتّحاد

توحید کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف تمام قوم میں وحدت و یگانگت پیدا کر دیتی ہے، بلکہ ایسی قوم کو دیگر اقوامِ عالم میں بھی یکتا اور عدیم النظیر بنا دیتی ہے۔ ان ہر دو حقائق کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

پیروِ توحید قوم میں ایک نہایت منظم و مستقل وحدت و یگانگت اور روحِ اخوّت و اتّحاد اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ اس قوم کے تمام افراد کا عقیدہ اور نصب العین صرف ایک ہی ہے، یعنی خدائے واحد کی پرستش اس کی ذات و صفات پر ایمانِ کامل اور اس کے اوامر و نواہی کی اطاعت۔

پس جب تمام افرادِ ملّت اپنے عقائد و افکار، اپنے نصب العین اور اپنے مقصدِ زندگی میں مکمل طور پر متفق اور ہم آہنگ ہوں تو پھر ان کے درمیان

نفاق و اختلاف کی گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے؟ ایسی ملّتِ موحّدین نہ تو جغرافیائی اور نسلی امتیازات کی قائل ہوتی ہے نہ "وطن" کے بت کی پرستار ہے نہ امتیازاتِ حسب و نسب سے متاثر ہوتی ہے، نہ قبیلہ و قومیت کو مخلِ اِتحاد ہونے دیتی ہے اور نہ رنگ و خون کے جھگڑے میں پڑ کر رشتۂ اخوت کو ضعف پہنچنے دیتی ہے۔ بہرکیف وُہ قوم توحیدِ الٰہی کے معنوی فیوض سے اپنی حیاتِ اجتماعی میں بھی وُہ "وحدت و یگانگت" پیدا کرتی ہے کہ دنیا کے رسمی عقائد و تصوّرات اور مادی امتیازات اس وحدت پر ذرّہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

علامہ اقبال "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کے زیرِ عنوان یہی نکات و حکم بالفاظِ ذیل بیان فرماتے ہیں:۔

من شبے صدّیقؓ را دیدم بخواب	گل زخاکِ راہِ او چیدم بخواب
میں نے ایک رات ابوبکر صدّیقؓ کو خواب میں دیکھا	اور اس کی خاکِ راہ سے عقیدت کے پھول چنے
آں "اَمَنَّ النَّاس" [1] بر مولائے ما	آں کلیمِ اوّلِ سینائے ما
وُہ صدّیق جس نے ہمارے آقا و مولا پر سب سے زیادہ احسان کیے	اور وُہ جو ہمارے طورِ عشق کا سب سے پہلا کلیم ہے
ہمّتِ او کشتِ ملّت را چو ابر	ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر
جس کا بذل و سخا قوم کی کھیتی کیلئے ابرِ رحمت ثابت ہوا	اور جو اسلام، غارِ حرا، جنگِ بدر اور قبر میں حضور کا ساتھی

---

[1] اَمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبُوْ بَكْرٍؓ "مجلسی (جسمانی) اور مالی حیثیت سے ابوبکرؓ نے مجھ پر سب لوگوں سے بڑھ چڑھ کر احسانات کئے ہیں"

گفتمش اے خاصۂ خاصانِ عشق | عشقِ تو سر مطلعِ دیوانِ عشق

میں نے اس سے کہا کہ اے خاصانِ عشق کے امام | تیرا عشق تو دیوانِ عشق کا مطلعِ اوّل ہے

پختہ از دستت اساسِ کارِ ما | چارۂ فرما پئے آزارِ ما

تیرے ہاتھ ہی سے ہمارے کام کی بنیاد پختہ ہوئی | میرے دردِ دل کا بھی کوئی علاج تجویز فرما

گفت تا کے در ہوس گردی اسیر | آب و تاب از سورۂ اخلاص گیر

اس نے کہا تو کب تک ہوا و ہوس میں اسیر رہیگا | روح کی آب و تاب سورۂ اخلاص سے حاصل کر

اینکہ در صد سینہ پیچد یک نفس | سرّے از اسرارِ توحید است و بس

یہ جو سینکڑوں سینوں میں ایک ہی سانس گردش کرتا ہے | یہ بھی توحید کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے

رنگِ او بر کن مثالِ او شوی | در جہاں عکسِ جمالِ او شوی

تو خدا کا رنگ اختیار کر، پھر اسی جیسا ہو جائیگا | اور دنیا میں اسی کے حسن و جمال کا عکس بن جائیگا

آنکہ نامِ تو مسلماں کردہ است | از دوئی سوئے یکی آوردہ است

وہ خدا جس نے تیرا نام مسلمان رکھ دیا ہے | تجھے نفاق و اختلاف سے بچا کر اخوت و اتحاد کی طرف لایا ہے

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ | وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

لیکن تو نے خود ہی اپنے نام ترک افغان وغیرہ رکھ لیے ہیں | اور افسوس ہے کہ تو اسی حالت پر برقرار رہا۔

وارہاں نامیدہ را از نامہا | ساز با خُم در گذر از جامہا

پس اب خود کو ان مصنوعی ناموں سے آزاد کر | اور ان پیالوں کو چھوڑ کر خُم (توحید) سے مستفید ہو

اے کہ تو رسوائے نام افتادۂ | از درختِ خویش خام افتادۂ

اے کہ تو بعض ناموں کی وجہ سے بدنام ہے | اور اپنے درخت سے کچے پھل کی طرح گر پڑا ہے

با یکی ساز از دوئی بردار رخت | وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت

نفاق و اختلاف کو چھوڑ اور اتحاد اختیار کر | اپنی وحدتِ ملی کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر

اے پرستارِ یکی گر تو توئی — تا کجا باشی سبق خوانِ دوئی
اے خدائے واحد کے پرستار اگر تو سچا مسلمان ہے — تو پھر کب تک اختلاف (دوئی) کا سبق پڑھتا رہیگا

تو درِ خود را بخود پوشیدۂ — در دل آور آنچہ بر لب چیدۂ
تو نے اپنا حقیقی خود ہی اپنے سے چھپا رکھا ہے — جو کچھ تو زبان سے کہہ رہا ہے اسے دل میں بھی اتار

صد ملل از ملتے انگیختی — بر حصارِ خود شبیخوں ریختی
تو نے ایک ملت سے سینکڑوں ملتیں بنا دیں — اور اس طرح اپنے قلعہ پر خود ہی حملہ کر دیا

یک شو و توحید را مشہود کن — غائبش را از عمل موجود کن
متحد ہو جا اور اس طرح مفہومِ توحید کو ظاہر کر — اور جو ہستی غائب ہے، اسے اپنے عمل سے موجود کر دکھا

لذّتِ ایماں فزاید در عمل
عمل سے تو لذتِ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے

مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل
اور وہ ایمان ہی مردہ ہے جو عمل میں نہ آئے (رموزِ بیخودی)

اور اللہ تعالیٰ کی توحید ایک پیرو توحید قوم میں جو "وحدت" (اتحاد) پیدا کرتی ہے، اُس کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے "جاوید نامہ" میں لکھتے ہیں:۔

زندگانی نیست تکرارِ نفس — اصلِ او از حیّ و قیّوم است و بس
زندگانی کا قیام و استحکام صرف سانس کے تسلسل سے نہیں ہے — بلکہ زندگی کی بنیاد تو حی و قیوم کے مفہوم پر رکھی گئی ہے

قرب جاں با آنکہ گفت "اِنّی قریب"* — از حیاتِ جاوداں بردن نصیب
جس بندہ کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے اس معبود کو قریب تر پاتا — گویا ایک غیر فانی اور جاودانی زندگی کو پا لینا ہے

حاشیہ آئندہ صفحہ پر۔

ذرّہ ہا از یک نگاہی آفتاب ‏ ‏ ‏ یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

بے شمار ذرات یک نگاہی سے آفتاب بن جاتے ہیں ‏ ‏ ‏ اے ملتِ اسلامیہ! تو بھی یک نگاہ ہو تاکہ حق بے نقاب ہو جائے

یک نگاہی را بچشمِ کم مبیں ‏ ‏ ‏ از تجلّی ہائے توحید است ایں

تو یک نگاہی کو غفلت و حقارت سے نہ دیکھ ‏ ‏ ‏ یہ اتحاد تو توحید کی تجلّیات میں سے ہے

ملّتے چوں می شود توحید مست

جب کوئی قوم نشۂ توحید سے سرمست ہو جاتی ہے

قوّت و جبروت می آید بدست

تو یقیناً اسے قوت و حکومت حاصل ہوتی ہے۔

روحِ ملّت را وجود از انجمن ‏ ‏ ‏ روحِ ملّت نیست محتاجِ بدن

روحِ قومی کی تشکیل اتحاد و یک جہتی سے ہوتی ہے ‏ ‏ ‏ اور روحِ ملّت کسی جسم کی محتاج نہیں ہے

تا وجودش را نمود از صحبت است ‏ ‏ ‏ مُرد چوں شیرازۂ صحبت شکست

چونکہ اس کا ظہور و وجود صرف اتحاد باہمی سے ہے ‏ ‏ ‏ لہذا جب یہ شیرازۂ اتحاد پراگندہ ہو جاتا ہے تو وہ مر جاتی ہے

مُردۂ؟ از یک نگاہی زندہ شو ‏ ‏ ‏ بگذر از بے مرکزی، پائندہ شو

اگر تو مردہ ہے تو یک نگاہی و اتحاد سے زندہ ہو جا ‏ ‏ ‏ بے مرکزی کو چھوڑ کر مرکزِ توحید اختیار کر اور جاوداں ہو جا

وحدتِ افکار و کردار آفریں

اے قوم اپنے افکار و کردار میں توحید سے وحدت پیدا کر

تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

تاکہ تو دنیا میں غلبہ و حکومت حاصل کرے ‏ ‏ ‏ (جاوید نامہ)

لہ آیۂ شریفہ: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ۔ ‏ ‏ ‏ "جب میرے بندے میرے متعلق آپ سے پوچھیں (کہ خدا کہاں ہے؟) تو کہیئے کہ میں (ان کے) بالکل قریب ہوں"

فرد از توحید لاہوتی شود — ملت از توحید جبروتی شود

فرد توحید کی برکت سے خدا کا مقرب ہوجاتا ہے — اور قوم اسکی برکت سے حکومت و اقتدار حاصل کرتی ہے

بایزید و شبلی و بوذر از وست — امتاں را طغرل و سنجر از وست

بایزید شبلی اور ابوذر جیسی ہستیاں توحید کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں — اور قوموں کو طغرل اور سنجر جیسے حکمران بھی اسی کے طفیل ملتے ہیں

بے تجلی نیست آدم را ثبات — جلوۂ ما فرد و ملت را حیات

تجلی و توحید کے بغیر انسان کو ثبات و استقلال نہیں ملتا — اور یہی ہمارا نورِ باطن فرد و ملت کی زندگی ہے

ہر دو از توحید می گیرد کمال — زندگی ایں را جلال آں را جمال

فرد اور ملت ہر دو توحید سے کمال پاتے ہیں — اور اس طرح زندگی ملت کیلئے جلال اور فرد کیلئے جمال بنتی ہے

ایں سلیمانی است آں سلمانی است — آں سراپا فقر و ایں سلطانی است

توحید ملت کے لیے حکومت و اقتدار ہے اور فرد کیلئے تزکیہ نفس — فرد کیلیے سراپا فقر ہے اور قوم کے لیے پادشاہی

آں یکی را بیند، ایں گردد یکی

فرد وحدت کا مشاہدہ کرتا ہے اور قوم وحدت بن جاتی ہے

درجہاں با آں نشیں با ایں بزی

دنیا میں اُس کے ساتھ بیٹھو اس کے ساتھ جی

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

اے مسلمان! ملت کا حقیقی مفہوم و مقصد کیا ہے — ہزاروں آنکھیں رکھتے ہوئے بھی یک نگاہ ہوجانا

اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکے است — خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے است

اہل توحید کی دلیل اور دعوےٰ ایک ہی ہے — ہمارے خیمے اگرچہ الگ الگ ہیں، مگر دل متحد ہیں

اب رہا یہ سوال کہ ایک قومِ موحدین دیگر اقوامِ عالم کے بالمقابل یکتا اور بے مثال کیونکر ہو جاتی ہے؟ تو اس کا جواب تو نہایت واضح اور

غیر مبہم ہے۔ تو د آپ کا فہم و شعور اس کا مؤید ہے۔ آپ کے مشاہدات اس کے مؤید ہیں، تاریخ اس کی مصدق ہے اور اس موضوع پر کسی طویل بحث کی چنداں ضرورت ہی نہیں۔ جس طرح ایک فردِ موحد توحید کی قوّت و برکت سے تمام افرادِ نوعِ انسانی میں یکتا ہو جاتا ہے، عین اُسی طرح ایک قوم بھی عاملِ توحید ہو کر تمام اقوامِ عالم میں یکتا اور بے مثال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی فضیلت و امتیاز کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ کو "خیر الامم" کا جلیل الشان خطاب عطا فرمایا، اور حاملِ ہذا و مبلغِ توحید ہونے کی وجہ سے اس کو تمام اقوامِ عالم کا رہبر و مصلح قرار دیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	تمام امتوں میں سے تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی (کی اصلاح و رہنمائی) کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہو۔ برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمانِ کامل رکھتے ہو۔
پ ۴ : ع ۳	

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	اور اس طرح ہم نے تم کو ایک متوسط[1] اُمّت بنایا تاکہ تم (روزِ قیامت) دیگر اقوام کے اندازِ عمل پر گواہ ہو۔ اور ہمارا رسول (محمد صلعم) تم پر گواہ ہو

---

[1] یعنی راہِ اعتدال پر گامزن ہونے والی اُمّت۔ عقائد اور اعمال میں مبالغہ و تقصیر اور افراط و تفریط سے پاک اُمّت۔

دکر میں نے ان میں تفہیم القرآن اور
تبلیغ حق کا فرض ادا کر کے اتمام حجت
کر دیا تھا۔ پ ۲ : ع ۱

پس حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ جس طرح قرآنِ مجید اوّل تا آخر درسِ توحید ہے؛ خدا کی آخری اور یکتا کتاب ہے، اسی طرح وُہ کتاب جس پیغمبرِ صادقؐ کے ذریعہ بھیجی گئی، وُہ سراپا پیکرِ توحید ہے اور اللہ تعالیٰ کا آخری اور بے مثال پیغمبرؐ ہے۔ اور وُہ کتاب جس اُمت کے لیے بھیجی گئی، وُہ بھی حامل و عامل توحید ہونے کی بنا پر نہ صرف دنیا کی بہترین قوم ہے بلکہ آخری اور فقید المثال قوم ہے۔ اور اس لئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا :۔

دل ز غیر اللہ مسلماں برکند
نعرۂ "لاَ قَوْمَ بَعْدِیْ" می زند!

ترجمہ :۔ "مسلمان ما سوا اللہ سے اپنے دل کا رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔ اور دنیا میں یہ نعرۂ حق بلند کرتا ہے کہ میرے بعد اور کوئی قوم پیدا نہیں ہو گی"۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ :۔

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

اگر تو میرے معانی الفاظ کی صحیح تحقیق کرے
اور مقامِ رسول کو چشمِ صدیقؓ سے دیکھے

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

تو نبی اکرمؐ دل جگر کی اصل قوت ثابت ہونگے
اور ان کا وجودِ مسعود تجھے خدا سے محبوب تر دکھائی دیگا

قلبِ مومن را کتابش قوت است — حکمتش حبل الورید ملت است

دلِ مومن کے لیے اس کی کتاب (قرآن) منبع قوت ہے — اور اس کی حکمت (حدیث) قوم کی شاہ رگ ہے

دامنش از دست دادن مردن است — چوں گل از بادِ خزاں افسردن است

اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گویا مرنا ہے — اور پھول کی طرح بادِ خزاں سے مرجھا جانا ہے

زندگی قوم از دمِ او یافت است — ایں سحر از آفتابش تافت است

قوم نے اُسی کے سانس سے زندگی پائی ہے — اور یہ صبح اسی کے آفتاب سے روشن ہوئی ہے

فرد از حق ملت از وے زندہ است — از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

فرد حق سے اور ملت اس کی وابستگی سے زندہ ہے — اور اسی کے آفتاب کی شعاع سے روشن ہے

از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

ہم رسالت کی وساطت سے ہی ہمنوا ہوتے ہیں — اور ہم اپنے مقصد و مدعا میں متفق ہیں تو اسی کے تعلق سے

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود — پختہ چوں وحدت شود ملت شود

ہم مقصد رہنے والی کثرت بھی وحدت بن جاتی ہے — اور جب وحدت پختہ ہوتی ہے تو وہ ملت بن جاتی ہے

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است — وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

پس ہر کثرت پابندیٔ وحدت ہی سے زندہ ہے — اور مسلمانوں کی وحدت آئینِ اسلام کی برکت سے ہے

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم

ہم نے اسلام کا دستور رسولِ اکرمؐ سے سیکھا — اور خدا کی راہ میں مشعلِ توحید روشن کی

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست — ما کہ یکجائیم از احسانِ اوست

یہ موتی اسی کے بحرِ ناپیدا کنار میں سے ہے — اور ہم متفق و متحد ہیں تو یہ بھی اسی کا احسان ہے

تا نہ ایں وحدت ز بندِ ما رود — ہستیِ ما با ابد ہمدم شود

جب تک یہ وحدت ہم میں سے گم نہیں ہوتی — ہماری ہستی دوام و ابد کی آئینہ دار ہے

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد   بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
پس خدا نے ہم پر تو شریعت ختم کر دی   اور ہمارے نبیؐ پر رسالت تمام کر دی

رونق از ما محفلِ ایام را   او رسل را ختم ما اقوام را
محفل دنیا کی رونق ہمارے ہی وجود سے ہے   آنحضرتؐ نے رسولوں پر مہر خاتم لگا دی اور ہم نے اقوام پر

خدمتِ ساقی گری[1] با ما گزاشت   داد ما را آخریں جامے کہ داشت
پھر اس نے ہمیں ساقی گری کی خدمت سپرد کی   اور ہمیں خدا کا آخری جام (قرآن) عطا فرمایا

"لا نبی بعدی" ز احسانِ خدا ست   پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است
"میرے بعد کوئی رسول نہیں" یہ اعلان بھی خدا کا احسان ہے   اور دین مصطفیٰؐ (اسلام) کیلئے عزت کا پردہ ہے

قوم را سرمایۂ قوت ازو   حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو
قوم کو سرمایۂ قوت تعلقِ رسالت ہی سے ملا ہے   اور قوم کی وحدت بھی اسی اصول سے محفوظ ہے

حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست   تا ابد اسلام را شیرازہ بست
اللہ تعالیٰ نے ہر باطل دعوے کا نقش توڑ دیا   اور ہمیشہ کیلئے اسلام کا شیرازہ مضبوط کر دیا

دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
اس بنا پر مسلمان غیر اللہ سے اپنا دل اٹھا لیتا ہے

نعرۂ لَا قَوْمَ بَعْدِیْ می زند   (رموزِ بیخودی)
اور یہ نعرہ حق لگاتا ہے کہ "میرے بعد کوئی قوم نہیں ہو گی"

---

[1] وہ ساقی گری سے مراد یہ ہے کہ ہم شرعِ محمدیؐ کی دنیا میں نشر و اشاعت کریں اور تبلیغ اسلام سے غافل نہ ہوں۔

۴۔ ہر قسم کے خوف و خدشہ، یاس و نا امیدی اور غم و اندوہ سے نجات

"توحید" کا چوتھا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو ہر قسم کے خوف و خدشہ، یاس و نا امیدی اور غم و اندوہ سے محفوظ رکھتی ہے۔

اس موضوع پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر قسم کے اعتقادی اور عملی خباثت درحقیقت خوفِ غیر اللہ ہی سے جنم لیتے ہیں۔ میں نے مذکورہ عنوان میں بالخصوص "یاس و نا امیدی" اور "غم و اندوہ" کے الفاظ اس لئے رکھے ہیں، کہ یہ چیزیں حاصل و نتیجہ ہوا کرتی ہیں خوفِ غیر اللہ کا۔ جو شخص "خالق" کے علاوہ "مخلوق" سے خائف و مرعوب رہتا ہے وہ لازمی طور پر ہمیشہ مایوس و نا امید اور مغلوب حزن و ملال رہے گا۔ بالفاظِ دیگر یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ جو شخص مخلوق سے خائف رہتا ہے۔ (اور اس لیئے "حق گوئی" اور "حق پرستی" سے بھی محروم و کنارہ کش ہے)، وہ اپنے دل میں نہ تو خالق کی ذات و صفات پر ایمانِ کامل رکھتا ہے اور نہ "خوفِ حق" جیسی نعمتِ عظمیٰ سے ذرہ برابر بہرہ ور ہے۔ "خوفِ حق" اور "خوفِ مخلوق" ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ جس دل میں خوفِ خالق ہے اُس دل میں خوفِ مخلوق ایک لمحہ کے لیے دخل نہیں پا سکتا اور جس دل میں خوفِ مخلوق جاگزین ہے، اس میں خوفِ حق کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ خوفِ حق، خوفِ مخلوق سے مغلوب و مقہور رہنے والے دل سے کوسوں دور رہتا ہے۔ ایسی غلیظ و

ناپاک اور مرکزِ شرک و کفر جگہ اس کی نشستِ مقدس کے قابل ہی نہیں۔ خوفِ حق صرف موحّد کے قلبِ زندہ و روشن کو اپنی نشست گاہ بناتا ہے اور مشرک کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں! اقبالؔ

پس چونکہ مشرک اللہ کا حق چھین کر غیروں کو دیتا ہے، یعنی خالق سے ڈرنے کی بجائے مخلوق سے ڈرتا ہے، لہذا اس ناانصافی بلکہ "ظلمِ عظیم"[1] کی کم از کم سزا اُس کو یہ ملتی ہے کہ وُہ ہمہ وقت یاس و ناامیدی اور غم و اندوہ میں گھرا رہتا ہے۔ اور اس طرح اس کی زندگی اُس کے لیے مسلسل عذاب بن جاتی ہے۔ وُہ یاس و ناامیدی کا شکار اس لیے بنا رہا کہ وُہ امید و آرزو کے حقیقی مرجع یعنی اللہ تعالیٰ سے وابستہ و باوفا نہیں رہا بلکہ اُس سے خائف ہونے کی بجائے مخلوق سے ڈرتا رہا اور بندوں کو اپنے نفع و نقصان کا مختار سمجھا۔ باقی رہا "غم و اندوہ" کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ وُہ ہر اس دل و دماغ پر حاوی رہے گا، جو یاس و ناامیدی کی آماجگاہ ہو۔ پس "توحید" کی ایک واضح خصوصیت یہ بھی ہے کہ وُہ انسان کو یاس و ناامیدی اور ہر قسم کے حزن و ملال سے کلی طور پر آزاد کر کے امید و آرزو اور مسرت و اطمینان سے مالا مال کر دیتی ہے۔

---

[1] يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (پ۲۱ ، ع۱۰) "بیٹا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر۔ کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔"

ہر ایسا مردِ موحّد ہر وقت اور ہر ماحول میں انتہائی طور پر "حق گو" اور "حق پرست" بھی ہے اور "مصلحتِ وقت" سے بے نیاز رہ کر پیروانِ باطل کے لئے وُہ "برقِ کفر سوز" بھی جو خدائے جبّار و قہّار کا تازیانۂ سزا بن کر اُنہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیتی ہے:۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ٥	بات یہ ہے کہ ہم حق کو (ایک پتھر کی طرح) باطل کے سر پر دے مارتے ہیں۔ (اور اس ضرب سے) باطل کا بھُوسر نکل آتا ہے اور وُہ اسی دم فنا ہو جاتا ہے اور (مشرکو) جو باتیں تم بناتے ہو ان سے خراب ہو گے۔
پ ۱۷ ع ۲	

اور خوفِ حق رکھنے والے اللہ کے تمام بے باک شیروں کو لومڑی کے سے مکر و فریب کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی :۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی — اقبالؒ

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ دنیا میں صرف موحّد لوگ ہی "خوفِ حق" کو دلوں میں محفوظ کر لینے کے بعد ہر قسم کے خوفِ غیر اللہ اور حزن و ملال سے قطعی طور پر آزاد رہتے ہیں۔ یہی سچے "اولیاء اللہ" ہیں اور یہی خدا کے وفا دار دوست :۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ	یاد رکھو کہ اللہ کے سچے دوستوں پر نہ

عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ — تو (مخلوق کا) خوف طاری ہوتا ہے اور نہ وُہ کبھی غمزدہ ہوتے ہیں۔

پ ۱۱ : ۱۲ع

"خوفِ حق" کے بعد دنیا میں جو بڑے سے بڑا خوف انسان کو مرعوب و مضطرب کر سکتا ہے، وُہ ہے "خوفِ موت"۔ لیکن فقط خوفِ خدا رکھنے والے موحدین کی پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ وُہ موت سے ذرّہ برابر خائف نہیں ہوئے۔ بلکہ ذوقِ شہادت میں اس کے آرزومند اور متلاشی رہے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے کسی قدم پر بھی موت سے گریز نہیں کیا بلکہ اس والہانہ مستی و عشق میں اس سے ہم آغوش ہوئے ہیں کہ کوئی دُلہا اپنی دلہن سے بھی اس طرح ملاقی نہیں ہوا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موحد موت کے متعلق وُہ عقائد و تصورات نہیں رکھتا جو ایک کافر و مشرک اور فاسق و فاجر شخص رکھتا ہے۔ مشرک و فاسق اور بدکردار شخص اپنے جرائم و معاصی کے پیشِ نظر موت سے بے حد خائف و گریزاں ہوتا ہے، کیونکہ وہ اِس دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان حدِفاصل (موت) کے ٹوٹتے ہی اُس احکم الحاکمین کی عدالت میں حاضر ہونے والا ہے، جہاں اس کی فردِ جرائم موجود ہے اور جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ :-

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال)

"جو شخص ذرّہ برابر نیکی کرے گا وُہ بھی اُسے (روزِ قیامت) دیکھ لے گا اور جو شخص ذرّہ برابر بدی کرے گا وُہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔"

یہی وجہ ہے کہ تمام ایسے بیگانگانِ خوفِ حق اور غلامانِ ہوا و ہوس کے متعلق فرمایا گیا :-

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ	(اے پیغمبرؐ ، کہیئے کہ اگر آخرت کا گھر
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ	(بہشت) خاص تمہارے ہی لیے ہے
خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ	اور لوگوں کے لیے نہیں اور تم اس
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ	دعوے میں سچے بھی ہو ، تو موت کی آرزو
صٰدِقِیْنَ ○ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ	کیوں نہیں کرتے (کہ اپنا مقصد پا لو)
اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ	اور جو (بُرے) ، کام وُہ پہلے کر چکے ہیں
وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ	ان کی وجہ سے موت کی آرزو کبھی نہیں
وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ	کریں گے اور اللہ تعالیٰ بے انصافوں
عَلٰى حَیٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ	کو خوب جانتا ہے ۔ بلکہ تُو انہیں تمام
اَشْرَكُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ	لوگوں سے بڑھ کر دنیوی زندگی کا حریص
لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ	و دلدادہ پائے گا ، حتّٰی کہ مشرکوں سے
وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ	بھی زیادہ ۔ اُن میں کا ہر شخص یہ چاہتا
الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ	ہے کہ وُہ ہزار سال کی عمر پائے ۔ حالانکہ
بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ○	اتنی لمبی عمر بھی اس کو عذاب سے نہیں
	چھڑا سکتی اور اللہ ان کے کام خوب
پ ۱ ع ۱۱	دیکھ رہا ہے ۔

ایسے لوگوں کے برعکس دوسری جانب اُن اہلِ توحید پر بھی ایک نظر کیجیے جنہیں موت کی جانب دعوت دینے یا اس کے خطرات سے

خائف و مرعوب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ موت کو ایک ابدی زندگی کی پیامبر، رضائے الٰہی کا بہترین ذریعہ، بہشت بریں کا زینہ غیر فانی مسرّت کا سرچشمہ، اور سو فی صدی نفع بخش "تجارت" یقین کیئے ہوئے پروانہ وار اس پر لپکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس اپنے خالق و مالک کی مندرجہ ذیل بشارتیں موجود ہیں:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ
اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ
اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَ
مْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ
يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ
طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔
پ ۲۸ ؛ ع ۱۰

مسلمانو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت
نہ بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے
بچائے۔ وہ تجارت یہ ہے کہ اللہ اور
اس کے رسول پر ایمان لاؤ (توحید
اور سنت کی پیروی کرو)، اور خدا
کی راہ میں اپنے مال اور جان سے
جہاد[1] کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ (تجارت)
سب سے بہتر ہے۔ (اس پر عمل
کرنے سے)، خدا تمہارے گناہ معاف
کردے گا اور تمہیں ایسے باغاتِ
بہشت میں مقیم کرے گا۔ جن کے نیچے
نہریں بہہ رہی ہیں اور پھر تمہارے لیے

---

[1] "جہاد فی سبیل اللہ" کا یہ مطلب ہے کہ وہ جہاد صرف رضائے حق اور قیام و استحکام حق کے لیئے کیا جائے اور اس میں کوئی ذاتی یا نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

جنت العدن کے عمدہ عمدہ مکان بھی

ہیں - یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے -

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	بے شک اللہ تعالٰی نے بہشت کے
اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ	بدلے مسلمانوں کی جانیں اور مال خرید
لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ	لیے ہیں - وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ	ہیں اور اس میں (کفار و مشرکین کو) قتل
يُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَيْهِ	کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں -
حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ	اللہ کا یہ وعدہ[1] پکا ہے - جس کے ایفا
وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى	کا ذکر وہ توریت، انجیل اور قرآن میں
بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا	نے چکا ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا
بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ	وعدہ وفا کرنے والا اور کون ہو سکتا
وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ	ہے - پس (مسلمانو) جو سودا تم نے
	خدا کے ساتھ کیا ہے اس کی خوشی
پ ۱۱ - ع ۳	مناؤ - اور یہی تو بڑی کامیابی ہے -

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ	اللہ تعالٰے ان لوگوں کو دوست رکھتا
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا	ہے جو اس کی راہ میں ایسی محکم صفیں

---

[1] یعنی خدا کی راہ میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے عوض بہشت عطا کرنے کا وعدہ

كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۔ پ ۲۸ : ۹ ع — باندھ کر جہاد کرتے ہیں۔ کہ گویا وُہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۞ پ ۲ : ع ۳ — اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں۔ ان کو مُردہ مت کہو بلکہ وُہ تو (دائمی طور پر) زندہ ہیں مگر تم ان کی حیاتِ ابدی کو سمجھ نہیں سکتے۔

اور اے برادرانِ اسلام! کیا آپ کی روشن و عدیم النظیر تاریخ ایسے ہی موحّدین، ایسے ہی غازیانِ دین، ایسے ہی مجاہدینِ اسلام اور ایسے ہی عاشقانِ موت کے سنہری کارناموں سے معمور نہیں ؟ کیا انہوں نے خدائے واحد سے کما حقہٗ خائف ہو کر مخلوق خدا و ندوں کا خوف اس شان سے فنا نہیں کیا کہ تعدادِ قلیل کے ساتھ بے سرو سامانی کے عالم میں قیصرو کسریٰ کے تخت و تاج اُلٹ دیئے ؟ کیا انہوں نے خوفِ حق کی بے پناہ قوّت سے اپنے عہد کے تمام فرعونوں کو آستانۂ حق پر نہیں جھکا دیا؟ پس یاد رہے کہ موحّدین اور مردانِ حق اندیش "مرگ اندیش" ہرگز نہیں ہُوا کرتے بلکہ وُہ اپنے مقاصدِ حیات کی تحصیل و تسخیر کے لیے موت کے متلاشی رہا کرتے ہیں اور اُسے پا لینے کے بعد اُس پر یوں حملہ آور ہوتے ہیں جیسے شیر ہرن پر یا شاہین کبوتر پر حملہ آور ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؔ اسی بنا پر فرماتے ہیں :۔

بندۂ حق ضیغم و آہو ست مرگ — یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

بندۂ حق تو شیر ہے اور موت ہرن جس پر وہ حملہ آور ہوتا ہے — موت اس کے سو مرتبوں میں سے ایک مرتبہ ہے

می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام

وہ مردِ کامل موت پر اس بے باکی سے جھپٹتا ہے — جیسے ایک باز کبوتر پر حملہ آور ہو

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ

غلام تو ہر لحظہ موت کے خوف سے مرتا رہتا ہے — اور اس کی زندگی خوفِ مرگ سے حرام ہو جاتی ہے

بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر

لیکن مردِ آزاد کی شان ہی کچھ اور ہے — اور موت اسے ایک نئی روح عطا کرتی ہے

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

اسے صرف عرفانِ نفس کا ذوق ہے موت کا فکر نہیں — اور آزادوں کی موت ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہوا کرتی

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد — زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

اس موت سے بلند تر ہو جا جو قبر سے تعلق رکھتی ہے — کیونکہ یہ تو محض چوپایوں اور درندوں کی موت ہے

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک

مردِ مومن تو اللہ تعالیٰ سے وہ موت چاہتا ہے — جو پستیِ خاک سے آزاد و بلند تر ہو۔

آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

وہ دوسری موت جو راہِ عشق کی انتہا ہے — وہ موت جو عشق کے میدانِ جنگ میں آخری تکبیر ہے

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر

اگرچہ ہر موت مومن کیلیے نہایت شیریں و خوشگوار ہے — تاہم فرزندِ علیؓ کی موت کچھ اور ہی شان رکھتی ہے

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است

دنیوی بادشاہوں کی جنگ تو سراسر تباہی و بربادی ہے — لیکن مومن کی جنگ (جہاد) سنتِ پیغمبری ہے

جنگِ مومن چیست ؟ ہجرت سوئے دوست | ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست
مومن کی جنگ کیا ہے؟ اپنے دوست (خدا) کی طرف ہجرت | اور دنیائے دوں کو چھوڑ کر کوچہ محبوب اختیار کرنا

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت | جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت[1]
وہ ہستی مقدس جس نے قوموں کو درسِ عشقِ حق دیا | جنگ (جہاد) کو اسلام کی رہبانیت فرمایا

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
سچ تو یہ ہے کہ شہید کے سوا یہ نکتہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا

کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را
کیونکہ اُس نے یہ نکتہ قیمتِ خون دے کر خریدا ہے (جاوید نامہ)

چونکہ میں نے یہ عنوان ان الفاظ سے شروع کیا تھا کہ توحید انسان کو ہر قسم کے خوف و خدشہ، یاس و ناامیدی اور غم و اندوہ سے مکمل آزادی عطا کرتی ہے، لہٰذا میں اسی مفہوم کی مزید وضاحت کے لیے علامہ اقبالؔ کی مندرجہ ذیل مثنوی کا پیش کر دینا بھی نہایت ضروری سمجھتا ہوں:

در معنی ایں کہ خوف و حزن و یاس امّ الخبائث است و قاطعِ حیات۔ امّا "توحید" ازالۂ ایں امراضِ خبیثہ می کند[2]

---

[1] اَلْجِهَادُ رَهْبَانِيَّةُ الْإِسْلَامِ "دینِ اسلام کی رہبانیت جہاد ہے"

[2] ترجمہ:- اس مفہوم میں کہ خوف، غم، اور مایوسی تمام خباثت کی ماں ہے اور زندگی کو منقطع کرنے والی شے۔ لیکن صرف "توحید" ہی ان تمام امراضِ خبیثہ کا ازالہ کرتی ہے۔

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست
آرزو کو محو کرنے میں سامانِ موت پوشیدہ ہے

زندگانی محکم از لاتقنطُوا[1] است
اور زندگی امید و آرزو سے محکم و پائدار ہے

تا امید از آرزوئے پیہم است
جب سے امید مسلسل آرزو پر مبنی ہے

ناامیدی زندگانی را سم است
ناامیدی زندگی کے حق میں زہرِ قاتل ہے

ناامیدی ہمچو گور افشاردت
ناامیدی تجھے قبر کی طرح بھینچ دیتی ہے

گرچہ الوندی ز پا می آردت
اور اگرچہ تو کوہِ الوند ہو تجھے جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے

ناتوانی بندۂ احسانِ او
کمزوری و ناتوانی اس کے احسان کی غلام ہے

نامرادی بستۂ دامانِ او
اور نامرادی اس کے دامن سے وابستہ ہے

زندگی را یاس خواب آور بود
مایوسی زندگی کی بیدار قوتوں کو سلا دیتی ہے

این دلیلِ سستی عنصر بود
اور سستی عناصر کی بیّن دلیل ہے

چشمِ جاں را سرمہ اش اعمیٰ کند
اس کا سرمہ روح کی آنکھ کو اندھا کر دیتا ہے

روزِ روشن را شبِ یلدا کند
اور روشن دن کو تاریک رات بنا دیتا ہے

از دمش میرد قوائے زندگی
مایوسی کے سانس سے قوائے زندگی مر جاتے ہیں

خشک گردد چشمہ ہائے زندگی
اور زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے

خفتہ با غم در تہِ یک چادر است
مایوسی غم کے ساتھ ایک ہی چادر کے نیچے سوئی ہوئی ہے

غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است
اور غم و اندوہ رگِ جاں پر نشتر کا کام کرتا ہے

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
اے کہ غم کے قید خانے میں اسیر ہے

از نبیؐ تعلیم لا تحزن[1] بگیر
نبیؐ سے "غم نہ کر" کی تعلیم حاصل کر

---

[1] آیہ شریفہ: "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" غم و تشویش بالکل نہ کر (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے: یہ الفاظ آنحضرتؐ نے ابوبکر صدیقؓ سے اس وقت ارشاد فرمائے جب وہ سوئے مدینہ ہجرت کرتے وقت غار میں چھپ رہے تھے اور کفار ان کی تلاش میں تھے۔

این سبق صدّیق را صدیق کرد | سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد
اسی سبق نے صدّیق کو صدیق بنا دیا | اور اُسے پیمانۂ تحقیقِ حق سے سرمست کیا

از رضا مسلم مثالِ کوکب است | در رہِ ہستی تبسم برلب است
تسلیم و رضا سے مسلمان ستارے کی طرح روشن ہے | اور راہِ زندگی میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے

گر خدا داری ز غم آزاد شو | از خیالِ بیش و کم آزاد شو
اگر تو خدا پر ایمان رکھتا ہے تو غم سے آزاد ہو جا | اور کم و بیش کی بحث سے بھی بالاتر ہو جا

قوّتِ ایماں حیات افزایدت | وردِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ بایدت
قوتِ ایمانی تیری زندگی میں اضافہ کرتی ہے | لہٰذا نفیِ خوف و غم کا ورد کرنا چاہیئے

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود | قلبِ او از لَا تَخَفْ[1] محکم شود
جب کوئی کلیم کسی فرعون کی طرف جاتا ہے | تو اس کا دل نفیِ خوف کی آیت ہی سے توانا ہوتا ہے

بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است | کاروانِ زندگی را رہزن است
غیر اللہ کا خوف عمل کا بدترین دشمن ہے | اور زندگی کے قافلے کا مستقل رہزن

عزمِ محکم ممکنات اندیش ازو | ہمتِ عالی تامل کیش ازو
مضبوط ارادہ اس سے ممکن اور ناممکن کی بحث میں پڑ جاتا ہے | اور ہمتِ بلند بھی اس سے سوچ بچار کا مسلک اختیار کرتی ہے

تخمِ او چوں در گلت خود را فشاند | زندگی از خود نمائی باز ماند
جب غیر اللہ کے خوف کا بیج تیری مٹی میں آ پڑا | تو سمجھ لے کہ زندگی خود نمائی سے محروم ہو گئی

---

[1] آیۂ شریفہ:

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ۝ پ ۱۶، ع ۱۲ — "اے موسیٰ! (فرعون و لشکرِ فرعون سے) خوفزدہ نہ ہو۔ فتح و غلبہ تجھی کو حاصل ہوگا!"

فطرتِ او تنگ تاب و سازگار
بادلِ لرزان و دستِ رعشہ دار

اس کی فطرت نہایت محدود قوت رکھتی ہے
اور وہ فقط کانپتے ہوئے دل اور رعشہ دار ہاتھ کیلئے موزوں ہے

دزدد از پا طاقتِ رفتار را
می رباید از دماغ افکار را

وہ پاؤں سے طاقتِ رفتار چھین لیتا ہے
اور دماغ سے افکارِ تازہ زائل کر دیتا ہے

دشمنت ترساں اگر بیند ترا
از خیابانت چو گل چیند ترا

اگر تیرا دشمن تجھے خوف زدہ دیکھے
تو وہ تیرے باغ سے تجھے پھول کی طرح چن لیتا ہے

ضربِ تیغِ او قوی تر می فتد
ہم نگاہش مثلِ خنجر می فتد

ایسی حالت میں اس کی تلوار کی ضرب تیز تر پڑتی ہے
اور اس کی نگاہ بھی خنجر کا سا کام کرتی ہے

بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

خوف تو ہمارے پاؤں میں زنجیر کی مانند ہے
ورنہ ہمارے دریا میں تو سینکڑوں طوفانی موجیں موجود ہیں

بر نمی آید اگر آہنگِ تو
نرم از بیم است تارِ چنگِ تو

اگر تیرا نغمہ صحیح طور پر بلند نہیں ہوتا
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے چنگ کا تار ڈھیلا ہے

گوش تالبش دہ کہ گردد نغمہ خیز
بر فلک از نالہ آرد رستخیز

اس کا کان (چابی) مروڑ تا کہ اس سے نغمے پیدا ہوں
اور وہ اپنے نالہ و فریاد سے آسمان پر قیامت برپا کر دے

بیم جاسوسے است از اقلیمِ مرگ
اندرونش تیرہ مثلِ میمِ مرگ

خوف موت کے ملک میں سے ایک جاسوس ہے
اور اس کا باطن میمِ مرگ کی طرح تاریک ہے

چشمِ او برہم زنِ کارِ حیات
گوشِ او بزگیرِ اخبارِ حیات

اس کی آنکھ زندگی کے نظامِ کار کو درہم برہم کرتی ہے
اور اس کا کان زندگی کی خبریں چوری چھپے سن لیتا ہے

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست
اصلِ او بیم است اگر بینی درست

جو گناہ و شر بھی تیرے دل میں پوشیدہ ہے
تو غور کرے تو اس کی بنیاد خوف پر ہوگی

لابہ و مکاری و کین و دروغ — این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

خوشامد، مکر و فریب، کینہ اور جھوٹ — یہ تمام چیزیں خوفِ غیر اللہ سے فروغ پاتی ہیں

پردۂ زور و ریا پیراہنش — فتنہ را آغوش مادر دامنش

خوف کا لباس جھوٹ اور ریاکاری کا پردہ ہے — اور اس کا دامن فتنہ و فساد کے لیے آغوشِ مادر ہے

زانکہ از ہمت نباشد استوار — می شود خوشنود با ناسازگار

چونکہ وہ کسی کام کو ہمت سے محکم و استوار نہیں کر سکتا — لہذا مخالف و ناساعد حالات سے بھی خوش ہو جاتا ہے

ہر کہ رمزِ مصطفٰے فہمیدہ است

الغرض جس شخص نے بھی دینِ مصطفٰے کا راز سمجھ لیا

شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس نے تمام شرک خوفِ غیر اللہ میں پوشیدہ دیکھا (رموزِ بیخودی)

(۵) قلب و دماغ کی صحت و توانائی

توحید کا پانچواں فائدہ یہ ہے کہ اس سے جسمِ انسانی کے اعضائے رئیسہ یعنی قلب و دماغ کو ایک بے نہایت اور ناقابلِ تغیر صحت و توانائی حاصل ہوتی ہے اور یہ روحانی و جسمانی صحت و توانائی، دلجمعی، مسرت و طمانیت اور مستقل جرأت و بیبا کی درحقیقت حاصل و ثمر ہے۔ عقائد و افکار کی اُس مرکزیت کا جو "توحید" کی روحِ رواں ہے۔ گویا یہی عقیدۂ توحید اور عقائد و اعمال کا ایک متوازن نظم و ضبط طبعِ انسانی سے ہر قسم کے اضطراب و انتشار کو یکسر فنا کر کے اُسے ایک ہی ذاتِ حیّ القیوم سے وابستہ کر دیتا ہے، اور جب انسان کی وابستگی اور وفا اُس ہستی سے ہو جو تمام قوت و توانائی،

صحت و سالمیت، اور عظمت و سطوت کا منبع و مخزن واقع ہوئی ہے تو پھر دل و دماغ میں بھی ایک ناقابلِ تسخیر قوت و توانائی کیوں پیدا نہ ہو؟ ـــــ یہی وجہ ہے کہ روزِ آفرینش سے آج تک موحدین کے دل و دماغ اہلِ باطل کی کثرت اور مادی ساز و سامان کی فراوانی سے کبھی مرعوب و مغلوب نہیں ہوئے۔ تاریخ میں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی مردِ موحد نے کروڑوں مشرکین میں اعلانِ توحید کیا ہے اور مشکلات و موانع کے باوجود عمر بھر توحید ہی کی نشر و اشاعت کرتے ہوئے فریضۂ زیست کما حقہٗ ادا کیا ہے۔ آپ تمام انبیاء اولیاء اور صلحا کے حالاتِ زندگی اٹھا کر دیکھیں۔ اُن کے ہر صفحہ اور ہر سطر میں آپ کو اس چیز کی تصدیق ملے گی، اور حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار بندوں کو فہمِ توحید اور اعلانِ توحید کی توفیق بھی خود ہی عطا کرتا ہے اور پھر "قولِ ثابت" لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، پر ثابت قدم رہنے کی قوت بھی خود ہی مرحمت فرماتا ہے :-

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (پ ۱۳ : ع ۱۶)	اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو دنیوی اور اُخروی زندگی میں صحیح و محکم بات (کلمۂ توحید) پر مستعد اور ثابت قدم رکھتا ہے!

یہاں "قولِ ثابت" کا اصل مفہوم و مدعا کیا ہے؟ ـــــ یہی عقیدۂ توحید کہ ہمارا خالق و مالک، مشکل کشا اور حاجت روا فقط اللہ تعالیٰ ہے اور ہم اُس کے علاوہ کسی اور کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔ اس مفہوم

کی دلیل یہ ہے کہ :۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا	جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا خالق و
رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	پروردگار (معبودِ برحق) اللہ ہے اور
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ ا	پھر اپنی بات پر ثابت قدم رہے
لْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ	ان پر (رحمت کے) فرشتے اتریں گے
لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا	(اور کہیں گے) تم (کسی سے) ڈرو
بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ	نہیں اور نہ رنج و غم کرو اور جس
كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ہ	بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس
پ ۲۴ : ۱۸ ع	کی خوشیاں مناؤ ۔

(۶) دنیا اور عقبیٰ میں یقینی فلاح و بہبود

توحید کا چھٹا فائدہ یہ ہے

کہ وُہ مردِ موحد کے لیے دنیا اور آخرت ہر دو جگہ فلاح و بہبود اور عزت و کامرانی کی ضامن ہے اور سچ پُوچھئے تو دُعائے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ[1] کے موزوں ترین مستحق و مستوجب صرف موحدین ہی ہیں ۔ آپ اخبارِ قرآنی کی رو سے یقینی طور پر سُن رکھیں کہ ایک شخص نے خواہ بے شمار نیک کام کئے ہوں، اور نوعِ انسانی کی خدمت میں تمام

---

[1] (پ ۲ : ۹ ع) ترجمہ :۔ "پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی خیر و برکت عطا کر اور آخرت میں بھی اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لے۔"

عمر منہمک رہا ہو، لیکن اگر اس کے دامن میں دولتِ توحید نہیں تو وہ روزِ حساب مغفرت اور جنّت کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔ طوالت سے احتراز کرتے ہوئے یہاں ایک ہی دلیل پر اکتفا کرتا ہوں:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ	اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں
بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ	کرے گا اور اس کے علاوہ (دیگر گناہ)
يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِا	جسے چاہے معاف کردے اور جس نے
للّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا	اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا۔ اس
عَظِيْمًا ؕ ۵۱ پ ۵ ، ع	نے بہت بڑا گناہ باندھا۔

بخلاف اس کے یہ کلیہ بھی خوب یاد رکھیئے کہ روزِ قیامت ایک مردِ موحّد کے لیے بخشش و نجات یقینی ہے، خواہ بہ تقاضائے بشریّت اس سے بعض صغیرہ گناہ سرزد ہو چکے ہوں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد و اعمال میں توحید سے منحرف نہ ہوا ہو۔ یعنی غیر اللہ کو اپنے نفع و نقصان کا مختار نہ سمجھا ہو، انہیں اپنا مشکل کشا اور حاجت روا خیال نہ کیا ہو، بوقتِ ضرورت و مصیبت اُن سے استمداد نہ کی ہو اور دنیوی فرعونوں سے کبھی خائف نہ ہوا ہو۔ ایسی صورت میں جب کہ یہ دنیا ترغیباتِ گناہ اور محرکاتِ لذات سے ہمہ وقت معمور ہو اور پھر راہِ راست سے بہکانے والے شیاطین الانس کی بھی کمی نہ ہو، ایک موحّد اور متقی شخص کا بھی بہ تقاضائے بشریّت کسی نہ کسی وقت مرتکب گناہ ہو جانا کوئی حیرت انگیز چیز نہیں۔ پس درگاہِ غفور الرحیم میں ایسے تمام گناہوں کی بخشش کا امکان ہے۔ بشرطیکہ عاصی نے شرک کا ارتکاب

نہ کیا ہو۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ میں "عبادی" (میرے بندوں) سے مراد یقیناً موحد لوگ ہیں جو خدا کے مخلص اور باوفا "عبد" رہ کر بھی کوئی نہ کوئی خطا کر بیٹھے ہیں، لیکن وہ اپنے پاس کلید نجات یعنی "توحید" رکھتے ہوئے خدا کی رحمت سے ہرگز مایوس نہیں ہو سکتے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ؕ	(اے پیغمبرؐ!) میرے اُن بندوں سے جو (گناہوں کی وجہ سے) اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کر بیٹھے ہیں، یہ کہہ دیجیے۔ کہ تم اللہ کی رحمت و بخشش سے مایوس نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ (سچی توبہ کے بعد) تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بیشک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔
پ ۲۴، ع ۳	

شرک کے خبائث و مضرات

اگر "توحید" اسلام کے "شجرۂ طیبہ" کی جڑ ہے تو شرک کفر و فسق کے "شجرۂ خبیثہ" کی جڑ۔ "توحید" میں جس قدر اعتقادی اور عملی فوائد و محاسن پائے جاتے ہیں، شرک سے پیدا ہونے والے خبائث و مضرات عین اُن کی ضد واقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ توحید کے جو جو فوائد اوپر گنوائے گئے، ان کے برعکس ذیل میں شرک کے مضرات پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ضرر شرک کو یقینی اور قطعی سمجھئے کیونکہ وہ محض قیاسات و تصورات پر مبنی نہیں بلکہ آیاتِ کلام اللہ اور ارشاداتِ رسولؐ سے ماخوذ و مدلّل ہے۔

(۱) کائنات کی سب سے بڑی غدّاری و بے وفائی | شرک بکائنات

کی سب سے بڑی غداری و بے وفائی اس بنا پر ہے کہ جب ہمارے خالق و مالک نے اتمامِ حجت کے لیے ہم سے دریافت کیا تھا :- اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا صرف میں ہی تمہارا خالق و پروردگار نہیں ہوں ؟) تو ہم نے جواب دیا :- بَلٰی ! (بے شک تو ہی ہمارا خالق و پروردگار ہے !) اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آج ہم نہایت باغیانہ انداز میں اُسی عہدِ "بلٰی" کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی نہ کسی رنگ میں غیر اللہ کی پرستش کر رہے ہیں۔ دیوتاؤں، بزرگوں اور پیروں فقیروں کی پرستش کے علاوہ "نفسِ امّارہ" کی پرستش اور پیروی تو عبرتناک حد تک عام ہے۔ کیا اپنے خالق کے ساتھ اس سے بدتر غدّاری و بے وفائی کی مثال بھی کہیں ملے گی ؟

(۲) شک وشبہ اور تذبذب | شرک چونکہ بذاتِ خود ذات و صفاتِ الٰہی میں شکوک و شبہات کا نتیجہ ہے، لہذا آپ ہر مشرک شخص کو بھی زندگی کی تمام اقدار و قیمتیات کے متعلق مبتلائے شک و شبہ پائیں گے اور جب تک وہ صحیح و مستند طریقِ توحید اختیار نہ کرے، اُسے مرکزِ یقین ہرگز نصیب نہ ہوگا۔

(۳) خودی یا عزّتِ نفس کا زوال | جو شخص شرک کی ذلت و نکبت میں مبتلا ہو کر کائنات میں اپنا صحیح مقام و مرتبہ ہی نہ سمجھ سکے۔ اُس کی خودی (انا) کیا؟ اور جذبۂ عزّتِ نفس کیا ؟ بخلاف اس کے وہ کوتاہ نظر تو اللہ تعالیٰ کے

عطا کردہ خطاب نائب حق "خلیفہ" کی ناقدری کرکے خود کو عملاً ذلیل و حقیر کرنے کے درپے ہے!

(۴) قوم میں نفاق و اختلاف کی کثرت

توحید نوعِ انسانی کے لیئے وحدت و اخوت کی ضامن ہے۔ لیکن چونکہ شرک انسان کے عقائد و افکار اور اعمال و رجحانات کو مرکزِ توحید پر مرتکز نہیں رہنے دیتا، اور اُن میں بے انتہا انتشار و پراگندگی پیدا کرتا ہے، لہٰذا ایک مشرک قوم میں نفاق و اختلاف کی بھی کوئی حد نہیں رہتی۔ اور چونکہ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کی اکثریت مبہم و نامعلوم طور پر شرکیہ رسوم و عادات کا شکار ہو رہی ہے۔ لہٰذا فرقہ بندی، ذات پات اور عقائد و عواطف میں ان کا عبرت انگیز نفاق و اختلاف چنداں وجہِ حیرت نہیں!

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک! ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک!

حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک! کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک؟

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ (اقبالؒ)

(۵) مخلوق کا خوف و خدشہ

قرآنِ مجید میں بے شمار جگہ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے وہ ڈریں تو صرف اپنے خالق سے ڈریں۔ مخلوق سے ہرگز نہ ڈریں۔ بالفاظِ دیگر فقط خالق کا خوف روحِ توحید ہے اور مخلوق کا خوف بنیادِ شرک۔ ربِّ واحد کے خوف میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو معمورِ یقین

دلیر اور مضبوط و توانا کر کے اُسے اہلِ باطل پر فتح عطا کرتا ہے۔ بخلاف اس کے خوفِ مخلوق کا خاصہ یہ ہے کہ وُہ قلب انسانی کو گہوارۂ شکوک و شبہات، مذبذب اور ضعیف و کمزور کر کے ذلّت و شکست سے دوچار کرتا ہے اور بطورِ اصول یہ چیز بھی یاد رکھیئے کہ جو شخص خُدا سے خائف رہتا ہے، اُس سے نہ صرف کفّار و مشرکین بلکہ تمام کائنات خائف رہتی ہے۔ بخلاف اس کے مشرک سے کوئی چیز خائف نہیں رہتی بلکہ وُہ تو خود ہمہ وقت غیر اللہ سے خائف و مرعوب رہتا ہے۔ یہ وُہ حقیقت ہے جسے قرآن نے بایں الفاظ بیان کیا۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ	اب ہم کافروں کے دل میں (مسلمانوں کا)
كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا	رعب و دبدبہ ڈال دیں گے۔ کیونکہ انہوں
بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ	نے اُن چیزوں کو اللہ کا شریک بنا یا
سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ	جن (کے شریک ہونے) کی اس نے کوئی
وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ○	سند نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا دوزخ
	ہے۔ اور وُہ ظالموں (مشرکوں) کا بہت
پ ۴ : ۶، ۷	بُرا ٹھکانا ہے۔"

(۶) غم و اضطراب کا غلبہ

جب روح و دل ہی کو اُن کے اصلی اور فطری راستے (توحید) سے منحرف کر دیا گیا، اور "بلیٰ" کا پیمانِ ازل توڑ کر سرچشمۂ مسرت و طمانیت سے روگردانی اختیار کی گئی تو پھر اس کا نتیجہ ایک مسلسل غم و اضطراب نہ ہو تو کیا ہو؟

(۷) عزم وعمل کا فقدان اللہ تعالیٰ کی امداد و اعانت اور مشکل کشائی پر سو فی صدی بھروسہ رکھنا اور اسے اپنا بہترین رفیق و معین سمجھنا عزم وعمل کی جان ہے، اور جب یہی چیز مشرک سے کوسوں دُور ہو تو عزم وعمل میں توانائی کہاں سے آئے ؟ ۔۔۔ چنانچہ مشرک کے عزائم و اعمال میں ضعف و اضمحلال تو بہت ہوگا، لیکن قوت و استقلال ناپید !

(۸) عاقبت میں ذلّت وخُسران یہ مسئلہ تو پیشتر ازیں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ مشرک لوگ نہ صرف دنیا میں صحیح مسرّت و طمانیّت سے محروم رہیں گے، بلکہ عقبیٰ میں بھی اُن کے لیے عفو و بخشش کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ میں یہاں کسی طوالت میں پڑے بغیر مندرجہ ذیل دو آیات کو اس موضوع کی وضاحت کے لیے بالکل کافی سمجھتا ہوں:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۗ	(اے پیغمبرؐ، کہیئے کہ کیا میں تمہیں وہ لوگ بتاؤں جو اپنے اعمال (کی جزا) میں سب سے زیادہ نقصان اٹھائیں گے ؟ ۔۔۔
الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ (پ ۱۶ : ع ۳)	وہ لوگ (ایسے مشرکین) ہیں جن کی تمام کوشش دنیوی زندگی میں برباد ہو گئی[1] اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے کام کر رہے ہیں۔

---

[1] یعنی بوجہ شرک نیک اعمال بالکل ضائع ہو گئے۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا
لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا
صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ
رَبِّهٖٓ اَحَدًا ٥

پ۱۶ : ع۳

(اے پیغمبرؐ، کہ میں تمہاری طرح ایک آدمی[1] ہوں (اور ہمارے مابین روحانی فرق و امتیاز کے تحت)، مجھ پر یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبودِ برحق ہے۔ پس جو شخص اپنے خالق و مالک سے ملنے کی امید رکھتا ہو، اسے چاہیئے کہ نیک کام کرے اور خدا کی عبادت میں کسی (مخلوق) کو شریک نہ کرے)

تعلیمِ توحید کلامِ اقبالؒ میں

میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ توحید کے موضوع پر کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے سے پیشتر اس عنوان پر قرآنی تعلیمات کا اندازہ کر لینا نہایت ضروری ہے کیونکہ توحید کے متعلق علامہ اقبالؒ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ اس کا حقیقی منبع و مخزن قرآنِ مجید ہی ہے۔ اب کہ اس فرضِ مقدس کی تعمیل ہو چکی ہے، آپ کلامِ اقبالؒ میں اس کے حیات افروز شواہد و تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

---

[1] رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم، بلحاظ "عبدہٗ" (بندۂ حق) اور بربنائے حوائج و ضروریاتِ زندگی از روئے قرآنی کے مطابق، "بشر" ضرور تھے۔ لیکن اپنے مرتبۂ نبوت، صفاتِ اخلاق، قوتِ ایمانی و روحانی اور حسنِ عمل کے لحاظ سے وہ تمام عالمِ بشریت کے امام و پیشوا واقع ہوئے ہیں۔

تا عصائے [1] لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

جب تک تیرے ہاتھ میں توحید کا عصا ہے — تو خوف کے ہر جادو کو بآسانی توڑ دے گا

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیشِ باطل گردنش

جس شخص کے جسم میں حق روح کی طرح جاری وساری ہو — اس کی گردن باطل کے سامنے کبھی نہیں جھکتی

خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

اس کے سینہ میں خوف کوئی راہ نہیں پاتا — اور اس کا دل غیر اللہ سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا

ہر کہ در اقلیمِ "لا" آباد شُد — فارغ از بندِ زن و اولاد شُد

جو شخص توحید کے ملک میں آباد ہو گیا — وہ زن و اولاد کی قیدِ محبت سے بھی آزاد ہو گیا

می کند از ماسوا قطعِ نظر [2] — می نہد ساطور بر حلقِ پسر

وہ غیر اللہ سے اپنی نظر پھیر لیتا ہے — اور اپنے بیٹے کے حلق پر چھری پھیرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا

با یکی مثلِ ہجومِ لشکر است [3] — جاں بچشمِ او ز بادِ ارزاں تر است

وہ تنہا ہو کر بھی پورے لشکر کی قوت رکھتا ہے — اور اس کے نزدیک جان ہوا سے بھی سستی ہے

---

[1] مثلاً عصائے موسیٰؑ نے طلسمِ سامری کو توڑ دیا۔

[2] تلمیح ہے حضرت ابراہیمؑ کے حضرت اسمٰعیلؑ کو زیرِ خنجر رکھنے کی طرف۔ اس موقع و محل پر عرفی کیا خوب کہتا ہے:۔

طفلانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیلؑ — سر زیرِ تیغ داد و شہیدش نمی کنند

[3] قرآنِ مجید میں حضرت ابراہیمؑ کو فرد و واحد ہونے کے باوجود "توحید" کی قوت و برکت سے ایک مستقل "اُمت" قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ:۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ الخ پ ۱۴ : ع ۲۲

در جہانِ کیف و کم گردید عقل — پے بہ منزل برد از توحید عقل

اس جہان کیف و کم میں عقل آوارہ و سرگرداں تھی — لیکن عقل صرف توحید سے اپنی منزل کو پہنچی

ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست — کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست

ورنہ عقلِ بیچارہ کی منزل ہے کہاں ؟ — اور عقل کی کشتی نے ساحل کب پایا ہے ؟

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است — در اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا[1] مضمر است

اہلِ حق کو معنیٔ توحید خوب یاد ہے — وہ خدا کی اطاعتِ کاملہ میں پوشیدہ ہے

تا ز اسرارِ تو بنماید ترا — امتحانش از عمل باید ترا

تاکہ توحید تیرے اسرار تجھ پر ظاہر کردے — تجھے اس کی ممکنات کا امتحان عمل سے لینا چاہیے

دیں از و حکمت از و آئیں از و — زور از و قوت از و تمکیں از و

دین، حکمت اور آئین توحید سے زندہ و قائم ہے — اور زور و قوت اور عزت و آبرو بھی توحید سے برقرار ہے

عالماں را جلوہ اش حیرت دہد — عاشقاں را بر عمل قدرت دہد

عالموں میں توحید کا جلوہ حیرت پیدا کرتا ہے — اور عاشقانِ حق کو عمل پر قدرت عطا کرتا ہے

پست اندر سایہ اش گردد بلند — خاک چوں اکسیر گردد ارجمند

اس کے سایہ میں رہ کر پست بھی بلند ہو جاتا ہے — اور اس کے اثر سے خاک بھی اکسیر کا رتبہ پاتی ہے

قدرت او برگزیند بندہ را — نوعِ دیگر آفریند بندہ را

توحید کی طاقت غلام کو پستی سے اٹھا لیتی ہے — اور توحید غلام کو کچھ اور چیز بنا دیتی ہے

---

[1] آیہ شریفہ :- اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا

آسمانوں اور زمین کی ہر مخلوق اپنے مالک خالق کے حضور ایک عاجز و بے بس غلام کی طرح حاضر ہوتی ہے۔

ۂ حق تیز تر گردد تگش — گرم تر از برقِ خوں اندر رگش

شخص کی رفتار راہِ حق میں تیز تر ہو جاتی ہے — اور اس کی رگوں میں خون بجلی سے زیادہ گرم ہو جاتا ہے

ِ شک میرد، عمل گیرد حیات — چشم می بیند ضمیرِ کائنات

ت اور شک مر جاتا ہے اور عمل زندہ ہوتا ہے — اور آنکھ ضمیرِ کائنات کو دیکھنے لگتی ہے

چوں مقامِ "عبدہٗ" محکم شود

جب مقامِ عبودیت (عہدِ توحید) مضبوط ہوتا ہے

کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

تو کاسۂ گدائی بھی جامِ جمشید بن جاتا ہے

ِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ

لہ بیضا ایک جسم ہے اور توحید اس کی روح — اور ہمارے ساز کے پردوں میں ارتعاش پیدا کرنے والی شے توحید ہے

ِ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

ہے تمام اسرارِ ملی کا اصل سرمایہ ہے — اور اس کا رشتہ ہماری کتابِ افکار کا شیرازہ ہے

ں از لب چوں بدل آید ہمے — زندگی را قوت افزاید ہمے

ب لا الٰہ دل میں اتر جاتا ہے — تو وہ زندگی میں بے پناہ قوت کا اضافہ کرتا ہے

ِ او گر سنگ گیرد دل شود — دل گر از یادش نہ سوزد گِل شود

ہ پتھر میں پیدا کیا جائے تو وہ دل ہو جائے — اور اگر دل اس کے درد سے پرسوز نہ ہو تو مٹی بن جائے

ِل از سوزِ غمش افروختیم — خرمنِ امکاں ز آہے سوختیم

ے توحید کے سوزِ غم سے دل روشن کیا — تو خرمنِ عالم کو ایک آہ سے جلا کر راکھ کر دیا

دلہا درمیانِ سینہ ہا — سوزِ او بگداخت ایں آئینہ ہا

ے دل سینوں میں پانی بن جاتے ہیں — اور اس کی حرارت نے ان آئینوں کو پگھلا دیا

شعلہ اش چوں لالہ در رگہائے ما — نیست غیر از داغِ او کالائے ما

اس کا شعلہ ہماری رگوں میں آتشِ لالہ کی طرح رواں دواں ہے — اور اس داغِ توحید کے علاوہ ہمارا کوئی ساز و سامان ہی نہیں

اسود از توحید احمر می شود — خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

سیاہ فام غلام بھی توحید سے سرخ ہو جاتا ہے — اور فاروقؓ و ابوذرؓ جیسی ہستیوں کا بھائی بنتا ہے

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است — شوق را مستی ز ہم پیمانگی است

دل ایسی چیز ہے جس میں قرابت کے جذبات بھی ہیں اور بیگانگی کے بھی — لیکن عشقِ حق کی مستی مل کر پینے ہی سے ہے

ملت از یک رنگیٔ دلہاستے — روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

ملت کی تشکیل دلوں کی یک رنگی سے ہوتی ہے — اور یہ طُور ایک ہی جلوۂ اتحاد سے روشن ہوتا ہے

قوم را اندیشہ ہا باید یکے — در ضمیرش مدّعا باید یکے

پس قوم کے دماغ میں خیال و تصور صرف ایک ہونا چاہیے — اور اس کے دل میں مقصد و مدّعا بھی صرف ایک ہو

جذبہ باید در سرشتِ او یکے — ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے

قوم کی طینت میں جذبہ بھی صرف ایک ہو — اور خوبصورت و بدصورت کا معیار بھی صرف ایک

گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر — نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر

اگر ہمارے سازِ فکر میں سوزِ حق کارفرما نہ ہو — تو ایسا صورتِ اتحاد اندازِ فکر ممکن ہی نہیں

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ — از اَبِیْکُمْ[1] گیر اگر خواہی دلیل

ہم سب مسلمان ہیں اور خلیل اللہ کی اولاد — اگر دلیل درکار ہو تو آیۂ اَبِیْکُمْ پر غور کر

---

[1] تلمیح بآیۂ شریفہ: مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۔ پ۱۷ : ع۱۰

"یہ دینِ اسلام تمہارے روحانی باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ انہیں نے تمہارا نام "مسلمان" رکھ دیا ہے۔"

باوطن وابستہ تقدیرِ امم — **برنسب بنیادِ تعمیرِ امم**

قوموں کی تقدیر عموماً وطن سے وابستہ ہُوا کرتی ہے — اور تعمیرِ اقوام حسب و نسب پر مبنی ہوتی ہے

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ — **باد و آب و گِل پرستیدن کہ چہ**

لیکن قوم کی بنیاد کو وطن میں ڈھونڈھنا کیا معنی رکھتا ہے — اور ہَوا، پانی اور مٹی کی پرستش میں کیا رکھا ہے؟

بر نسب نازاں شدن نادانی است — **حکمِ او اندر تن و تن فانی است**

حسب نسب پر فخر کرنا نادانی ہے — اس کا حکم صرف جسم پر چلتا ہے اور جسم فانی ہے

ملتِ ما را اساسِ دیگر است — **ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است**

مگر ہماری ملتِ اسلامیہ کی تو بنیاد ہی کسی اور شے پر رکھی گئی ہے — اور یہ بنیادِ توحید ہمارے دل میں پوشیدہ ہے

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم — **پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم**

ہم دنیا میں حاضر ہیں مگر دل ہستیِ غائب سے باندھ رکھا ہے — لہٰذا ہم ایں و آں کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں

رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است[۱] — **چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است**

اس قوم کا رشتۂ اتحاد ستاروں کی طرح ہے — وہ رشتہ نظر کی طرح ہے تو موجود لیکن دکھائی نہیں دیتا

تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما — **یک نما یک بیں یک اندیشیم ما**

ہم سب ایک ہی ترکش کے تیز پیکاں تیر ہیں — ہم یک نما ہیں ایک بیں ہیں اور یک اندیش

مدعائے ما مآلِ ما یکیست — **طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست**

ہمارا مقصد و مدعا اور نتیجہ بھی ایک ہی ہے — اور ہمارے خیال و تصور کا انداز بھی ایک ہی

---

۱ اسی انداز پر ذوق کا ایک لطیف شعر ہے:۔

اس سے دیکھا سب کو اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ — وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

ما زِ نعمت ہائے او اخواں[1] شدیم

ہم خدائی رحمت و برکت سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے

یک زبان و یکدل و یکجاں شدیم

اور اصولِ اخوت سے یکزبان، ایک دل اور یکجان ہو گئے

این کہن پیکر کہ عالم نامِ اوست
زامتزاجِ امہات اندامِ اوست

یہ پیکرِ فرسودہ جسے دنیا کہتے ہیں
اس کا جسم عناصرِ اربعہ کی ترکیب سے پیدا ہوا ہے

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

اس نے سینکڑوں نیستاں بوئے تب کہیں ایک نالہ پیدا ہوا
اور سینکڑوں چمن خون کیے تب کہیں ایک گل پیدا ہوا

نقشہا آورد و افگند و شکست
تا بہ لوحِ زندگی نقشِ تو بست

دنیا بے شمار نقش لائی، انہیں تشکیل دی اور پھر توڑ دیا
حتیٰ کہ لوحِ زندگی پر تیرا نقش ثبت کیا

نالہا در کشتِ جاں کاریدہ است
تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

اس نے نوعِ انسانی کی کشتِ روح میں بیشمار نالے بوئے
اور اُن سے ایک صدائے اذان پیدا ہوئی

مدتے پیکار با احرار داشت
با خداوندانِ باطل کار داشت

دنیا عرصۂ دراز تک مردانِ آزاد سے محوِ پیکار رہی
اور اسی طرح بانیان و پیروانِ باطل سے بھی مصروفِ جنگ رہی

تخمِ ایماں آخر اندر گل نشاند
با زبانت کلمۂ توحید خواند

اور آخرکار تیری خاکِ جسد میں ایمان کا بیج بو دیا
اور تیری زبان سے کلمۂ توحید کہلا یا

---

[1] تلمیح بآیۂ شریفہ :- وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔

"مسلمانو! اپنے لیے اللہ کی وہ عظیم الشان نعمت یاد کرو، جبکہ تم ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے۔ لیکن اس نے بذریعۂ قرآن، تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا کی اور تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا الہ ۔۔۔ انتہائے کارِ عالم لا الہ

پرکارِ عالم کے تمام چکر نقطۂ لا الہ کے گرد گھومتے ہیں ۔۔۔ اور دنیا کے مکمل نظام کی انتہا لا الہ ہے

چرخ را از زورِ او گردندگی ۔۔۔ مہر را پایندگی رخشندگی

آسمان اسی کے زور سے گردش کر رہا ہے ۔۔۔ اور سورج اسی سے روشن و پائندہ ہے

بحر گوہر آفرید از تابِ او ۔۔۔ موج در دریا تپید از تابِ او

سمندر نے اسی کی روشنی سے موتی پیدا کیے ۔۔۔ اور موجِ دریا میں اسی کی حرارت سے مضطرب ہے

خاک از موجِ نسیمش گل شود ۔۔۔ مشتِ پر از سوزِ او بلبل شود

خاک اسی کی موجِ ہوا سے پھول بن جاتی ہے ۔۔۔ اور ایک مشتِ پر اسی کے سوز سے بلبلِ خوش نوا

شعلہ در رگہائے تاک از سوزِ او ۔۔۔ خاکِ مینا تابناک از سوزِ او

انگور کی بیل کی رگوں میں اسی کے شعلے سے سوز ہے ۔۔۔ اور خاکِ مینا اسی کی حرارت سے روشن ہے

نغمہ ہایش خفتہ در سازِ وجود ۔۔۔ جویدت اے زخمہ در سازِ وجود

توحید کے نغمے ہمارے سازِ وجود میں سوئے پڑے ہیں ۔۔۔ اے مضراب! توحید تجھے سازِ وجود میں ڈھونڈ رہی ہے

صد نوا داری چو خوں در تن رواں ۔۔۔ خیز و مضرابے بہ تارِ او رساں

اے مسلمان! تو اپنے جسم میں خون کی مانند سینکڑوں نغمے رواں رکھتا ہے ۔۔۔ اٹھ اور اپنے سازِ وجود کے تاروں پر مضرابِ توحید لگا

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست ۔۔۔ حفظ و نشرِ لا الہ مقصودِ تست

چونکہ تکبیر ہی میں تیری بقا تیری ہستی کا راز ہے ۔۔۔ لہٰذا لا الہ کی حفاظت و اشاعت ہی تیرا مقصدِ زندگی ہے

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے ۔۔۔ گر مسلمانی نیاسائی دمے

جب تک لا الہ کی صدائے حق تمام دنیا سے بلند نہ ہو ۔۔۔ اگر تو مسلمان ہے تو ایک دم کے لیے بھی آرام نہ کر

می ندانی آیۂ امّ الکتاب[۱] ۔۔۔ امتِ عادل ، ترا آمد خطاب

کیا تو نے قرآن مجید کی وہ آیت نہیں پڑھی سمجھی ۔۔۔ جس میں تجھے "امتِ عادل" کا عظیم الشان خطاب ملا ہے

۱ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

ب و تابِ چہرۂ ایامِ تو — در جہاں شاہد علی الاقوام تو

توحید کی برکت سے چہرۂ عالم کی چمک دمک ہے — اور دنیا میں تو دیگر اقوام کے عمل پر گواہ بن کر آیا ہے

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ — از علومِ امیّے پیغام دہ

تو صاحبِ فہم و شعور لوگوں کو توحید کی جانب دعوتِ عام دے — اور اس امی نبیؐ کے علوم کا پیغام ان تک پہنچا

امیّے پاک از ہویٰ گفتارِ او[1] — شرحِ رمزِ ما غویٰ گفتارِ او

وہ امی جس کی گفتار خواہشاتِ نفسانی سے پاک ہے — اور اس کی احادیث رمزِ ما غویٰ کی شرح ہیں

تا بدست آورد نبضِ کائنات — وانمود اسرارِ تقویمِ حیات

جب اُس نے نبضِ کائنات پر اپنا ہاتھ رکھا — کتابِ زندگی کے تمام پوشیدہ بھید کھول کر رکھ دیئے

حاشیہ صفحہ گزشتہ :- [1] "عدل" کے معنی ہیں افراط و تفریط سے محترز رہ کر راہِ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا۔ اس بنا پر "امتِ عادل" وہ "امتِ وسط" ہوئی جس کا تذکرہ اس آیۂ شریفہ میں موجود ہے :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل درمیانے درجے کی امت بنایا تاکہ تم روزِ قیامت، دوسرے لوگوں (قوموں) پر گواہ بنو اور ہمارا پیغمبر تم پر گواہ ہو"۔

[1] آیۂ شریفہ :- وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

مصرع دوم میں: مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔

"ہمارا نبی اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا بلکہ وہ تو وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے" یعنی تمہارا دوست و ہم نشین (رسول کریمؐ) نہ تو راہِ راست سے بھٹکا، اور نہ گمراہ ہوا۔

از قبائے لالہ ہائے ایں چمن
پاک شست آلودگیہائے کہن

چمن دنیا کے گل ہائے لالہ کی پوشاک سے
اس نے تمام پرانی آلودگیاں بالکل دھو ڈالیں

درجہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بآئینش حیات

دنیا میں زندگی اسی کے دین حق سے وابستہ ہے
اور اس کا آئین اختیار کئے بغیر زندگی برقرار ہی نہیں رہ سکتی

اے کہ می داری کتابش در بغل
تیز تر نہ پا بہ میدانِ عمل

اے کہ اس کی کتاب مقدس (قرآن) بغل میں لئے ہوئے ہے
اپنا پاؤں میدانِ عمل میں تیزی سے رکھ

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے

انسان کی فکر آج بت پرست اور بت گر ہو رہی ہے
اور وہ ہر لمحہ کسی نئے صنم خیالی کی جستجو میں رہتی ہے

باز طرحِ آذری انداخت است
تازہ تر پروردگارے ساخت است

اس نے آج پھر بت گری کی بنیاد رکھ دی ہے
اور ایک نیا خدا گھڑ بنا کر سامنے لائی ہے

کاید از خوں ریختن اندر طرب
نامِ او رنگ است وہم ملک و نسب

وہ خدا جو خوں ریزی سے نہایت خوش ہوتا ہے
اس کا نام ہے رنگ اور ملک و نسب

آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند
پیشِ پائے ایں بتِ نا ارجمند

نوعِ انسانی اس فتنہ انگیز بت کے قدموں میں
بھیڑ کی طرح کٹ کر ہلاک ہو گئی

اے کہ خوردستی ز مینائے خلیلؑ
گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیلؑ

اے کہ تو نے خلیل اللہ کی صراحی سے شراب توحید پی ہے
اور تیرے خون کی حرارت بھی شرابِ ابراہیم سے ہے

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ لَا مَوجُودَ اِلّا ھُو بزن

اس لباس حق میں نمودار ہونے والے باطل کے سر پر
اس تلوار کا وار کر کہ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں

جلوہ در تاریکیِ ایام کن [1]
آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

دنیا کی تاریکیِ شرک کو نور توحید سے بدل دے
اور جو دین تجھ پر کامل ہو کر آیا اسے عام کر دے

[1] حاشیہ صفحہ ۰ پر ملاحظہ ہو

لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار پرسدت آں آبروئے روزگار
میں تو روزِ قیامت تیری ندامت کے تصور سے کانپ اٹھتا ہوں جب وہ آبروئے عالم پیغمبر تجھ سے پوچھے گا کہ

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
تو نے کلامِ حق ہم سے تو سنا اور سمجھا
پس چرا با دیگراں نسپردۂ
لیکن دیگر اولادِ آدم تک اسے کیوں نہ پہنچایا؟

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر سوختن در لَا اِلٰہ از من بگیر!
اے بیٹا! مجھ سے ذوقِ نظر حاصل کر اور سوزِ لا الٰہ میں جلنا مجھ سے سیکھ
لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
اگر تو لا الٰہ کہتا ہے تو زبانِ روح سے کہہ تا کہ تیرے جسم سے خوشبوئے روح آئے
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا الٰہ. دیدہ ام ایں سوز را در کوہ وکہ
سورج اور چاند بھی سوزِ لا الٰہ سے گردش کر رہے ہیں اور میں نے اس کی حرارت دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں دیکھی ہے
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست
یہ دو حرفِ لا الٰہ محض ورد کرنے کی چیز نہیں یہ تو باطل کے خلاف ایک بے پناہ تلوار ہے

زیستن با سوز او قہاری است
سوزِ لا الٰہ سے جینا ہی غلبہ و حکومت کا ضامن ہے
لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است
لا الٰہ ایک ضربِ حق ہے اور نہایت مؤثر ضرب ہے

---

[1] حاشیہ ص۷۷۔ مصرع دوم میں لفظ "کامل" سے تلمیح پائی جاتی ہے اس آیت شریفہ کی طرف:۔
اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ اس لحاظ سے مفہومِ مصرع یہ ہوا کہ دینِ کامل (اسلام) کی تبلیغ عام کرو۔

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

اگر تو ثبات و استقلال چاہتا ہے تو قرآن سے بہرہ ور ہو میں نے اس کے ضمیر میں آبِ حیات پایا ہے

می دہد ما را پیامِ لَا تَخَفْ[1] می رساند بر مقامِ لَا تَخَفْ

قرآن ہمیں "خوف نہ کر" کا پیغام دیتا ہے اور "خوف نہ کر" کے مقامِ بلند تک پہنچا دیتا ہے

قوّتِ سلطان و میر از لَا اِلٰہ ہیبتِ مردِ فقیر از لَا اِلٰہ

بادشاہ اور امیر کی قوت صرف توحید سے ہے اور ایک مردِ فقیر کی ہیبت و سطوت بھی توحید سے

تا دو تیغِ لَا وَ اِلَّا داشتیم مَاسِوَا اللہ را نشاں نگذاشتیم

جب تک ہم نفیِ باطل اور اثباتِ حق کی دو تلواریں رکھتے ہیں ہم نے دنیا میں غیر اللہ کا نام و نشان بھی نہ رہنے دیا

دارم اندر سینہ نورِ لَا اِلٰہ در شرابِ من سرورِ لَا اِلٰہ

میں اپنے سینہ میں نورِ لا الٰہ رکھتا ہوں اور میری شرابِ زیست سرورِ لا الٰہ سے معمور ہے

فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

میری فکر آسمان پر پرواز کرتی ہے تو اسی کے اثر سے اور میری ندی کوئی ساحل گوارا نہیں کرتی تو اسی کے اثر سے

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام

پس میری شرابِ توحید سے ایک دو جام پی

تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام (پس چہ باید کرد)

تاکہ تو تیغِ بے نیام کی طرح دنیا میں چمکے

---

[1] لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (آیۃ شریفہ)

"کفار سے کسی قسم کا خوف مت کھاؤ، کیونکہ فتح و کامرانی تمہیں کو حاصل ہوگی"

مردِ مومن از کمالاتِ وجود — او وجود و غیرِ او ہر شے نمود

مردِ مومن کمالاتِ وجود کا مظہر ہے — وجودِ حقیقی صرف اسی کا ہے باقی سب کچھ نمود و ریا

گر بگیرد سوز و تاب از لا اِلٰہ — جز بکامِ او نہ گردد مہر و مہ

اگر وہ لا اِلٰہ سے سوز و نور حاصل کرے — تو سورج اور چاند بھی اس کے حسبِ منشا گردش کریں

نکتہ می گویم از مردانِ حال[1] — اُمتاں را "لا" جلال "الّا" جمال

میں تجھے مردانِ حال کے تعامل کا ایک نکتہ بتاتا ہوں — قوموں کے لیئے لاَ سراپا جلال ہے اور الّا جمال

لاَ و اِلّا احتسابِ کائنات — لاَ و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

لاَ اور الّا کائنات کا بہترین محاسبہ ہے — لاَ و الّا کے اعجاز سے کائنات کا دروازہ کھلتا ہے

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لاَ زاید از الّا سکون

یہ ہر دو اس جہانِ کُن کی تقدیر ہیں — اس "کُن" کی حرکت تو لاَ سے پیدا ہوتی ہے اور سکون الّا سے

تا نہ رمزِ لاَ اِلٰہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک رمزِ لاَ اِلٰہ ہمارے ہاتھ نہ آجائے — غیر اللہ کے بند کو ہرگز نہیں توڑا جا سکتا

در جہاں آغازِ کار حرفِ لاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

دنیا میں ہمارا آغازِ کار حرفِ لاَ سے ہے — اور یہ مردِ خدا کی پہلی منزل ہے !!!

ملتے کہ سوزِ او یک دم تپید — از گلِ خود خویش را باز آفرید

جو قوم اس کے سوز سے ایک دم بھی تڑپی — اس نے اپنی مٹی سے خود کو دوبارہ تعمیر کر لیا

پیشِ غیر اللہ "لا" گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات

غیر اللہ کے سامنے لاَ کہنا بقائے زندگی ہے — اور اس کے ہنگاموں ہی سے کائنات تازہ و نو ہے

---

[1] یاد رکھیئے کہ آئندہ تمام اشعار میں "لا" نفیِ باطل کے لئے ہے اور "الّا" اثباتِ حق کے لئے۔ بالفاظ دیگر لاَ کے معنی ہیں نفیِ غیر اللہ اور الّا کے معنی ہیں معبودیتِ ربِ واحد کا اثبات۔

از جنونش ہر گریباں چاک نیست
لیکن اس کے جنون سے ہر گریباں چاک نہیں ہے
در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست
اور ہر خس و خاشاک اس شعلہ کے قابل نہیں

جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد
صرف ایک مردِ زندہ کے دل میں اس کا جذبہ
می کند صد رہ نشیں را رہ نورد
سو راہ نشینوں کو سرگرمِ سفر کر دیتا ہے

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟
کیا تو کسی غلام کو اس کے آقا سے متصادم دیکھنا چاہتا ہے؟
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
اس کے لئے اس کی خاک میں تخمِ لا پھینک دے

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
جس شخص کے جگر میں "لا" کا سوز موجود ہو
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر
اس کا خوف و دبدبہ خوفِ قیامت سے بھی زیادہ ہے

لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے
لاسلسل ضرباتِ حق کا مرتبۂ عالی ہے
ایں غورِ رعد است نے آوازِ نے
یہ بجلی کی کڑک ہے، بنسری کا نغمہ نہیں ہے

ضربِ او ہر بود را سازد نبود
اس کی ایک ضرب ماسوا اللہ کو محو و نابود کر دیتی ہے
تا بروں آئی ز گردابِ وجود
تاکہ تو عالمِ وجود کے فکر آموز گرداب سے باہر نکل آئے

با تو می گویم ز ایامِ عرب
میں تجھ سے تاریخِ عرب کا تذکرہ کرتا ہوں
تا بدانی پختہ و خامِ عرب
تاکہ تو عرب کے پختہ و خام کا اندازہ کر سکے

ریزہ ریزہ از ضربِ او لات و منات
لات و منات اس کی چوٹوں سے پاش پاش ہو گئے
در جہات آزاد از بندِ جہات
وہ اطرافِ عالم میں رہ کر بھی ان سے آزاد تھا

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
اس کے ہاتھ سے ہر پرانا لباس چاک چاک ہو گیا
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او
اور قیصر و کسریٰ جیسے شاہ اس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
کبھی تو جنگل اس کے طوفانِ برق و باراں میں گم رہے رہے

گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد
اور کبھی سمندر اس کے طوفانوں سے جوش میں رہے

عالمے در آتشِ او مثلِ خس
اس کی آتشِ حق میں ایک دنیا مانندِ خس جل گئی

ایں ہمہ ہنگامۂ لا ، بود و بس
یہ سب کچھ صرف لا کا پیدا کیا ہوا ہنگامہ تھا

اندریں دیرِ کہن پیہم تپید
عرب اس پرانے بتکدے میں مسلسل تڑپتا رہا۔

تا جہانے تازہٗ آمد پدید
حتّٰی کہ اس کی جدو جہد سے ایک جہانِ تازہ پیدا ہو گیا

بانگِ حق از صبح خیز یہائے اوست
دنیا میں صدائے حق اسی کی صبح خیزی سے پیدا ہوئی

ہر چہ ہست از تخم ریز یہائے اوست
اور ایمان و عمل کے متعلق جو کچھ بھی ہے اسی کی تخم ریزی ہے

اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند
جہاں بھی کسی نے شمعِ لالہ روشن کی ہے

از کنارِ جوئے او آوردہ اند
وہ اسے جوئے عرب ہی کے کنارے سے اٹھا لایا ہے

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شُست
عرب نے لوحِ دل سے نقشِ غیر اللہ کو دھو دیا۔

از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست
اور اس کی کفِ خاک سے سینکڑوں ہنگامے برپا ہوئے

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
اے کہ حجرے کے گوشے میں بیٹھا ہوا باتیں بناتا ہے

نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
نمرودانِ عصر کے سامنے لا کا نعرہ بلند کر

ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو
جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ تو دو جو کی قیمت بھی نہیں رکھتا

از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو!
تو لا الٰہ کے جلال و کمال سے باخبر ہو

ہر کہ اندر دست او شمشیرِ لا ست
جو شخص بھی اپنے ہاتھ میں لا کی تلوار رکھتا ہے

جملہ موجودات را فرمانروا ست (پس چہ باید کرد)
وہ تمام کائنات کا مختار و بادشاہ ہے۔

فروغِ او بہ بزم باغ و راغ است — گل از صہبائے او روشن ایاغ است

خدائے واحد کا نور باغ کی محفل میں بھی ہے اور جنگل میں بھی — پھول کا جام اسی کی شرابِ توحید سے روشن ہے

شبِ کس در جہاں تاریک نگذاشت — کہ در ہر دل ز داغِ او چراغ است (پیامِ مشرق)

اس نے دنیا میں کسی کی رات بھی تاریک نہیں رہنے دی — کیونکہ ہر دل میں اس کے داغِ عشق کا چراغ موجود ہے

مرا فرمود پیرِ نکتہ دانے

ایک نکتہ دان بوڑھے نے مجھے یہ درسِ حکمت دیا کہ

ہر امروزِ تو از فردا پیام است

تیرا ہر آج اپنے آئندہ کل کا پیغام و اہتمام رکھتا ہے

دل از خوبانِ بے پروا نگہ دار

اپنے دل کو غافل و بے وفا حسینوں سے محفوظ رکھ

حریمش جز باو دادن حرام است (پیامِ مشرق)

کیونکہ خدا کا گھر خدا کے علاوہ کسی اور کو دینا حرام ہے

رمیدی از خداوندانِ افرنگ

تو فرنگی آقاؤں کی غلامی سے تو متنفر اور کنارہ کش ہوا

ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی

مگر ضعفِ یقین و ایمان سے گور و گنبد کو سجدہ کرتا پھرتا ہے

بہ لالائی چناں عادت گرفتی

دراصل تو غلامانہ ذہنیت کا اس بری طرح سے عادی ہوا ہے

ز سنگِ راہ مولائے تراشی (پیامِ مشرق)

کہ راستے میں پڑے ہوئے پتھر کو بھی اپنا دست و مشکل کشا بنا لیتا ہے

دلِ خود را بدستِ کس ندادم

میں نے اپنا دل مخلوق میں سے کسی کے ہاتھ نہیں دیا

گرہ از روئے کارِ خود کشادم

اور اپنے کاموں کی الجھن مدد الٰہی سے خود رفع کی

بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار

جب بھی میں نے غیر اللہ پر ایک مرتبہ بھروسہ کیا

دو صد بار از مقامِ خود فتادم (ارمغانِ حجاز)

میں دو سو مرتبہ اپنے مرتبۂ ایمان سے گر گیا

دریں بُت خانہ دل با کس نہ بستم

اگرچہ میں نے دنیا کے بتکدے میں اپنا دل کسی سے نہ باندھا

ولیکن از مقامِ خود گسستم

لیکن اپنی عظمت و فضیلت سے پھر بھی بے خبر رہا

زمن امروز می خواہد سجودے

آج وہ جھوٹا خدا مجھ سے سجدوں کا مطالبہ

خداوندے کہ دی اُو را شکستم (ارمغانِ حجاز)

کر رہا ہے جسے میں نے کل پاش پاش کر دیا تھا

بجامِ نو[1] کہن مے[1] از سبو[1] ریز

نئے جام میں اپنے سبو سے پرانی شراب ڈال

---

[1] جامِ نو: مراد دنیائے جدید۔ کہن مے: مراد اتباعِ توحید و سنت۔ سبو: مراد دل

فروغِ خویش را بر کاخ و کو ریز

اور اپنی روشنی علم و عمل دنیا کی آبادیوں پر پھینک

اگر خواہی ثمر از شاخِ منصور

اگر تو شاخِ منصور سے کوئی پھل چاہتا ہے

بہ دل لاَ غالِبَ اِلاَّ اللہ فرو ریز (ارمغانِ حجاز)

تو دل کو یہ سبق پڑھا کہ کوئی غالب و حاکم نہیں مگر اللہ

کسے کو لاَ الٰہ را در گرہ بست

جس شخص نے بھی کلمۂ توحید کو گرہ میں باندھ لیا

ز بندِ مکتب و ملاّ بروں جست

وہ مکتب و ملاّ کی گرفت سے آزاد ہو گیا

بآں دین و بہ آں دانش مپرداز

اس دین و مذہب اور عقل و فہم سے کنارہ کش رہ

کہ از ما می بَرد چشم و دل و دست (ارمغانِ حجاز)

جو ہم سے آنکھیں، دل اور ہاتھ چھین لے[1]

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را

وہ مسلمان جو دینِ اسلام کی روح کو سمجھتا ہے

نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را

غیر اللہ کے سامنے اپنا ماتھا کبھی نہیں رگڑتا۔

---

[1] یعنی ہم سے مشاہدۂ کائنات، تحقیق و جستجو اور تسخیر کی صلاحیت چھین لے۔

اگر گردوں بہ کامِ او نہ گردد

اگر آسمان اس کے حسب منشا گردش نہ کرے

بکامِ خود بہ گرداند زمیں را

تو وہ قوت توحید سے زمین کو اپنے حسب منشا گھماتا ہے (ارمغان حجاز)

نہ ہر کس خود گر و ہم خود گداز است

ہر شخص خودگر اور خود گداز نہیں ہے

نہ ہر کس مستِ ناز اندر نیاز است

ہر شخص نیازمندی میں بھی مستِ ناز نہیں ہے

قبائے لا الٰہ خونیں قبائے است

قبائے لا الٰہ تو ایک ایسی خونیں قبا ہے

کہ بر بالائے نامرداں دراز است[1] (ارمغانِ حجاز)

جو نامردوں کے قد سے بہت لمبی ہے

دل بکسے نباختہ، با دو جہاں نساختہ

اپنا دل کسی کو نہ دیے ہوئے اور دونوں جہاں سے غیر زدہ ہوئے

من بحضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں (زبور عجم)

میں روز قیامت بایں طور تیرے دربار میں حاضر ہونگا

---

[1] یعنی نامرد اور پست ہمت، کم حوصلہ لوگ توحید کے تقاضوں کو بجا نہیں لا سکتے۔

(حُمّل میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا۔ (غالب)

چہ حرمہا کہ درونِ حرمے ساختہ اند
کتنے ہی حرم ہیں جو انہوں نے ایک حرم کے اندر بنا ڈالے
اہلِ توحید یک اندیش و دو و نیم اند ہمہ (جاوید نامہ)
اور تعجب ہے کہ اہلِ توحید بھی ایک مطمحِ نظر رکھتے ہوئے دو ٹکڑے ہوئے ہیں

زباں سے گر کیا توحید کا دعوٰی تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار[1] کو اپنا خدا تُو نے (بانگِ درا)

مٹا دیا مرے ساقی[2] نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو[3] (بالِ جبریل)

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جُھکا جب غیر[4] کے آگے نہ من تیرا نہ تن (بالِ جبریل)

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم (بالِ جبریل)

---

[1] بتِ پندار: غرور کا بت
[2] مراد اللہ تعالےٰ
[3] کوئی معبود نہیں مگر صرف اسی کی ذات۔
[4] یعنی غیر اللہ کے آگے۔ مخلوق کے سامنے۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی[1]
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟ (بالِ جبریل)

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ (بالِ جبریل)

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے (بالِ جبریل)

لا الٰہ الّا اللہ[2]

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الّا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الّا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الّا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں، لا الٰہ الّا اللہ

۱؎ مایوسی۔
۲؎ یہ نظم تمام و کمال "توحید" ہی کے گوناگوں معجزات کی ترجمان ہے۔

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الاّ اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الاّ اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الاّ اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا الٰہ الاّ اللہ (ضربِ کلیم)

توحید

زندہ قوّت تھی جہاں میں یہی "توحید" کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام!

روشن اس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قُل ھُوَاللہ[1] کی شمشیر سے خالی ہیں نیام!

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام! (ضربِ کلیم)

---

[1] قُل ھُوَاللہ اَحَد مراد یہ کہ ان کا نیام تیغِ توحید سے خالی ہے۔

نکتۂ توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیئے؟
وہ رمزِ شوق کی پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے؟
سرورِ جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیئے؟
جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیئے!
مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیئے! (ضربِ کلیم)

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَر[1] (ضربِ کلیم)

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول! (ضربِ کلیم)

---

[1] اللہ تعالیٰ کے سوا (مخلوق میں سے) کسی معبود کو مت پکارو۔

یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود (ضربِ کلیم)

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ[1] (ضربِ کلیم)

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر[2]
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد (ارمغانِ حجاز)

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ[3] سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے (ارمغانِ حجاز)

---

[1] خدا کا کوئی شریک نہیں۔ [2] غیر اللہ، ماسوا۔
[3] یعنی گردشِ شام و سحر سے قطع نظر جس میں کبھی روشنی ہے کبھی تاریکی، اگر نگاہِ دل سے دیکھا جائے تو دنیا کی دائمی اور ابدی روشنی صرف نورِ توحید سے ہے۔

اقبالؒ اور عشقِ رسولؐ

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ ساماںِ اوست
بحر و بر در گوشۂ داماںِ اوست

اقبالؒ

اقبال اور عشقِ رسولؐ

علامہ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ اس حقیقت پر از خود گواہ ہے۔ کہ انہیں رسولِ اکرمؐ کی ذات اقدس سے کس قدر والہانہ عشق تھا۔ وہ تو اس جوشِ عشق میں یہاں تک فرما گئے ہیں کہ:۔

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نہ تواں شدن

ترجمہ:۔ "تو کسی نہ کسی طرح خدا کا منکر تو ہو سکتا ہے۔ لیکن شانِ نبیؐ سے ہرگز منکر نہیں ہو سکتا۔"

پس چونکہ علامہ اقبال نے صحیح "شانِ نبی" کو سراسر کلام اللہ کے آئینۂ مجلّی میں مشاہدہ کیا تھا اور رسول اکرمؐ کے مقام و مرتبہ کی تعیین بھی اسی بنا پر کی تھی۔ لہٰذا "عشقِ رسول" کے موضوع پر کلامِ اقبال پیش کرنے سے پیشتر اشد ضروری ہے کہ اس ذیل میں اقبال کے منبع و مخزن یعنی قرآن مجید سے "شانِ نبیؐ" کا صحیح اندازہ کرانے کے لئے کچھ دلائل و براہین مہیا کیے جائیں۔ لہٰذا مندرجہ ذیل مباحث پر خاص توجہ مبذول فرمائیے:۔

عرفانِ شانِ رسولؐ! قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے مختلف مواقع پر مختلف

پیراؤں میں مختلف صفات کے ساتھ اپنے رسولِ برحق کی جو شان بیان فرمائی ہے اُس کا اندازہ مندرجہ ذیل آیات سے ہوگا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

(پ ۱۱ ۔ ع ۵)

(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آچکا۔ اسے تمہاری تکلیف بہت شاق گذرتی ہے اور تمہاری فلاح و بہبود کی اسے حرص لگی رہتی ہے اور وہ ایمانداروں پر بہت شفقت و رحمت برتتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝

(پ ۲۲ : ۳ ع)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو (حق پر) گواہ کر کے بھیجا۔ اور تو (مسلمانوں کو جنت کی) خوشخبری سنانے والا اور (کفار کو) دوزخ سے ڈرانے والا ہے تو لوگوں کو اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور (اس طرح دلوں کو) روشن کرنے والا چراغ ہے۔

(پ ۲۲ ۔ ۳ ع)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (پ ۲۲ : ۳ ع)

(اے پیغمبر) ہم نے تجھے ہر دو جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ

خود اللہ تعالے اور اس کے تمام فرشتے

عَلَى النَّبِيِّ ط يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (پ ۲۲ - ۴ ع)

پیغمبرؐ پر رحمتیں اور درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں۔ (لہٰذا) اے مسلمانو! تم بھی پیغمبرؐ پر درود و سلام بھیجتے رہا کرو۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝
(پ ۲۹ : ۳ ع)

(اے پیغمبرؐ) تجھے (تبلیغِ حق کے لئے) بے انتہا اجر و ثواب ملے گا اور تو بے شک اعلیٰ اخلاق کا حامل ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔
(پ ۹ : ۱۶ ع)

مسلمانو! تم نے کفار کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے انہیں قتل کیا اور (اے پیغمبرؐ) تو نے کنکریوں کی وہ مٹھی نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ج فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا

اے پیغمبرؐ! جو لوگ (حدیبیہ میں) تجھ سے بیعت کر رہے ہیں۔ وہ (گویا) خدا سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا

---

[1] ہوا یہ کہ غزوہ بدر کے دن جب کافر زور کرتے چلے آتے تھے تو رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ ایک مٹھی کنکریاں تو مجھ کو دو۔ انہوں نے دیں۔ تو آپؐ نے کافروں کی طرف پھینکیں۔ خدا کی قدرت سے وہ کنکریاں تمام کفار کی آنکھوں میں گھس گئیں اور وہ گھبرا کر بھاگے۔

يَّنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (پ۲۶ : ۹ع)	ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پھر جو کوئی (اپنا عہد و قرار) توڑے، تو اس سے وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور جو کوئی اس عہد و قرار کو پورا کرے گا جو اس نے اللہ کے ساتھ باندھا ہے۔ تو اللہ اس کو بہت بڑا اجر و ثواب دے گا۔ (پ۲۶ : ۹ع)

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (پ۲۲ : ۹ع)	(اے پیغمبرؐ) ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ (تیرے اس مقام نبوت سے) جاہل و بے خبر ہیں۔[1]

"تمام مندرجہ بالا آیات صحیح "شانِ رسول" کی از خود ترجمان ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ کی عظمت و فوقیت کے لئے یہی ایک دلیل کیا کم ہے کہ آپؐ پر وہ کتاب مقدس نازل ہوئی جو تمام سابقہ کتب سماوی کی ناسخ ہے اور اس لحاظ سے آپ وہ خاتم الانبیا ہیں جنہیں جملہ صفاتِ انبیاء کا جامع بنا دیا گیا۔"

حُسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری!

---

[1] آنحضرتؐ سے پیشتر جس قدر انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے وہ زیادہ تر اپنے اپنے ملک اور قوم کے لئے مخصوص تھے۔ لیکن رحمۃ اللعالمین کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ حضورؐ روزِ قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لئے پیغمبر و پیشوا ہیں۔

عشقِ رسولؐ کا مفہوم و مدعا

یاد رہے کہ "عشقِ رسولؐ" کا صحیح مفہوم و مدعا ہے "اتباعِ رسولؐ" اگرچہ "عشق" کا اصل مفہوم ہے کسی ہستی سے مخلصانہ اور والہانہ "انس و محبت"۔ لیکن ہم اس محبت کو "محبت" ہی کیوں کہیں جو محب کو اپنے محبوب کا مکمل طور پر مطیع و تبع نہ بنا دے؟ بالفاظِ دیگر کیا ہم اس عشقِ رسول کو صحیح و صادق عشق تسلیم کرلیں، جو "اطاعتِ رسول" سے عاری ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلامِ پاک میں ان لوگوں کو "مومن" قرار نہیں دیتا جو اپنی زندگی کے روزمرہ معاملات اور اختلافات میں رسولِ کریمؐ کو اپنا حکم اور منصف قرار نہیں دیتے۔ ہر ایسے موقعہ پر جو شخص بھی ارشاداتِ رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ سے روگردانی اختیار کرکے کسی اور شخص کو اپنا حکم قرار دیتا ہے یا رسم و رواج کی پیروی کرتا ہے وہ کلام اللہ کی رو سے صریحًا کافر ہے۔ دلیل ملاحظہ ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

(پ ۵: ع ۶)

(اے پیغمبرؐ!) قسم تیرے پروردگار کی کہ یہ لوگ سچے مومن نہیں ہوں گے۔ تاوقتیکہ اپنے (تمام) اختلافات و مناقشات کا فیصلہ تجھ سے نہ کرائیں اور پھر تیرے فیصلہ سے ان کے دلوں میں کچھ تنگی و اداسی بھی پیدا نہیں ہونی چاہیئے اور وہ (خوشی خوشی) اسے تسلیم کرلیں۔"

اس آیہ شریفہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک یہودی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقدمۂ اختلاف بیان کرتے ہوئے فیصلہ چاہا۔

آنحضرتؐ نے فیصلہ یہودی کے حق میں کیا۔ مگر مسلمان نے باہر آکر اس سے کہا "یار یہ فیصلہ بھی ٹھیک سہی لیکن اگر ہم اپنا مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے بھی بیان کریں اور ان کی رائے لیں تو اس میں کوئی مضائقہ دکھائی نہیں دیتا۔" یہودی نے کہا۔ "تمہیں فیصلہ محمد (صلعم) پر اکتفا کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اگر تمہیں اصرار ہے تو چلو حضرت عمرؓ سے بھی استصواب کئے لیتے ہیں۔" چنانچہ دونوں حضرت عمرؓ کے ہاں پہنچے اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ فاروقِ اعظمؓ نے دریافت کیا۔ "تم نے یہ مقدمہ کسی اور کے سامنے تو بیان نہیں کیا؟" بیچارہ "مسلمان" تو ہیبت وخفت سے خاموش رہا۔ مگر یہودی نے اس سوال کو اپنے حق میں مفید سمجھ کر جواب دیا۔ "جی ہاں، یہ مقدمہ ہم نے رسول اللہ کے حضور پیش کیا تھا۔ وہاں سے فیصلہ میرے حق میں ہو چکا ہے۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے فرمایا۔ "تو پھر میں بھی اپنا فیصلہ فی الفور سنائے دیتا ہوں۔" چنانچہ وہ جلدی سے گھر میں گئے، ایک برہنہ تلوار ہاتھ میں لئے واپس آئے اور چشم زدن میں "مسلمان" کا سر تن سے جدا کر کے فرمایا "جو شخص رسول اللہ کے فیصلے پر رضامند و مطمئن نہ ہو، اس کا صحیح فیصلہ یہ ہے۔" چنانچہ یہ خبر وحشت اثر دربارِ رسولؐ میں بھی پہنچی اور چند گھبرائے ہوئے صحابہ نے عرض کی کہ "اب تو عمرؓ اپنی شانِ جلالی میں مسلمانوں کو بھی ناحق قتل کرنے لگے ہیں۔ ارشادِ الٰہی تو یہ ہے کہ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ وَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا[1] ۔ اب حضورؐ فرمائیں کہ اس قتل کے متعلق کیا فیصلہ صادر

---

[1] جس نے کسی مسلمان کو عمداً قتل کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ اس کا بدلہ دوزخ ہے۔ اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

کیا جائے گا؟" یہ واقعہ اور یہ گفتگو سن کر آنحضرتؐ بھی ایک باطنی کش مکش میں مبتلا تھے اور کوئی قطعی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ یکایک آسمانی فیصلہ ان الفاظ میں نازل ہوا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥

(پ ۵ : ع ۶)

(اے پیغمبرؐ!) قسم تیرے پروردگار کی کہ یہ لوگ سچے مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے تمام) اختلافات و مناقشات کا فیصلہ تجھ سے نہ کرائیں۔ اور پھر تیرے فیصلہ سے ان کے دلوں میں کچھ تنگی و اداسی بھی پیدا نہیں ہونی چاہیے اور وہ (بخوشی) اسے تسلیم کریں۔

(پ ۵ : ع ۶)

اس بحث سے یہ چیز نہایت واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ کسی شخص کا ایمان بالرسولؐ یا "عشقِ رسول" صحیح و صادق، مستند اور معتمد نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ کہ وہ عملاً بھی "تابعِ رسول" نہ ہو چنانچہ عشقِ رسولؐ کی شرطِ اول طاعتِ رسول ہے اور اسی بنا پر مندرجہ ذیل ارشادِ رسولؐ کے حقیقی مفہوم و مقصد پر غور فرمائیے :-

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ٥

تم میں سے کوئی شخص سچا مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب و محترم نہ ہو جاؤں

مذکورہ بالا آیۂ شریفہ کی تطبیق سے اس حدیث کا مفہوم بھی یہ ہے کہ "اے مسلمانو! تم میں سے کوئی بھی سچا مومن نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ وہ میرے احکام و ارشادات

اور فیصلہ جات کے مقابلے میں اپنے ماں باپ بلکہ تمام نوعِ انسانی کے مطالبات وفیصلہ جات کو فوراً رد نہ کر دے۔"

پس عشقِ رسول کا صحیح مفہوم اور حقیقی تقاضا یہ ہے کہ وقت کے تمام رسم و رواج اور بدعات وخرافات کو سنتِ رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ پر قربان کر دیا جائے اور اس طرزِ عمل میں کسی مخالف کی مخالفت، کسی بدخواہ کی بدخواہی اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت ومذمت کو ذرہ برابر اہمیت نہ دی جائے!

رضائے الٰہی اتباعِ رسولؐ پر منحصر ہے

عشقِ رسولؐ یا اتباعِ رسولؐ کی اہمیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے بغیر نہ تو عشقِ حق کی تکمیل ممکن ہے اور نہ رضائے الٰہی کی تحصیل!

اس عنوان پر ایک ہی دلیل بس ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (پ۳: ۱۲ ع)

(اے پیغمبرؐ) کہیے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میرے نقشِ قدم پر چلو۔ پھر اللہ بھی تم سے محبت رکھے گا۔ اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیۂ شریفہ سے ثابت ہوا کہ جو شخص تابع رسول نہیں اور بدعات پر عامل ہے اسے خدا کی محبت وحمایت کی ذرہ برابر توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

عشقِ رسولؐ کے بغیر عشقِ حق ناممکن ہے

ان تمام مباحث کا حاصل ونتیجہ یہ ہوا کہ عشقِ رسولؐ (اتباعِ رسولؐ) کے بغیر عشقِ حق ناممکن ہے۔ خود خدا بھی عاشقِ رسولؐ ہے اور شب وروز اپنے محبوب

پر درود و سلام بھیجتا رہتا ہے۔ لہٰذا اگر اس کی محبت و مودت اور امداد و اعانت مطلوب ہو تو پہلے اس کے پیغمبر برحق رحمۃ اللعالمین سے عشق صادق رکھو۔ اور رسول کریمؐ سے عشق صادق کا جو مفہوم و مدعا ہے وہ سابقہ عنوان کے تحت واضح الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ الغرض اگر کوئی فرد یا جماعت یہ چاہے کہ میں عشق رسول یعنی "اتباعِ رسول" کے بغیر عشق الٰہی کا صحیح مقام حاصل کر لوں یا خدا کی رضا، امداد اور عفو و بخشش کی توقع رکھوں تو ع

ایں خیال است و محال است و جنون!

اگر انسان کے سفرِ زندگی کی حقیقی منزل یہی ہے کہ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی زادِ راہ لیے عزت و آبرو کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے دربار میں حاضر ہو اور عرصۂ محشر میں خلقِ خدا کے سامنے حساب و میزان میں پورا اتر کر بندگانِ حق کے ساتھ بہشت کے مقامِ اعلیٰ میں مقیم ہو۔ تو پھر اس منزل پر کامیابی سے پہنچنے کے لیے اسے رسولِ کریمؐ کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا۔ اور اس شاہراہِ اسوۂ رسولؐ کے مقابل شرک و بدعت اور رسم و رواج کے دیگر بے شمار راستے بالکل چھوڑ دینا ہوں گے۔

اک اسوۂ رسولؐ ہے وہ راہِ مستقیم
ہوتے ہیں جس کے سامنے سب راستے فنا
جو بھی عمل خلافِ پیمبرؐ ہے، کفر ہے
ہے طاعتِ رسولؐ میں ایمان کی بقا
راضی کرو رسولؐ کو سنت کے ضبط سے
اُس کی رضا میں پاؤ گے اللہ کی رضا

اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ

اب کہ فی نفسہٖ "عشقِ رسولؐ" کے مفہوم و مدعا کی تشریح و توضیح کی جا چکی ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بالخصوص علامہ اقبالؔ کو رسولِ اکرمؐ سے کس قدر عشق تھا۔ اس میں دلائل و شواہد کے طور پر نہ صرف کلامِ اقبالؔ پیش کیا جائے گا، بلکہ علامہ مرحوم کی زندگی کے چند ایسے صحیح و مستند حالات و واقعات بھی، جو از خود ثابت کریں گے کہ ازل و ابد کی "بزمِ عشق" سے ایسے "دانائے راز" اور عاشقانِ رسولؐ کہیں صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ترجمہ: "زندگی کعبہ اور بت خانہ میں صدیوں تک مصروفِ آہ و گریہ رہتی ہے تاکہ کہیں بزمِ عشق سے ایک دانائے راز باہر نکلتا ہے۔"

میں اس وقت جبکہ میں "عشقِ رسولؐ" کی وضاحت "اتباعِ رسولؐ" کے الفاظ میں کر رہا تھا اور صفات و اخلاقِ نبویؐ سے غافل و منحرف رہنے والوں کو "عاشقانِ رسول" نہیں بلکہ "منکرانِ رسولؐ" قرار دے رہا تھا، مجھے اس چیز کا پورا احساس و اندازہ تھا کہ بعض ایسے قارئین جو سیرتِ اقبالؔ کے اعماق تک ابھی رسائی نہیں پا سکے اور انہوں نے کلامِ اقبالؔ کو محض سطحی نظر سے دیکھا ہے، اقبالؔ کو "عشقِ رسولؐ" کی مقتضیات میں کمزور و بے عمل قرار دے رہے ہوں گے۔ یا بالفاظِ دیگر ان کے نزدیک علامہ اقبالؔ "اتباعِ رسولؐ" کے معیار پر پورے نہیں اترے۔ میں ایسے تمام حضرات کو جن میں "مفتیانِ دین"[1] اور امامانِ ملت زیادہ ہیں) مندرجہ ذیل سطور میں دلائل و براہین

---

[1] جنھوں نے علامہ مرحوم پر کفر کے فتوے بھی لگائے۔
واعظِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں — اقبالؔ

سے ان کے اس دیرینہ و متداول اعتراض کا جواب مہیا کروں گا۔

اے عاشقانِ رسولؐ! کلام اللہ میں "اسوۂ رسولؐ" پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بایں الفاظ کی گئی :۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۝ (پ ۲۱ : ۱۹ ع)	جو شخص رضائے الٰہی کی آرزو، اور روزِ قیامت (نجات) کی توقع رکھتا ہو اور کثرت سے ذکرِ حق بھی کرتا رہتا ہو، اُس کے لئے رسول اللہ کی زندگی ایک موزوں ترین اور بہترین عملی نمونہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سیرتِ رسولؐ یا اسوۂ رسولؐ کی بنیادی اور اصولی صفات و خصوصیات کیا ہیں، یا بالفاظِ دیگر وہ کون سے بڑے بڑے عقائد و اعمال ہیں جنہیں سیرتِ رسول کا حاصل و خلاصہ کہا جا سکتا ہے، جن کے تحت نبوّت نے اپنے فرائضِ حیات کما حقہٗ ادا کر دیئے اور جن کی پیروی ہر اُمتی پر واجب کی گئی وہ عقائد و اعمال حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) توحید (یعنی خدائے واحد کی پرستش) (۲) حفظِ ایمان و یقین۔ (۳) پابندیٔ ارکانِ اسلامیہ (۴) اعلائے کلمۃ الحق۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ (۵) ظلم و ستم و فسق و فجور پر بے باک تنقید (۶) سعی و عمل کی تلقین (۷) مایوسی و نا امیدی کے خلاف جہاد۔ (۸) عباد الشیطان کے خلاف غزوہ و جہاد کی تاکید (۹) اخلاص اور قناعت (۱۰) غیرت و خودداری (۱۱) صبر و استقامت (۱۲) ذکر و فکر کا اتحادِ کامل۔

ہر خوش فہمی، عقیدت مندی، رعایت اور مبالغہ و طرفداری سے بالاتر رہتے

ہوئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؔ نے اسوۂ رسولؐ کی تمام مذکورہ بالا مدات پر پورے اخلاص و عزم و استقلال سے عمل پیرا ہوتے ہوئے "عشقِ رسول" کا حق ادا کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں مختصر طور پر اس دعوے کے لئے کچھ دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ توحید علامہ اقبالؔ اپنے دور کے موحدِ اعظم تھے۔ انہوں نے نہ تو کبھی غیر اللہ کی پرستش کی، نہ مخلوقات کو اپنا حاجت روا و مشکل کشا سمجھا اور نہ وقت کے کسی بڑے سے بڑے فرعون سے خائف ہوئے۔ انہوں نے صرف خدائے واحد کو اپنے نفع و نقصان کا مختار سمجھا، اور اس ملک میں شرک و نفاق کا بدترین ماحول پا کر بھی تادمِ واپسیں اپنے خالق و مالک سے باوفا رہے۔ اگر یہ حفظِ توحید نہیں تو اور کیا ہے؟ الغرض اقبالؔ نے قرآن مجید اور سیرتِ رسولؐ میں توحید کا مفہوم و مقصد سمجھا اور خوب سمجھا اور رسول اللہ کے نقشِ قدم پر اس کی مقتضیات کو عملی جامہ پہنایا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اقبالؔ نے اسلام کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید کو اپنے کلام میں کیونکر بیان کیا۔ تو اس کی وضاحت اس کتاب کے مضمونِ اوّل میں ملاحظہ ہو۔

۲۔ حفظِ ایمان و یقین "ایمان" کی تعریف یہی تو ہے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، کتبِ سماوی، انبیاء، ملائکہ حشر و نشر، حساب و میزان، جزا و سزا، اور جنّت و دوزخ پر یقین کامل رکھے اور ان میں سے کسی ایک چیز کے متعلق بھی اس کے اعتقاد میں لغزش نہ آنے پائے۔ علامہ اقبالؔ نے اس ایمان کو اور بھی منظم اور سائنٹیفک انداز میں پیش کیا۔ اور فرمایا کہ بحیثیت "خلیفہ الٰہی" اور "نائبِ حق" جب تک تمہیں اپنے مقام و مرتبہ

اپنی فطری صفات وخصوصیات اور اپنی ممکناتِ قوتِ تسخیر پر ایمان محکم حاصل نہ ہو تو دیگر اشیاء تو درکنار خود ذاتِ حق پر بھی صحیح و کامل ایمان نہیں لا سکتے گویا تمام دیگر اصول و اجزائے ایمان کے استحکام کا انحصار ہے "عرفانِ نفس" اور "ایمان بالنفس" پر۔ اگر قصرِ ایمان کا مرکزی ستون یعنی عرفانِ نفس جسے ہم اصطلاحاً "خودی" یا "انا" بھی کہتے ہیں، کمزور و بوسیدہ ہے تو ایمان کی کل عمارت چشم زدن میں دھڑام سے زمین پر آ رہے گی۔ اسی بنا پر علامہ مرحوم نے ایک جگہ فرمایا۔

مقامِ آدمِ خاکی نہاد در یابند
مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق!

ترجمہ:۔ "اللہ تعالٰے مسافرانِ حرم (حج بیت اللہ کے لئے جانے والوں) کو اس قدر فہم و توفیق دے کہ وہ (کعبہ کے ساتھ ہی ساتھ) آدمِ خاکی کا مقام و مرتبہ بھی سمجھ لیں۔"

اور اسی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہوئے اردو شعر میں فرمایا:۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نظر سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

یعنی جب تک "آدمی" کا مقام و مرتبہ تیری نظر سے پوشیدہ ہے۔ خدا کی ذات وصفات تک تیری رسائی کسی صورت ممکن ہی نہیں!

الغرض اقبالؔ اپنے عہد کا سب سے بڑا مردِ مومن تھا۔ اس نے "ایمان" کا صحیح اور حقیقی مفہوم خود سمجھا اور پھر قوم کو بھی کماحقہ سمجھایا۔ جس رسولِ برحق کا وہ سچا عاشق ہے اس نے چودہ سو سال پیشتر ایمان و یقین کا بنیادی اصول بایں الفاظ بیان فرمایا تھا کہ:۔ "مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ۔ یعنی "وہ شخص کبھی ہلاک و برباد نہیں ہو سکتا جس نے اپنی صحیح قدر و قیمت کو پہچان لیا۔" انسان کی یہ صحیح قدر و قیمت کیا ہے؟

یہی کہ وہ دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ نائبِ حق ہے۔ لہٰذا اپنی رفعت و عظمت پہ "ایمان" لانے کے بعد اسے تمام دیگر اصولِ ایمان کو دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہوئے عملی طور پر ان کا حق ادا کرنا ہے۔ پس اس سچے عاشقِ رسولؐ نے نہ صرف ایمان کی دیگر شاخوں پہ یقینِ محکم رکھا۔ بلکہ بحیثیتِ خلیفۃ الٰہی مومن کا حقیقی مقام و مرتبہ سمجھاتے ہوئے بنیادِ ایمان کو محکم تر کر دیا۔ اور وہ مقامِ مومن یہ ہے کہ:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی!
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

۳۔ پابندیٔ ارکانِ اسلامیہ

علامہ اقبال نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اس رسمی اور وقتی انداز میں نہیں جو غفلت

و بد دلی کا مظہر ہے۔ بلکہ خضوع اور خشوع اور حضورِ قلب سے کہ اس میں الصّلوٰۃُ معراجُ المؤمنینؒ کی شان دکھائی دیتی تھی۔ "دست در تسبیح و دل در گاؤ و خر" کے طریقِ ذکر سے انہیں سخت نفرت تھی۔ اور وہ اسے "توہینِ نماز" اور "تضحیکِ عبادت" فرمایا کرتے تھے۔ ان کے آقا و مولا صلعم کا ارشاد ہے کہ وَعْبُدْ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ۔ یعنی "اے مسلمان! اپنے پروردگار کی عبادت اس شان سے کر کہ تو اس کے آستانۂ جلال پر کھڑا ہوا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تجھے مشاہدۂ ذات کا یہ مقام حاصل نہیں تو کم از کم دورانِ عبادت اتنا تو یقین رکھ کہ اللہ تعالےٰ تجھے دیکھ رہا ہے" لہٰذا کامل یکسوئی حضورِ قلب اور خوفِ حق سے ذکرِ حق کر! چنانچہ علامہ اقبالؒ اسی ارشادِ رسولؐ پر عمل پیرا تھے۔ جب ہاتھ باندھ کر نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سینہ دیگ کی طرح جوش کھاتا تھا۔ چلا چلا کر زار و قطار روتے تھے اور خوفِ حق سے اس قدر لرزاں ہوتے تھے کہ تختِ نماز بھی کانپنے لگتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سجدۂ نماز انہیں توحید اور حرّیت و آزادی کے وہ بیش بہا نکات سمجھا گیا جو عام نمازیوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں اور لاکھ نکتوں کا ایک نکتہ تو یہ ہے کہ:۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات — اقبالؒ

اور چونکہ ایسی نمازیں اور ایسے سجدے سرزمینِ ہند میں مفقود تھے، لہٰذا متاسف ہو کر فرمایا:۔

۱؎ نماز مومنوں کی روحانی معراج ہے۔

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں!

علامہ اقبالؔ روزے بھی رکھا کرتے تھے اور پورے آداب و شرائط کے ساتھ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو فرمایا: "اگرچہ روزے میں ایک بہت بڑی حکمت یہ ہے کہ اس سے کھاتے پیتے اور خوش حال لوگوں کو غریب و فاقہ کش لوگوں کی مشکلات کا اندازہ ہو اور وہ اُن سے معاشی تعاون کریں۔ لیکن روزے کا بنیادی مقصد کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو میدانِ جہاد میں پیش آنے والی دشواریوں کے لئے عادی اور مستعد کیا جائے۔ مسلمان فطرتاً غازی ہے اور اس غازی کو میدانِ جہاد کی بھوک اور پیاس کے لئے آمادہ رہنا بھی ضروری ہے۔ پس روزہ اسی ضرورت کے لئے ایک منظم مشق ہے۔

مثنوی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز — قلبِ مُسلم را حجِ اصغر نماز
لا الٰہ تو سیپی ہے اور نماز اس کا موتی — دلِ مسلم کے لئے نماز حجِ اصغر کا حکم رکھتی ہے
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است [1] — قاتلِ فحشا و بغی و منکر است
نماز مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی مانند ہے — وہ بے حیائی اور خدا کی سرکشی و حکم عدولی سے باز رکھتی ہے
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند — خیبرِ تن پروری را بشکند
روزہ بھوک اور پیاس پر حملہ آور ہوتا ہے — اور تن پروری کے خیبر کو توڑ دیتا ہے۔

---

[1] آیتہ شریفہ:۔
إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ الخ

مومناں را فطرت افروز است حج ‏ ‏ ہجرت آموز و وطن سوز است حج

حج مومنوں کی فطرت کو روشن کرنے والا ہے ‏ ‏ وہ ہجرت سکھاتا ہے اور وطن پرستی کو تباہ کرتا ہے

طاعتے سرمایۂ جمعیتے ‏ ‏ ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

وہ ایک ایسی عبادت ہے جو باعث اتحاد و جمعیت ہے ‏ ‏ اور کتابِ ملت کے پراگندہ اوراق کو یکجا جمع کر دیتی ہے

حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ ‏ ‏ ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

زکوٰۃ مال کی محبت کو فنا کر دیتی ہے۔ ‏ ‏ اور مسلمانوں میں جذبۂ مساوات پیدا کرتی ہے

دل ز حتیٰ تنفقوا محکم کند ‏ ‏ زر فزاید، الفتِ زر کم کند

وہ دل کو انفاق فی سبیل اللہ سے توانا کرتی ہے ‏ ‏ دولت کو بڑھاتی ہے مگر دولت کی محبت کم کرتی ہے

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست ‏ ‏ پختہ محکم اگر اسلامِ تست

یہ سب تیرے استحکام کے اسباب ہیں ‏ ‏ اگر تیرا اسلام مضبوط ہے تو تو بھی پختہ ہے۔

اہلِ قوت شو ز وردِ یا قوی ‏ ‏ تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

تو "یا قوی" کے ورد سے مضبوط و توانا ہو جا۔ ‏ ‏ تاکہ خاک کے اونٹ پر سوار ہو سکے[1]

علامہ اقبال انتہائی آرزو کے باوجود حج نہیں کر سکے۔ میں ایک مرتبہ حسب معمول زیارت و استفادہ کے لیے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں حاضر ہوا سردیوں کے دن تھے اور آپ برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے طبیعت پر ایک کیف و وجد کا عالم طاری تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی اور آسمان کی طرف بار بار انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں مندرجہ ذیل شعر پڑھتے تھے۔

---

[1] یعنی جسم خاکی کی حرکات عمل کو مسخر کر سکے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

ترجمہ: "آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی نازک تر ہے۔ یہاں تو جنیدؒ و بایزیدؒ جیسی بزرگ ہستیاں بھی سانس گم کئے ہوئے (ادب و احترام) سے حاضر ہوتی ہیں۔"

تقریباً دس پندرہ منٹ یہی عالم رہا اور پھر کچھ دیر اسی لذتِ عشق میں محو رہ کر بندۂ عاصی سے مخاطب ہوئے۔ میں نے دورانِ گفتگو عرض کی: "آپ ادب گاہِ مدینہ کی زیارت کے لئے مدت سے بے چین ہیں۔ اس آرزو کو عملی جامہ کب پہنائیں گے" ایک آہِ سرد بھر کر جواباً فرمایا: "اللہ اور اس کے رسولؐ نے حج کے لئے بھی کچھ شرائط عائد کر رکھی ہیں اور ان میں سے اہم ترین شرائط یہ ہیں کہ انسان کسی کا مقروض نہ ہو، والدین اور بیوی بچوں کے لئے کافی خرچ چھوڑ جائے اور حج کے لئے اس قدر زادِ راہ لے کر جائے کہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ میرے پاس نہ اتنی گنجائش ہے اور نہ میں یہ تمنا پوری کر سکتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فراقِ رسولؐ میں مرغِ بسمل کی مانند تڑپ رہا ہوں اور اسی سوز و درد کا شب و روز لطف لیتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے علامہ مرحوم کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو ٹپکنے لگے اور اپنی یہ رباعی دو تین مرتبہ پڑھی:۔

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن

اے ساربانِ حجاز! اس راہی کے غم میں زیادہ خوشی کا اضافہ کر

فغانش را جنوں آمیز تر کن

اور اس کی آہ و فغاں میں کچھ اور جنونِ عشق شامل کر

بگیر اے سارباں راہِ درازے

اے ساربان! منزلِ محبوب کی جانب کوئی راہ دراز اختیار کر

مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

اور اس طرح میرے سوزِ جدائی کو اور بھی تیز کر

چنانچہ آگے چل کر آپ کو علامہ کے اکثر اشعار سے اندازہ ہوگا کہ وہ کس طرح ساربانِ حجاز، ناقہ اور رفقائے کارواں اور صاحبِ گنبدِ خضرا کو بار بار مخاطب کرکے اپنے اضطرابِ ہجر کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ علامہ اقبال اپنی معذوریوں کے باعث حج نہ کرسکے۔ لیکن بارگاہِ رسول میں التجا ضرور کرتے رہے کہ انہیں حاضری کا شرف بخشا جائے۔

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است — چیزکے دارم کہ نامِ او دل است

اگرچہ میری عمر کی کھیتی لاحاصل ہے — لیکن میں وہ چیز رکھتا ہوں جس کا نام دل ہے

دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں — کز سمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

میں اس دل کو دنیا کی آنکھ سے مخفی رکھتا ہوں — کیونکہ وہ تیرے گھوڑے کے سم کا نشان رکھتا ہے

بندۂ را کو نخواہد ساز و برگ — زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ

اس غلام کے لئے جو دنیوی ساز و سامان نہ چاہتا ہو — اپنے آقا سے دور رہ کر زندگی بدتر از موت ہے۔

اے کہ داری کُرد را سوزِ عرب — بندۂ خود را حضورِ خود طلب

اے کہ تونے کُرد کو بھی سوزِ عرب عطا کیا — اپنے غلام کو اپنے دربار میں طلب فرما

چنانچہ جب کوئی حاجی دیارِ حبیب سے آتا تو علامہ مرحوم اس سے بغل گیر ہوکر بچوں کی طرح زار و قطار رویا کرتے اور کیا عجب کہ اسی درد و کرب میں گنبدِ خضرا کی زیارت بھی کر لیتے ہوں!

ارکانِ اسلامیہ میں سے باقی رہی زکوٰۃ، تو علامہ اقبال اپنی زندگی کے اکثر ادوار میں "صاحبِ نصاب" ہی نہیں تھے۔ وہ فطرتاً اور طبعاً ہر چیز کی حرص و ذخیرہ اندوزی

کے سخت دشمن تھے۔ اور اس سرمایہ دارانہ طرزِ عمل کو اسلامی اصولِ حیات کے سخت منافی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہوسِ سیم وزر اور جاگیرداری اسوۂ رسولؐ، مسلکِ خلفائے راشدین اور سیرِ صحابہ کے بالکل برعکس تھی۔ اس مفہوم کی تفصیل ملاحظہ ہو اس کتاب کے مضمون "اقبال اور سرمایہ و محنت" میں!

۴۔ اعلائے کلمتہ الحق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر

یاد رکھیئے کہ حق گوئی، مقامِ نبوت کا سب سے اہم اور مہتم بالشان فرض ہے پیغمبر کا منصب اعلیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی تمام باطل و خود ساختہ چیزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہے۔ صحیح و حق باتوں کا دلیرانہ اعلان کرتا ہے نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے منع کرتا ہے۔ باطل کی تردید و بیخ کنی اور حق کا اعلان و استحکام ایک ایسا فرض ہے جو آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس ہی پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ ہر عاشقِ رسولؐ اور ہر امتی پر بھی یہ فرض حکماً عاید کیا گیا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کے لئے اس فرض کی عمومیت مندرجہ ذیل آیات سے ثابت ہے۔

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔ (پ ۳۰ : ۲۸ ع)	قسم ہے مجھے زمانے کی کہ تمام لوگ سراسر نقصان میں ہیں۔ مگر فائدہ میں صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، نیک کام کیئے اور ایک دوسرے کو راہِ حق پر چلنے کی تلقین کرتے رہے اور (بصورتِ تکلیف و ابتلا) صبر و تحمل کی بھی تاکید کی۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	مسلمانو! تم تمام امتوں میں سے بہترین

لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔

(پ۴: ع ۳)

امت محمدیہ ہے جسے تمام نوعِ انسانی کی رہبری کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان کامل رکھتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(پ۴: ع ۲)

اور تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ضرور ہونے چاہئیں جو لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دیں۔ اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں اور یہی لوگ (آخرت میں) نجات پانے والے ہیں۔

قرآن مجید میں تمام ایسے مبلغینِ حق کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ وقت کے کسی فرعون سے خائف و مرعوب ہوئے بغیر پوری دلیری و بیباکی سے اللہ کی بتائی ہوئی مستند اور حق باتیں بیان کرتے ہیں اور اس ضمن میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت مخالفت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ رسول کے مطابق کسی "سلطانِ جابر" کے سامنے کلمۂ حق بیان کرنا سو شہیدوں کا ثواب رکھتا ہے۔ چنانچہ اس صدی کے سچے عاشقِ رسول یعنی علّامہ اقبالؒ کی بھی ایک نہایت واضح اور عدیم النظیر صفت یہ ہے کہ انہوں نے مخلوق کی ہیبت و سطوت اور شاہ و وزیر کے جاہ وجلال سے ذرہ برابر مرعوب ہوئے بغیر اسوۂ رسولؐ کے مطابق پوری جرأت و بے باکی سے حق کا اعلان کیا ہے، اور اپنے مسلکِ شبیری میں "روباہی" کو قطعاً دخل نہیں دیا ہے

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

اپنے اصولِ حق گوئی میں علامہ مرحوم نہ تو کسی "مصلحتِ وقت" کے پابند ہوئے، نہ کسی ذاتی مفاد و ضرورت کے لئے حق کے بیان کرنے میں "نرمی" یا رعایت برتی اور نہ کبھی اپنے پرائے کی تنقید سے خائف ہوئے۔ جہاں تک اعلانِ حق کا تعلق ہے۔ علامہ مرحوم قوم کے نیم خواندہ اور غیر ذمہ دار ملاؤں[1] اور واعظوں سے بہت نالاں رہتے تھے کہ "یہ لوگ علمائے یہود کی طرح "ثمنِ قلیل"[2] (تھوڑے سے دنیوی مفاد) کے لئے یا تو بالکل "کتمانِ حق" کر رہے ہیں، یا پھر قوم پر زیادہ مہربان ہوں تو "التباسِ حق و باطل"[3] کرتے ہیں، خالص حق بیان کرنے والے

---

[1] چنانچہ بطورِ مثال:-

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحبِ تصدیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

[2] وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ○ (پ - ۵ ع)

ترجمہ۔ میری آیات تھوڑے تھوڑے داموں کے عوض مت بیچو (یعنی لوگوں سے مال بٹورنے کی خاطر صحیح مفہومِ آیات کو نہ چھپاؤ) اور مجھ سے ڈرتے رہو۔

[3] وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (پ - ۵ ع)

ترجمہ:- اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو، اور جان بوجھ کر حق بات کو مت چھپاؤ۔

علما ر شاذ و نادر لیں گے۔"

بہرکیف عشقِ رسول کا ایک اہم تقاضا یہ بھی تھا کہ علامہ ہر وقت اور ہر حالت میں "حق" ہی بیان کرتے۔ آج ان کا تمام کلام اس حقیقتِ بینہ پر از خود شاہد ہے کہ انہوں نے اپنے آقا و مولا (صلعم) کی طرح حق بیان کرتے ہیں یہ کبھی نہ دیکھا کہ ان کے الفاظ سے کون خوش ہوتا ہے، اور کون ناخوش :-

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند!
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند!

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا
رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

۵۔ ظلم و ستم اور فسق و فجور پر بے باک تنقید

ایک اسوۂ رسول یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے وقت کے تمام ظالم و جابر اور فاسق و فاجر حکمرانوں اور بادشاہوں پر بیباک تنقید کی، عادلانہ محاسبہ کیا اور سیاسی قوت عطا ہونے پر انہیں سزائیں بھی دیں چنانچہ حضورؐ نے ظلم

وآمریت پر بذریعہ تبلیغ اتمامِ حجت کر لینے کے بعد اپنا یہ ناطق فیصلہ بھی گوشِ عالم تک پہنچادیا تھا کہ "قیصر اور کسریٰ عنقریب ہلاک و برباد ہو جائیں گے اور ان کے بعد کوئی اور قیصر و کسریٰ ان کے تخت و تاج سنبھالنے والا پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ یہی کچھ ظہور میں آیا۔"

علامہ اقبال نے بھی ہوش سنبھالتے ہی جب اپنے ماحول کو بغور دیکھا اور وقت کے فرعونوں کی سیاسی چال ڈھال کا گہرا مطالعہ کیا تو ان کے ظلم و فسق پر ایسی صحیح اور بیباک تنقید کی کہ مشرق کے تمام ذخائرِ شعر و ادب میں اس کا جواب ہی نہیں ملتا چنانچہ افراد و اقوام کے عام معائب پر تنقید کرنے کے علاوہ صرف سیاسیاتِ مغرب اور تہذیبِ فرنگ ہی کے متعلق ان کی آرار ملاحظہ کیجئے تو ان میں بھی حق گوئی اور تنقیدِ منصفانہ کی بے نظیر مثالیں دستیاب ہوں گی چنانچہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

متاعِ معنیِ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
کیا تو جمہوریت کے معنیِ بیگانہ کو بدطینت و بدنہاد لوگوں میں تلاش کر رہا ہے

ز موراں شوخیِ طبعِ سلیمانے نمی آید!
حقیقت یہ ہے کہ چیونٹیوں سے حضرت سلیمانؑ کی شوخیِ طبع ممکن نہیں

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
یورپ کے طرزِ جمہوریت سے بھاگ اور کسی پختہ کار شخص کا غلام ہو

کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید (پیامِ مشرق)
کیونکہ دو سو گدھوں کے دماغ سے بھی ایک انسان کی فکر ممکن نہیں

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ

روحانیت کا درس کسی کلیم سے لے کیونکہ دانائے فرنگ نے اگرچہ

سینۂ بحر شگافید و بہ سینا نہ رسید

سمندر کا سینہ چاک کر دیا مگر کوہ طور کی تجلی کو نہ پا سکا۔ (زبور عجم)

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(ضربِ کلیم)

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (بانگ درا)

وہ حکمت ناز ہے جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(بانگِ درا)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری! (بانگِ درا)

۶۔ سعی و عمل کی تلقین قرآن و حدیث جہد و عمل کے انفرادی اور اجتماعی محاسن و مفادات سے معمور ہیں۔ قرآن مجید نے بطورِ اصول یہ اعلان کیا کہ: وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰیۙ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ۙ یعنی "انسان صرف اپنی سعی و محنت ہی کا ثمرہ پائے گا۔ اور (آخرت میں بھی) اس کی جد و جہد (کی جزا و سزا) اسے دکھائی جائے گی" (پ۲۷ ، ع ۷)

اور پھر رسولِ اکرم تو تھے ہی سراپا سعی و عمل ، اور اس قوتِ عمل اور سخت کوشی کی برکت ہی سے حضور نے اپنے تمام فرائضِ نبوت کما حقہٗ ادا کئے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؔ نے بھی اپنی تعلیمات کی بنیاد جہد و عمل اور فلسفۂ سخت کوشی پر رکھی ہے اور کلامِ اقبالؔ اول تا آخر ایسی بے شمار مثالوں سے معمور ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف بطورِ نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ
میرے دشتِ جنوں میں جبریل بھی ایک کمزور و لاغر شکار ہے — لہٰذا اے ہمتِ مردانہ! اللہ تعالیٰ کو اپنی کمندِ عشق میں گرفتار کر

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی — چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است
تو اپنے آپ میں پہاڑوں کی مانند مضبوط اور ٹھوس بن کر جی — اور تنکوں کی طرح نہ جی کیونکہ ہوا تیز ہے اور شعلہ بیباک

زنبید و حبید نہنگاں حکایتے آور　　　مگو کہ زورقِ ما آشنائے دریا نیست

جا، اور ہمیں مگر مچھوں کے شکار کی کہانیاں آکر سنا　　　یہ نہ کہہ کہ میری تو کشتی ہی دریا سے شناسا نہیں

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی　　　کجا عیشِ برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

اگر تو اپنے باپ کی میراث سے کوئی ہیرا چاہتا ہے تو شرمندہ ہو　　　(بھلا اس میں) وہ عیش کہاں جو کان کو کھود کر ہیرا نکالنے میں ہے

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　　جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بہ زورِ بازو ضربتِ کاری کا ہے مقام　　　میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ　　　اندھیری شب میں ہو چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

خصوصاً اس عنوان کے تحت دوبارہ یہ سوال پیدا کیا جائے گا کہ اقبال نے سعی و عمل کے متعلق کہا تو بہت کچھ، لیکن کیا اس کی اپنی زندگی بھی "عمل" کا مرقع ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس مضمون کے تمام مباحث اقبال کو صاحبِ عمل مردِ مجاہد، ایثار پیشہ مومنِ صادق، غیور و اولوالعزم مسلمان، مخلص خادمِ ملت، فقید المثال مبلغِ حق و صداقت اور عظیم ترین معلمِ حریت و رجائیت تو ثابت کیے دیتے ہیں۔ کیا کسی اور شخص کے "نامۂ اعمال" میں تعمیلِ حق اور اتباعِ رسول ؐ کے اس قدر ممتاز و شاندار اور روشن و تابندہ کارنامے ملیں گے؟ ——— وہ تو خود بھی فرما گئے ہیں:۔

مرے نفس سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی!

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

جو کوکنار[1] کے خوگر تھے ان غریبوں کو
مری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند!

۷۔ مایوسی و ناامیدی کے خلاف جہاد میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ علامہ اقبال ایک فقید المثال معلّمِ رجائیت تھے انہوں نے اکثر جگہ حیاتِ انسانی کے لئے امید و آرزو کے بیشمار فوائد گنوائے ہیں اور یاس و ناامیدی (قنوطیت) کو امّ الخبائث اور قاطعِ حیات قرار دیا ہے حکیمِ حق یہ ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ[2] ۔ لہٰذا وہ پوری زندگی میں خود بھی اس حکم پر عمل پیرا رہے اور یاس و ناامیدی کو مشکلات و موانع کے باوجود قریب تک نہیں پھٹکنے دیا اور پھر قوم کو بھی ہمیشہ اسی چیز کی تعلیم دی۔ یہ بھی ایک اہم

---

[1] کوکنار ، پوست۔ [2] مسلمانو! اللہ کی رحمت سے ہرگز مایوس مت ہو۔

اسوۂ رسول ہے اور حق تو یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس کا حق ادا کر دیا۔ فرماتے ہیں

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار

تو مسلماں ہے اور اس لئے اپنے سینے کو کسی صحتمند آرزو سے آباد رکھ

ہر زماں پیش نظر لایخلف المیعاد دار

اور ہر وقت یہ آیت پیش نظر رکھ کہ "اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے

امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار

فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرار حیات

کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکار حیات

۸۔ عباد الشیطان کے خلاف غزوہ و جہاد کی تاکید

قرآن مجید میں بے شمار جگہ غزوہ جہاد کی تاکید آئی ہے اور یہی چیز ہماری اجتماعی و ملی زندگی کی روح رواں ہے۔ رسول کریم کو تو حکماً فرمایا گیا کہ "یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ" یعنی "اے نبی الرحمت! مسلمانوں کو غزوہ جہاد کی ترغیب دلایئے"۔ اسی بنا پر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ "ایمان کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ مومن سیاسی قوت اور ساز و سامان کے ہوتے

سرِ میدان کفار سے جہاد بالسیف کرے اور اگر یہ چیز میسر نہ ہو تو پھر کم از کم اتنا تو ضرور کرے کہ اپنی زبان سے لوگوں کو جہاد کی تاکید و تلقین کرتا رہے اور اس کے روحانی و اخلاقی فوائد ان کے ذہن نشین کرے۔"

چنانچہ علامہ اقبال نے جہاد کے موضوع پر احکامِ قرآنی اور ارشاداتِ رسول پر بحدِ توفیق (کیونکہ ان کے پاس جہاد بالسیف کا ساز و سامان تو تھا نہیں) اس شان سے عمل کیا کہ ہر لفظ سے مسلمان کے سرد و منجمد خون کو ایک مرتبہ پھر کھولا دیا اور جو لوگ عجم کے راہبانہ طریقۂ زندگی کو اپنا کر گوشہ گیر ہو رہے تھے۔ وہ اقدامِ جہاد کے لئے بیتاب دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ زیادہ تو نہیں دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت — شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
سکندر نے خضر سے کیا ہی خوب نکتہ بیان کیا کہ — تو خشکی اور تری کے سوز و سازِ حیات میں شریک ہو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو
تو زندگی کی جنگ کو میدان کے کنارے کھڑا دیکھ رہا ہے — آ اور اس جنگ میں مر کر زندۂ جاوید ہو جا۔

لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز — سپر از دست میندار کہ جنگ است ہنوز
چمنِ دہر کا گلِ لالہ ابھی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے — اپنے ہاتھ سے ڈھال نہ رکھ کیونکہ ابھی زندگی کی جنگ جاری ہے
اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
اے کہ تو ساحل پر آرام سے بیٹھا ہوا ہے اب اٹھ کھڑا ہو — کیونکہ ابھی تو تجھے گرداب اور مگرمچھ سے مقابلہ کرنا ہے

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم — کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را
میں اس علم و عقل کو گھاس کے ایک تنکے کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہیں — جو ایک مردِ مجاہد کو اس کی تیغ و سپر سے بیگانہ و محروم کر دے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ!
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام　　میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل، نہ جل ترنگ!

۹- اخلاص اور قناعت: علامہ اقبال کی قناعت حاصل و نتیجہ تھی ان کے بے مثل "اخلاص" کا۔ اگر وہ بھی دیگر زاہدانِ سالوس اور بے غیرت و ابن الوقت لوگوں کی طرح محض زمانہ ساز، ریاکار اور ہوس پرست ہوتے، تو بے تکلف سونے چاندی کے ذخائر جمع کرتے اور اپنے وقت کے بہت بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار ہوتے، لیکن انہیں اپنے آقائے مدینہ ہی کا مسلکِ فقر محبوب تھا۔ وہ "اَلْفَقْرُ فَخْرِی" کی پیروی پر مفتخر تھے اور اس لئے اعلان فرمایا۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ "نانِ شعیر" ہی پر بسر کیا ہے۔ اگرچہ ان کے معاشی حالات بعض اوقات ایک صبر آزما "ابتلا" کی صورت اختیار کر گئے لیکن انہوں نے اپنے مخصوص معیارِ غیرت و خودداری کے خلاف نہ تو کوئی بات کہی اور نہ کوئی قدم اٹھایا۔ وہ ایک فارغ التحصیل بیرسٹر تھے مشرقی اور مغربی فلسفہ و علوم کے ماہر تھے۔ اپنے عہد کے عظیم ترین حکیم و مدبر تھے۔ اور

چاہتے تو تھوڑے عرصے میں چیف جج بھی ہو سکتے تھے۔ اور اپنے زرِ آمدنی کو محفوظ کر کے جاگیریں۔ جائدادیں اور وہ سب عظیم الشان ساز و سامانِ دنیوی مہیا کر سکتے تھے جو دیگر لوگ مہیا کیا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حالت تو یہ تھی کہ خود موکلوں کی برضاو رغبت پیش کردہ رقوم کا بیشتر حصہ اس بنا پر واپس کر دیتے تھے کہ "یہ رقم میرے حق سے زائد ہے۔ لہذا میں اسے قبول نہیں کر سکتا"۔

بہرکیف علامہ اقبال کا اخلاص اور قناعت دیگر مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ ہے۔ ایسی عظیم المرتبت ہستی نے بگڑے ہوئے زمانے، غلط ماحول اور جاہل و بے بصیرت قوم کے ہاتھوں گوناگوں معاشی اور دنیوی تکلیفیں اٹھائیں اور پھر کیا تو زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ:-

ترى بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں، نہ شکایتِ زمانہ!

بایں ہمہ چونکہ ان کی نظر اسوۂ رسولؐ، طریقِ صحابہؓ اور مسلکِ اولیاء اللہ پر تھی، لہذا دنیا کی کوئی تکلیف یا حالات کی ناسا عدت، ان کی غیرت و قناعت اور اصولِ حق گوئی میں خلل انداز نہیں ہوئی، ہزار حیلہ سازیوں اور شرارتوں کے باوجود کوئی شخص ان کے "ذوقِ شکر خند" کو ان سے چھین نہیں سکا:-

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند!
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند!

۱۰۔غیرت وخودداری

علامہ اقبال کی شانِ غیرت وخودداری کے متعلق سابقہ صفحات میں بہت کچھ کہتا چلا آیا ہوں۔لہٰذا اس موضوع پر اس عاشقِ رسولؐ نے تمام عمر جس اصول پر عمل کیا۔اور جس کی ہر مسلمان کو تلقین کی،اس کا تذکرہ مندرجہ ذیل اشعار ہیں حسبِ ضرورت بالکل کافی سمجھتا ہوں:۔

تُو اگر خوددار ہے منّت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر!

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ ناداں حاجتے پیشِ سلیمانے مبر!

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

تھا[1] یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات!
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حُسنِ تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات!

---

[1] یہ اشعار توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے ایک ہزار روپے کا چیک بطور تواضع، موصول ہونے پر تحریر کئے گئے۔

میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ

۱۱۔ صبر و استقامت

حضورِ حق سے رسولِ اکرم کو بار بار اسی چیز کی تاکید ہوئی کہ:۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (اے پیغمبر! کفار کی مخالفت و ایذا رسانی پر) اسی شان سے صبر کر، جس شان سے میرے صاحبِ عزم و ہمت رسولوں نے صبر کیا تھا۔ (پ۲۶ : ع۴)

یہ اس لئے کہ تبلیغِ حق کا فرض، صبر و ضبط کے بغیر ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ تخلیقِ عالم کے روزِ اول ہی سے تمام عباد الشیطان اور فرزندانِ باطل پیروانِ حق اور مبلغینِ صدق کے دشمن و مخالف رہے ہیں اور اگرچہ ان کی ساحرانہ چالیں بندگانِ حق کے معجزاتِ عمل کے سامنے نتیجہ کار ناکام ثابت ہوئیں، تاہم سامری کا فہمِ ملعون ضربِ کلیمی کے مقابل مصروفِ کار ضرور رہا۔ ایسی حالت میں اگر ایک مبلغِ حق صبر و ضبط سے کام نہ لے تو "قوتِ عزم" کیونکر برقرار رہے گی؟ راہِ حق میں "استقامت" کا اصول کیونکر نبھایا جائے گا؟ اور پھر "حزب اللہ" کو غلبہ و اقتدار کیونکر نصیب ہوگا؟ ـــ اس لئے میں تو دو لفظوں میں یہ بات یوں ختم کرتا ہوں کہ رسول اللہ اور صحابہ کرام کی تمام تر کامیابی و فتح مندی کا بنیادی سبب ہی "صبر" تھا۔ چنانچہ سورۂ والعصر میں وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ کا اجتماع اور تلقینِ حق و تاکیدِ صبر کا رابطہ ہی اس مفہوم پر از خود شاہد ہے اور "صبر" کا سب سے بڑا مفاد یہ ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔" خدا

ہمیشہ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتا ہے۔" اور جس کا رفیق و معاون خدائے ذوالجلال ہو، اسے شکست کون دے؟

چنانچہ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؔ نے "صبر" جیسے اسوۂ رسولؐ کو بھی خوب نبھایا اور اس کی برکت سے وہ استقامت حاصل کی کہ ان کے "ید بیضا" سے ہر فرعونِ وقت مغلوب و منفعل ہو گیا:-

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

وہ اپنے زمانے کی دہریہ، منکرِ حق، مکار، گمراہ و فاسق، غلامِ ہوا و ہوس، بیگانۂ روحانیت اور ظالم و غاصب "دانشِ حاضر" کے عذابِ الیم کو برداشت کرتے ہوئے بھی ابراہیم علیہ السلام کی مانند صابر و ثابت قدم رہے:-

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

اور لطف یہ ہے کہ جن خبیث و ملعون عناصر نے ان کے راستے میں روڑے اٹکانے چاہے، وہی ان کی برق رفتاری اور استحکامِ عزم کا باعث ہوئے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

الغرض عہدِ اقبال کی رزم گاہِ حق و باطل میں دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں بہادر مسلح ہو کر میدانِ جہاد میں آئے اور بہت جلد کسی "گوشۂ عافیت" میں جا چھپے۔ لیکن صرف اقبال ہی وہ سچا عاشقِ رسول تھا جو ایک کوہِ صبر و استقلال بن کر اہلِ باطل کے خلاف ڈٹا رہا۔ اور کیوں نہ ہو، اس نے تو ڈنکے پر چوٹ پڑنے سے پیشتر ہی اعلان

کر دیا تھا کہ:۔

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست

کسے کہ کشتہ نہ شد، از قبیلۂ ما نیست!

ترجمہ:۔"ہر شخص جو میدانِ جہاد کے شور و ہنگامہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ ہماری صف سے پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ جو شخص یہاں شہید نہیں ہوا۔ وہ ہمارے قبیلہ و خاندان ہیں سے نہیں ہے"

۱۲۔ ذکر و فکر کا اتحاد

اور اب عشقِ رسول کی آخری شق یعنی ذکر و فکر کے اتحاد پر نظر کرتے ہوئے تسلیم کرنا ہوگا۔ کہ علامہ اقبال نے اپنی فکر کو کسی قدم پر بھی "ذکر" سے بیگانہ و منحرف نہیں ہونے دیا۔ بالفاظِ دیگر ان کا فہم و شعور کہیں بھی وحیِ الٰہی سے باغی نہیں ہوا۔ وہ فلسفۂ قدیم و جدید کے بہت بڑے ماہر تھے۔ لیکن انہوں نے ہر ایسے فلسفہ و فلسفی کو نوعِ انسانی کے لئے مسموم و مہلک قرار دیا جو وحیِ الٰہی اور اصولِ فطرت سے ہم آہنگ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عقلِ کامل" بھی صرف اسی عقل کو تسلیم کرتے ہیں جو" ادب خوردۂ دل" ہو اور انسان کی" روحانی" ممکناتِ اصلاح و تسخیر سے انکار نہ کرے۔

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

ترجمہ:۔"جو نقشِ علم و تہذیب تو نے باندھا ہے۔ وہ سراسر اوہامِ باطلہ پر مبنی ہے۔ وہ عقل مہیا کر جس کی تہذیب و تادیب بذریعہ دل ہوئی ہو"

اس سے ظاہر ہے کہ مومن کی عقل ہمیشہ" ادب خوردۂ دل" ہوگی اور ایسی عقل کی تجلیات ہی ہیں وہ ہر کفر و ضلالت، شرک و بدعت اور پابندیِ رسم و رواج

سے محفوظ رہے گا اور یہ وہ سربلند اور حق اندیش عقل ہے جو بیک وقت "نورِ فرشتہ" اور "سوزِ دلِ آدم" کی حامل ہے۔

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست!

ترجمہ: "مبارک ہے وہ عقل جو ہر دو عالم کی وسعتوں پر چھائی ہوئی ہو اور فرشتوں کا نور آدم کا سوزِ دل اس کی آغوش میں ہو۔"

بہرحال کمالِ عشقِ رسول دیکھیئے کہ علامہ اقبال نے "عقلِ یزدانی" نہیں بلکہ "عقلِ شیطانی" کے ماحول میں جنم لے کر، پرورش پا کر، اور تعلیمِ جدید حاصل کر کے اپنی کو "عشق" سے اور اپنی فکر کو "ذکر" سے منحرف نہیں ہونے دیا۔

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر	فکر را کامل ندیدم جز بذکر
قرآن کا بتایا ہوا فقر ذکر و فکرِ حق کا مرکب ہے	اور میں نے فکر کو ذکر کے بغیر کبھی مکمل نہ پایا
ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب	کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب
ذکر کیا ہے؟ ذوق و شوق کی اصلاح و تادیب کرنا	یہ تو روح کا کام ہے۔ حلق اور ہونٹوں کا کام نہیں

پس "عشقِ رسول" کے یہ تمام تقاضے کما حقہٗ بجا لانے اور اسوۂ رسول کے ہر اہم نقش پر پورے اخلاص سے عمل پیرا ہونے کے باوجود علامہ اقبال بحیثیت بشر معصوم ہونے کے مدعی نہیں، بلکہ خود کو ایک غافل و گنہ گار امتی قرار دیتے ہوئے حضورِ رسالت میں ملتمس ہیں کہ سرکارِ دو عالم! ہم سے نہ تو آپ کی خدمت و اطاعت حق ادا ہو سکا ہے، اور نہ ہم جیسے عاصی آپ جیسی ہستیِ مقدس کے شایانِ شان تھے۔

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم
چو گبراں در حضورِ او سرودیم

نالم از کسے، می نالم از خویش
کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم!

ترجمہ: " ہم نے اپنی پیشانی کو غیر اللہ کے سامنے رگڑا۔ اور آتش پرستوں کی طرح ان جھوٹے خداؤں کے سامنے نغمہ سرا رہے۔ میں کسی غیر کے ہاتھوں تو آہ و فریاد نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے اعمال پر روتا ہوں کہ یا رسول اللہ! ہم جیسے لوگ تو آپ کی شان کے لائق ہی نہیں تھے۔"

اور اسی ندامت کی وجہ سے حضورِ حق ملتجی ہیں کہ:۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر!

ترجمہ: " جب یہ بوڑھی دنیا اپنی انتہا کو پہنچ جائے (قیامت آجائے) اور ہر پوشیدہ تقدیر (نامۂ اعمال) سب پر ظاہر ہو جائے، تو پروردگار مجھے آقا کے سامنے شرمندہ و بدنام نہ کر، بلکہ میرا حساب اس کی آنکھ سے چھپا کرے۔"

اب کلامِ اقبال میں عمومی حیثیت سے عشقِ رسول ﷺ کی وہ ایمان افروز تجلیات دیکھئے۔ جن کی روشنی میں اتباعِ اسوۂ رسول ﷺ کے محامد و محاسن بھی از خود جلوہ نما ہیں:۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است	آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
رسولِ اکرم کا گھر مسلمانوں کے دل میں ہے	اور ہماری عزت و آبرو نامِ مصطفےٰ سے ہے
طور موجے از غبارِ خانہ اش	کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
طور اس کے غبارِ خانہ کی ایک موج ہے	اور اس کا جھونپڑا کعبہ کیلئے بھی بیت الحرم ہے

کمتر از آنے ز اوقاتش ابد — کاسب افزائش از ذاتش ابد
ابد اس کے اوقات میں ایک لمحے سے بھی کمتر ہے — اور دوام اس کی ذات سے افزائش حاصل کرتا ہے

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
بوریا اس کے خوابِ راحت کا احسان مند ہے — اور کسریٰ کا تاج اس کی امت کے زیرِ پا ہے

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
اس نے غارِ حرا کے شبستان میں خلوت اختیار کی — اور بطور نتیجہ قوم، آئین اور حکومت پیدا کیے

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
بہت سی راتوں میں اس کی آنکھ نیند سے محروم رہی — حتیٰ کہ قوم تختِ خسروی پر جا کے سوئی

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز
بوقتِ جنگ اس کی تلوار لوہے کو پگھلا دیتی تھی — اور نماز میں اس کی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں

در دعائے نصرت آمیں تیغِ او — قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او
امدادِ حق کی دعا میں اس کی تلوار آمین تھی ۔ — اور وہ تلوار بادشاہوں کی نسل کو منقطع کرنے والی

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
دنیا میں اس نے زندگی کا نیا دستور شروع کیا — اور سابقہ قوموں کی مسندِ اقتدار کو لپیٹ دیا

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد
اس نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا — اور مادرِ گیتی نے اس جیسا ایک فرزند بھی نہ جنا

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
اس کی نگاہ میں بلند و پست یکساں تھے — وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھا

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر — دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
ایک جنگ میں اس عالی جناب کے سامنے — حاتم طائی کی بیٹی قید ہو کر آئی ۔

پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود — گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
اس کے پاؤں میں زنجیر تھی اور وہ خود بے پردہ — اس کی گردن شرم و حیا سے جھک رہی تھی

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید — چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
جب اس لڑکی کو آنحضرتؐ نے بے پردہ دیکھا — اپنی چادر مبارک اس کے چہرے پر ڈال دی

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم — پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
لیکن ہم تو اس خاتون سے بھی زیادہ برہنہ ہیں — اور اقوامِ جہاں کے سامنے بے چادر ہو رہے ہیں

روزِ محشر اعتبارِ ماست او — در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او
روزِ محشر وہی رسولِ برحق ہمارا سہارا ہے — اور دنیا میں بھی وہی ہمارا پردہ دار ہے

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے [1] — آں بیاراں ایں با عدا رحمتے
اس کی محبت اور غصہ ہر دو رحمت تھے — محبت تو دوستوں کے لئے رحمت اور غصہ دشمنوں کیلئے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد [2] — مکہ را پیغامِ "لاتثریب" داد
وہ جس نے دشمنوں پر بھی اپنا درِ رحمت کھولا — اور اہلِ مکہ کو عفو و بخشش کا پیغام دیا۔

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم — چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
ہم سب قید وطن سے بالکل آزاد ہیں — اور نظر کی طرح نورِ دو چشم ہونے کے باوجود ایک ہی ہیں

---

[1] یعنی لطف دوستوں (مسلمانوں) کے حق میں سراپا رحمت تھا۔ اور قہر (غیظ و غضب) دشمنوں (کافروں) کے حق میں سراپا رحمت تھا۔ یہ اس بنا پر کہ اس قہر سے بھی بذریعہ جہاد انہیں صراطِ مستقیم کی طرف لانا مقصود تھا اور ہے۔ یہ "قہر" کسی ذاتی یا دنیوی غرض سے ہرگز نہ تھا۔

[2] فتح مکہ کے وقت آنحضرتؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کے حق میں بھی اعلان فرما دیا کہ:
لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ "آج کے دن تم پر کوئی گرفت نہیں۔"

از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنم یک صبح خندانیم ما

ہم حجاز، چین اور ایران وغیرہ سے یکساں تعلق رکھتے ہیں
اور ہم ایک ہی صبح خنداں کی شبنم ہیں۔

مستِ چشمِ ساقیِ بطحا ستیم
در جہاں مثلِ مے و میناستیم

ہم ساقیٔ مکہ کی آنکھ کے مست ہیں
اور دنیا میں مے و مینا کی طرح مربوط ہیں

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او این خس و خاشاک سوخت

اس نے حسب نسب کے امتیازات کو بالکل جلا دیا
اور اس کی آگ نے یہ خس و خاشاک جلا دیئے

چون گلِ صد برگ ما را بو یکیست
اوست جانِ این نظام و او یکیست

گلِ صد برگ کی طرح ہماری بو ایک ہی ہے
وہی اس نظام کی روح ہے اور وہ خود ایک یکتا ہے

سرِّ مکنونِ دلِ او ما بدیم
نعرہ بے باکانہ زد ما فاش شدیم

اس کے دل کے پوشیدہ بھید ہم ہی تھے
اس نے بیباکی سے نعرۂ حق لگایا اور ہم ظاہر ہو گئے

سوزِ عشقش در نئے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

میری خاموش بنسری میں اس کا سوزِ عشق ہے
اور میری آغوش میں سینکڑوں نغمے تڑپ رہے ہیں

من چہ گویم از تولایش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

میں تجھے اس کے عشق کا کیا اندازہ کراؤں کہ وہ کیا ہے
خشک لکڑی بھی اس کے فراق میں رونے لگی

ہستیِ مسلم تجلی گاہِ او
طورہا بالد ز گردِ راہِ او

مسلمانوں کی ہستی اسی کی تجلی گاہ ہے۔
اور اس کی گردِ راہ سے کئی طور پیدا ہوتے ہیں۔

پیکرم را آفرید آئینہ اش
صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

میرا پیکر بھی اس کے آئینہ کا پیدا کردہ ہے
اور میری صبح اسی کے آفتابِ سینہ سے روشن ہوئی ہے

در تپیدِ دم بدم آرامِ من
گرم تر از صبحِ محشر شامِ من

لمحہ بہ لمحہ تڑپنے ہی میں میرا آرامِ روح ہے
اور میری شام صبحِ قیامت سے بھی گرم تر ہوتی ہے

ابرِ آذار است و من بستانِ او تاکِ من نمناک از بارانِ او

وہ ابرِ بہاری ہے اور میں اس کا گلستان میری بیل اس کی بارش سے تر و تازہ ہے

چشم در کشتِ محبت کاشتم از تماشا حاصلے برداشتم

میں نے محبت کی کھیتی میں آنکھ بوئی اور اس سے دیدارِ محبوب کا لطف اٹھایا

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

خاکِ مدینہ دونوں جہان سے بہتر ہے مبارک ہے وہ شہر جہاں ہمارا دلبر ہے

کشتۂ اندازِ ملا جامیم نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

میں مولانا جامی کے اندازِ بیان کا متوالا ہوں اور ان کی نظم و نثر میری خامیوں کا علاج ہے

شعرِ لب ریزِ معانی گفتہ است در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ است

انہوں نے ایک لبریز معانی شعر کہا ہے اور آنحضرت کی مدح میں موتی پروئے ہیں

"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست

کتابِ ہر دو عالم کا دیباچہ رسولِ اکرم ہیں

جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست"

تمام دنیا کے لوگ غلام ہیں اور وہ سب کے آقا

تارکِ آفل براہیمِ خلیل[۱] انبیا را نقشِ پائے او دلیل

فانی چیزوں کو ترک کر دینے والے حضرت ابراہیم تمام انبیا کے لئے انہیں کا نقشِ پا رہنما ہوا

آں خدائے لم یزل را آیتے[۲] داشت در دل آرزوئے ملتے

وہ کہ خدائے لازوال کی ایک آیت تھے اپنے دل میں ایک قوم کی آرزو رکھتے تھے

---

[۱] آفل: غروب ہونے والا - زوال پذیر - میح بآیہ تسریفہ - "لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ -" میں غروب و فنا

(باقی ص۱۳۸)

جوئے اشک از چشمِ بے خوابش چکید ؎۱ تا پیامِ طَهِّرا بیتی شنید

ان کی چشمِ بے خواب سے جب آنسوؤں کی ندی بہ نکلی تو خدا کی طرف سے "میرا گھر پاک کر" کا پیغام سنا

بہرِ ما ویرانہ آباد کرد ؎۲ طائفاں را خانۂ بنیاد کرد

انہوں نے ہمارے لئے ایک ویرانہ آباد کیا اور طواف کرنے والوں کے لئے ایک گھر کی بنیاد رکھی

تا نہالِ تُبْ عَلَیْنَا غنچہ بست ؎۳ صورتِ کارِ بہارِ ما نشست

جب سے "تُبْ علینا" کے پودے نے غنچے پیدا کیے ہماری تازگی و بہار کا سامان مہیا ہو گیا۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۳۵) ہو جانے والی چیزوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

؎ "آرزوئے ملّت" سے تلمیح مقصود ہے اس آیہ شریفہ کی طرف:- رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ

"اے ہمارے خالق و پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک امتِ مسلمہ (اپنی مطیع و فرمانبردار امت) پیدا کر۔"

؎۱ وَعَهِدْنَا اِلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (آیۃ شریفہ)

"اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے یہ عہد باندھا کہ میرے گھر (کعبہ) کو طواف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک کر دو۔"

؎۲ تلمیح بآیہ شریفہ- رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ "پروردگار! میں نے اپنے اہل و عیال کو تیرے بیتِ محرم (کعبہ) کے قریب ایک بنجر اور ویران سرزمین میں مقیم کر دیا ہے۔"

؎۳ (آیۃ شریفہ-) وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ـ

"پروردگار! تو ہمیں حج کے طریقے سکھا اور ہم پر رحم و التفات کر۔ بے شک تو ہی ہے ملتفت ہونے والا۔ رحم فرمانے والا۔"

حق تعالےٰ پیکرِ ما آفرید
اللہ تعالےٰ نے ہمارا جسم پیدا کیا تو
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
تو بذریعۂ رسالت ہمارے جسم میں روح پھونکی

حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم
ہم تو اس دنیا میں ایک بے آواز حرف تھے
از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
لیکن رسالت نے ہمیں مصرع موزوں بنا دیا

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
دنیا میں ہماری تخلیق رسالت ہی سے ہوئی ہے
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
اور دین و آئین بھی دستِ رسالت سے ملا ہے

از رسالت صد ہزار ما یک است
رسالت ہی سے ہمارے لاکھوں افراد ایک ہو گئے ہیں
جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
اور ایک جزو دوسرے جزو سے ناقابل تقسیم ہو رہا ہے

آں کہ شانِ اوست یَهدِی مَن یُرِید
جس ہستی کی شان یہ ہے کہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے
از رسالت حلقہ گردِ ما کشید
اس نے بذریعہ رسالت ہمارے گرد ایک حلقہ کھینچ دیا

حلقۂ ملت محیط افزا ستے
پھر یہی حلقۂ ملت اپنی وسعت کو بڑھاتا چلا جاتا ہے
مرکزِ او وادیِ بطحا ستے
اور اس کا اصل مرکز وادیِ مکہ ہے

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم
ہم اسی کے تعلق سے وابستہ ہو کر ایک قوم ہیں
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
اور تمام دنیا والوں کے لئے پیغامِ رحمت بن رہے ہیں

از میانِ بحرِ او خیزیم ما
ہم اسی کے سمندر کی تہ سے اٹھے ہیں
مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
لیکن موج کی طرح بے بس اور گرتے پڑتے ہوئے نہیں

امتش در حرزِ دیوارِ حرم
اس کی امت دیوارِ حرم کی حفاظت و نگہداشت میں
نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم
ذخیرے کے شیروں کی طرح نعرہ زن ہو رہی ہے

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
اگر تو میرے الفاظ کے معانی کی تحقیق کرے
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
اور اگر تو مقامِ رسول کو چشمِ صدیقؓ سے دیکھے

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
تو ہمارا نبی ہی ہمارے دل و جگر کی قوت ہے
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ
اور وہ ہمارے لئے خدا سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتا ہے

قلبِ مومن را کتابش قوت است
اس کی کتاب (قرآن) دلِ مومن کی تاب و تواں ہے
حکمتش حبل الورید ملت است
اور اس کی حکمت (حدیث) ملت کی شہ رگ ہے

دامنش از دست دادن مردن است
اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گویا مرنا ہے۔
چوں گل از بادِ خزاں افسردن است
اور پھول کی طرح بادِ خزاں سے مرجھا جانا ہے

زندگی قوم از دمِ او یافت است
قوم نے زندگی اس کے دم سے حاصل کی ہے
ایں سحر از آفتابش تافت است
اور ہر صبح اسی کے سورج سے روشن ہوئی ہے

فرد از حق، ملت از وے زندہ است
فرد تو رشتۂ حق سے، لیکن ملت اس کے تعلق سے زندہ ہے
از شعاعِ مہرِ او تابندہ است
اور وہ اسی کے آفتاب کی شعاع سے روشن ہے

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم سراسر رسالت ہی سے ہم نوا (ہم عقیدہ) ہوئے ہیں
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
اور ہم اسی سے ہم مدعا اور متحد و متفق ہوگئے ہیں

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
ہم مدعا لوگوں کی کثرت بھی وحدت بن جاتی ہے
پختہ چوں وحدت شود ملت شود
اور جب وحدت پختہ ہوتی ہے تو وہ ملت بن جاتی ہے

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
ہر کثرت پابندیٔ وحدت ہی سے زندہ ہے
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
اور مسلمانوں کی وحدت سراسر پیرویٔ اسلام ہے

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
ہم نے دینِ فطرت (اسلام) رسولِ کریم سے سیکھا ہے
در رہِ حق مشعلے افروختیم
اور اس طرح خدا کی راہ میں مشعلِ ایمان روشن کی ہے

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
یہ موتی (اسلام) ہمیں اسی کے بحرِ بے پایاں سے ملا ہے
ما کہ یکجائیم، از احسانِ اوست
ہم جو متحد اور یکجا ہیں تو یہ بھی سراسر اسی کا احسان ہے

تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود | ہستیٔ ما با ابد ہمدم شود
جب تک یہ وحدت وجمعیت ہمارے ہاتھ سے نہیں جاتی | ہماری ہستی ابدی اور غیر فانی رہے گی۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد | بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
پس خدا نے ہم پر تو شریعت ختم کر دی | اور ہمارے رسولؐ پر رسالت کا خاتمہ کر دیا۔

رونق از ما محفلِ ایام را | او رسل را ختم و ما اقوام را
محفلِ دنیا کی رونق سراسر ہمارے دم سے ہے | اس نے تو رسولوں کو ختم کر دیا اور ہم نے اقوام کو

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت | داد ما را آخریں جامے کہ داشت
اور ہمارے رسول ساقی گری کی خدمت ہمارے سپرد کر گیا | اور جو آخری جام (قرآن) اس کے پاس تھا وہ ہمیں دیا

"لا نبی بعدی" ز احسانِ خداست | پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
"میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا" یہی خدا کا احسانِ عظیم ہے | اور یہ ختمِ نبوت دینِ مصطفےٰ کا پردۂ عزت ہے

قوم را سرمایۂ قوت ازو | حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو
قوم کے لئے تمام سرمایۂ قوت اسی سے ہے۔ | اور وحدتِ ملت کا راز بھی اسی کے تعلق میں ہے

حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست | تا ابد اسلام را شیرازہ بست
چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر نقشِ باطل کو توڑ دیا۔ | اور رسالت) تا ابد اسلام کا شیرازہ باندھ دیا

دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
مسلمان تو غیر اللہ سے اپنا دل اٹھا لیتا ہے

نعرۂ "لا قوم بعدی" می زند (رموزِ بیخودی)
اور نعرہ لگاتا ہے کہ "میرے بعد کوئی قوم نہیں ہوگی"۔

لہ "ساقی گری" سے مراد ہے تبلیغِ قرآن واسلام کی خدمت۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ　　گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ

تو شاخسارِ مصطفےٰ ہی کا ایک غنچہ ہے　　بادِ بہارِ مصطفےٰ سے پھول بن جا۔

از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت

اسی کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہیئے　　اور اسی کے خلقِ عظیم سے اپنا حصہ لینا چاہیئے

مرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است　　آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است

مرشدِ رومی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے　　وہ کہ جس کے قطرے میں سمندر چھپا ہوا ہے

مگسل از ختم الرسل ایامِ خویش　　تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

خدا کے آخری رسول سے اپنے تعلقات منقطع نہ کر　　اور اپنے فنون اور رفتارِ عمل پر بھروسہ نہ کر

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است　　در جہاں دست و زبانش رحمت است

مسلمان کی فطرت سراپا شفقت ہے　　اور دنیا میں اس کے دست و زبان رحمت ہیں

آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم　　رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم

وہ کہ جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا　　اس کی رحمت عام ہے اور اس کے اخلاق بلند

از مقامِ او اگر دور ایستی　　از میانِ معشرِ ما نیستی

اگر تو اس کے موقف سے ابھی دور ہے　　تو تو ہمارے گروہ مسلمین میں سے نہیں ہے

تو کہ مرغِ بوستانِ ماستی　　ہم صفیر و ہم زبانِ ماستی

تو کہ ہمارے باغ کا ایک پرندہ ہے　　اور ہمارا ہم آواز اور ہم زبان بھی ہے۔

نغمۂ داری اگر تنہا مزن　　جز بہ شاخِ بوستانِ ما مزن

اگر تو کوئی نغمہ رکھتا ہے تو اسے اکیلا نہ الاپ　　بلکہ ہماری شاخِ بوستاں پر سب کے ساتھ مل کر الاپ

ہر چہ ہست از زندگی سرمایہ دار　　میرد اندر عنصرِ ناسازگار

جو چیز بھی یہاں زندگی سے سرمایہ دار ہے　　وہ ناموافق عنصر میں رہ کر مر جاتی ہے

بلبل استی در چمن پرواز کن | نغمہ با ہم نوایاں ساز کن

تو بلبل ہے اپنا چمن میں پرواز کر | اور اپنے ہم جنسوں سے مل کر نغمہ سرائی کر

در عقاب استی تہِ دریا مزی | جز بخلوت خانۂ صحرا مزی

اگر تو عقاب ہے تو تہِ دریا زندگی بسر نہ کر | بلکہ صحرا کے تنہا گھر میں زندگی بسر کر

کوکبی؟ می تاب بر گردونِ خویش

اگر تو ستارہ ہے تو اپنے آسمان پر چمک۔

پا منہ بیرون زپیرا ہونِ خویش

اور اپنے حلقہ سے باہر بالکل قدم نہ رکھ

قطرۂ آب گر از نیسان[1] بری | در فضائے بوستانش پروری

اگر تو ابرِ نیساں سے ایک قطرۂ آب لے | تو اس کی پرورش فضائے گلستان میں کر

تا مثالِ شبنم از فیضِ بہار | غنچۂ تنگش بگیرد در کنار

تا کہ فیضِ بہار سے شبنم کی طرح | غنچۂ تنگ اسے اپنی آغوش میں لے لے

آں شعاعِ آسماں تابِ سحر | کز فسونش غنچہ می بندد شجر

صبح کی وہ شعاع جس سے آسمان روشن ہو جاتا ہے | اور جس کے جادو سے شجر میں غنچے پیدا ہوتے ہیں

عنصرِ نم بر کشی از جوہرش | ذوقِ رم از سالماتِ مضطرش

اگر تو اس کے جوہر سے نمی کا عنصر کھینچ لے | اور اس کے مضطرب اجزائے ترکیبی سے پرواز کا ذوق اڑا لے

---

[1] نیساں۔ نام ساتویں مہینہ رومی کا اور اس مہینہ میں جو بارش ہوتی ہے اس کے قطرات سے سیپ میں موتی پیدا ہوتے ہیں۔

گوہرت جز موجِ آبے ہیچ نیست — سعی تو غیر از سرابے ہیچ نیست
تو تیرا گوہر موجِ آب کے سوا کچھ نہیں — اور تیری کوشش سراب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

در یم اندازش کہ گردد گوہرے — تابِ او لرزد چو تابِ اخترے
تو اسے سمندر میں ڈال تاکہ وہ موتی بن جائے — اور اس کی چمک دمک ستارے کی طرح لرزے

قطرۂ نیساں کہ مہجور از یم است — نذرِ خاشاکے مثالِ شبنم است
وہ قطرۂ ابرِ نیساں جو سمندر سے دور ہے۔ — شبنم کی طرح مٹی میں جذب ہو کر رہ جائے گا

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است — آب و تابش از یمِ پیغمبر است
اسی طرح مسلمان کی فطرتِ پاک بھی مانندِ گوہر ہے — اور اس کی آب و تاب بحرِ نبوت سے ممکن ہے

آبِ نیسانی بآغوشش درآ — وز میانِ قلزمش گوہر برآ
تو ابرِ نیسانی کا پانی ہے لہٰذا اس کی آغوش میں آسودہ ہو — اور اس کے سمندر سے موتی بن کر نکل۔

در جہاں روشن تر از خورشید شو
دنیا میں سورج سے بھی زیادہ روشن ہو۔
صاحبِ تابانیٔ جاوید شو (رموزِ بیخودی)
سینۂ پیغمبر سے غیر فانی روشنی حاصل کر

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے کہ تیرا ظہور زندگی کا شباب ہے — اور تیرا جلوہ خوابِ زندگی کی تعبیر ہے

اے زمیں از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسۂ بامت بلند
اے کہ زمین تیری بارگاہ سے سعادت مند ہے — اور آسمان تیری چھت کے بوسہ سے بلند ہے

شش جہت روشن ز تابِ روئے تو — ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
چھ اطراف تیرے نورِ چہرہ سے روشن ہیں — اور ترک و تاجیک و عرب تیرے غلام

از تو بالا پایۂ این کائنات
تیری ہستیٔ مقدس سے کائنات کا مرتبہ بلند ہوا
فقرِ تو سرمایۂ این کائنات
اور تیرا فقر کائنات کا مستقل سرمایہ ہے

در جہاں شمعِ حیات افروختی
تو نے دنیا میں زندگی کی شمع روشن کی
بندگاں را خواجگی آموختی
اور غلاموں کو آقائی کا درس دیا۔

بے تو از نابود مندیہا خجل [1]
دنیا کی اس سرائے آب وگل کے تمام اجسام
پیکرانِ این سرائے آب و گل
تیرے بغیر بے وقعت و بے حقیقت ہونے سے شرمندہ ہیں

تا دمِ تو آتشے از گل کشود
جب سے تیرے دم نے مٹی سے آگ کے شعلے پیدا کیے
تودہ ہائے خاک را آدم نمود
خاک کے بے روح تودوں کو آدم بنا دیا

ذرہ دامن گیرِ مہر و ماہ شد
پھر ایک ذرہ بھی سورج اور چاند کا دامن گیر ہو گیا
یعنی از نیروئے خویش آگاہ شد
یعنی وہ اپنی قوت باطن سے باخبر ہوا

تا مرا افتاد بر رویت نظر
جب سے میری نظر تیرے چہرۂ مبارک پر پڑی ہے
از اب و ام گشتۂ محبوب تر
تو میرے نزدیک ماں باپ سے بھی محبوب تر ہے۔

عشق در من آتشے افروختست
تیرے عشق نے میرے سینہ میں آگ لگا رکھی ہے
فرصتش بادا کہ جانم سوختست
وہ عشق سلامت رہے کہ اس نے میری روح میں سوز پیدا کی

نالۂ مانندِ نے سامانِ من
بنسری کی طرح آہ و فریاد میرا سامانِ زندگی ہے۔
آں چراغِ خانۂ ویرانِ من
اور وہ نالہ میرے ویران گھر کا چراغ ہے

از غمِ پنہاں نہ گفتن مشکل است
اب غمِ باطن کا اظہار نہ کرنا میرے لئے مشکل ہے
بادہ در مینا نہفتن مشکل است
اور شراب کو مینا میں چھپا رکھنا ناممکن ہے

مسلم از سرِّ نبیؐ بیگانہ شد
مسلمان دینِ نبیؐ کے اسرار سے غافل ہو گیا
باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
اور اسی طرح یہ کعبہ دوبارہ بت خانہ بن گیا۔

[1] حاشیہ صفحہ ۱۴۳ پر

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل ۔۔۔ ہر یکے دارد بتے اندر بغل

آج پھر لات اور منات، عزّیٰ اور ہبل ۔۔۔ جیسے بت ہر مسلمان کی بغل میں ہیں۔

شیخِ ما از برہمن کافر تر است ۔۔۔ زانکہ او را سومنات اندر سر است

ہمارا امام و پیشوا بھی برہمن سے بدتر کافر ہے ۔۔۔ کیونکہ اس کے سر میں بتخانۂ سومنات بس رہا ہے

رختِ ہستی از عرب برچیدۂ ۔۔۔ در خمستانِ عجم خوابیدۂ

اس نے عرب سے اپنا سامانِ ہستی اٹھا لیا ۔۔۔ اور میخانۂ عجم میں جاکر سو گیا

شل ز برفابِ عجم اعضائے او ۔۔۔ سرد تر از اشکِ او صہبائے تو

عجم کے برفاب سے اس کے اعضاء شل ہو گئے ۔۔۔ اور اس کے آنسوؤں سے تیری شراب سرد تر ہو گئی

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ ۔۔۔ سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ

مسلمان موت سے کافر کی طرح ڈرتا ہے ۔۔۔ اور اس کا سینہ دلِ زندہ سے خالی ہے

نعشش از پیشِ طبیباں بردہ ام ۔۔۔ در حضورِ مصطفیٰ آوردہ ام

میں نے اس کے جسمِ مردہ کو طبیبوں کے سامنے سے اٹھایا ۔۔۔ اور حضورِ مصطفیٰ میں لا کر رکھا

مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش ۔۔۔ سرّے از اسرارِ قرآں گفتمش

وہ مردہ تھا میں نے اسے آبِ حیات مہیّا کیا ۔۔۔ اور قرآن کے بھیدوں میں سے ایک بھید بتایا

داستانے گفتم از یارانِ نجد ۔۔۔ نکہتے آوردم از بستانِ نجد

میں نے اسے یارانِ عرب کی داستان سنائی ۔۔۔ اور گلستانِ عرب سے اس کے لئے خوشبو لایا

محفل از شمعِ نوا افروختم ۔۔۔ قوم را رمزِ حیات آموختم

میں نے اپنی شمعِ نوا سے محفلِ مسلم روشن کر دی ۔۔۔ اور میں نے ہی قوم کو رمزِ حیات سکھائی

حاشیہ صفحہ ۱۴۵ ۔ سلہ اس شعر کے تحت مصرعِ دوم کا ترجمہ پہلے دیا گیا ہے اور مصرعِ اوّل کا بعد میں

گفت بر ما بندد افسونِ فرنگ | ہست غوغائیش ز قانونِ[1] فرنگ
اس نے کہا کہ ہم پر تو فرنگ کا جادو چھایا ہوا ہے | اور اس کا تمام شور و غوغا بھی سازِ فرنگ سے ہے

اے بصیری را ردا بخشندۂ[2] | بربطِ سلما مرا بخشندۂ
اے کہ جس نے بصیری کو اپنی چادر عطا کی | اور مجھے بربطِ سلمٰی مرحمت فرمایا۔

ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را | اینکہ نشناسد متاعِ خویش را
اس گمراہ خیال کو ذوقِ حق سے بہرہ ور فرما | جو اپنے ساز و سامان کی قدر و قیمت نہیں سمجھتا

گر دلم آئینۂ بے جوہر است | ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اگر میرا دل ایک آئینۂ بے جوہر ہے | اور اگر میرے کلام میں قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز پوشیدہ ہے

اے فروغت صبحِ اعصار و دہور | چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور
اے کہ تیرا نور سب زمانوں کیلئے صبحِ روشن ہے | اور تیری آنکھ سینوں کی باطنی حالت دیکھتی ہے

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن | ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
دراں حال میری فکر کے پردۂ ناموس کو چاک کر دے | اور اس گلشنِ ملت کو میرے کانٹے سے پاک کر دے

تنگ کن رختِ حیات اندر برم | اہلِ ملت را نگہ دار از شرم
زندگی کے لباس کو میرے جسم پر تنگ کر دے | اور افرادِ ملت کو میرے شر سے محفوظ رکھ

سبز کشتِ نابسامانم مکن | بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
میری بے سروسامان کھیتی کو سبز و شاداب نہ کر | اور مجھے ابرِ نیسانی سے بھی مستفید نہ ہونے دے

---

[1] قانون: ایک قسم کا ساز ہے۔

[2] بصیری: مصنفِ قصیدۂ بردہ جس نے عالمِ رؤیا میں نبیِ کریم کو اپنا مشہور قصیدہ سنایا اور حضورؐ نے اس کے صلے میں خوش نصیب بصیری کو اپنی چادرِ مطہر عطا فرمائی۔

خشک گرداں بادہ در انگورِ من
میرے انگور میں شراب کو خشک کر دے
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
اور میری شرابِ کافوری میں زہر ڈال دے

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
پھر روزِ قیامت بھی مجھے خوار و رسوا کر
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
اور اپنے بوسۂ پا سے بھی محروم رکھ

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام
اور اگر میں نے اپنے کلام میں اسرارِ قرآنی کے موتی پروئے ہیں
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اور اگر مسلمانوں سے ہمیشہ حق بات کہی ہے

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است
اے کہ تیرے احسان سے حیوان بھی انسان بن گئے
یک دُعایت مزدِ گفتارم بس است
تیری ایک ہی دعا میرے تمام کلام کی بہترین مزدوری ہے

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل
خدائے ذوالجلال کے حضور میرے حق میں عرض کر
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
کہ میرا عشق عمل سے ہم آہنگ ہو جائے

دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ
تونے دردمند جان کی دولت تو مجھے بخشی ہے
بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
اور علمِ دین سے بھی بہرہ ور کیا ہے

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
لیکن اب مجھے عمل میں بھی پائندہ تر کر
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا
میں ابرِ نیسانی کا قطرہ ہوں - تُو مجھے موتی بنا دے

رختِ جاں تا در جہاں آوردہ ام
میں جب سے دنیا میں روح کا سامان لایا ہوں
آرزوئے دیگرے پروردہ ام
دل میں ایک اور آرزو کی پرورش کرتا رہا ہوں

ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است
وہ آرزو میرے سینہ میں دل کی طرح آسودہ ہے
محرم از صبحِ حیاتم بودہ است
اور وہ صبحِ زندگی ہی سے میری رازدار ہے

از پدر تا نامِ تو آموختم
آتشِ این آرزو افروختم

جب سے میں نے والدِ محترم سے حضور کا اسمِ مبارک سنا
اس آرزو کی آگ کو برابر ہوا دیتا رہا

تا فلک دیرینہ تر سازد مرا
در قمارِ زندگی بازد مرا

جب سے آسمان مجھے روز بروز پرانا (بڈھا) کر رہا ہے
اور زندگی کے جوئے میں مجھ سے کھیل رہا ہے

آرزوئے من جوان تر می شود
این کہن صہبا گران تر می شود

میری وہ آرزو جوان تر ہوتی چلی جاتی ہے
اور یہ پرانی شراب دن بدن زیادہ قیمتی ہو رہی ہے

این تمنّا زیرِ خاکم گوہر است
در شبم تابِ ہمین یک اختر است

یہ تمنا میری خاک کے نیچے ایک ہیرا ہے
اور میری رات میں اسی ایک ستارے کی روشنی ہے

مدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم

میں ایک مدت لالہ رو حسینوں کے ساتھ رہا
اور زلفِ تابدار رکھنے والے معشوقوں سے عشق کیا

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

میں نے ماہ جبینوں کے ساتھ مئے گلفام بھی اڑائی
اور اپنے چراغِ سکون و اطمینان کو خود بجھایا

برقہا رقصیدہ گردِ حاصلم
رہزناں بردند کالائے دلم

الغرض میرے حاصل کے گرد بہت سی بجلیاں رقصاں رہیں
اور اکثر رہزن میری متاعِ دل کو لوٹ کر لے گئے

این شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت
این زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت

مگر بایں ہمہ اس آرزو کی شراب میرے شیشۂ روح سے نہ گری
اور یہ خالص سونا میرے دامن سے نیچے نہ گرا

عقلِ آزر پیشہ ام زنّار بست
نقشِ او در کشورِ جانم نشست

عقلِ آزر پیشہ نے میرے جسم پر زنّار بھی باندھی
لیکن اس آرزو کا نقش میری اقلیمِ روح میں جاری رہا

سالہا بودم گرفتارِ شکے
از دماغِ خشکِ من لا ینفکے

میں سالہا گرفتارِ شکوک و شبہات رہا
اور وہ شکوک میرے خشک دماغ سے الگ نہ ہوئے

حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ — در گماں آباد حکمت ماندۂ

میں نے علم الیقین کا کوئی ایک حرف بھی نہ پڑھا تھا — لہٰذا فلسفہ کے خرابۂ شکوک و اوہام میں سرگرداں رہا

ظلمتم از تابِ حق بیگانہ بود — شامم از نورِ شفق بیگانہ بود

میری ظلمت نورِ حق سے بالکل بیگانہ تھی — اور میری شام تجلیٔ شفق سے محروم و دور

ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند

پس یہ آرزو میرے دل میں سوئی رہی — اور صدف میں موتی کی طرح پوشیدہ رہی

آخر از پیمانۂ چشمم چکید — در ضمیرِ من نواہا آفرید

آخر وہ میرے پیمانۂ چشم سے ٹپک پڑی — اور میرے دل میں ہنگامۂ نو سے اضطراب پیدا کیا

اے ز یادِ غیرِ تو جانم تہی — بر لبش آرم اگر فرماں دہی

اے کہ تیری یاد کے علاوہ میرے سینہ میں کوئی یاد نہیں — اگر تو اجازت دے تو میں وہ آرزو ہونٹوں پر لاؤں

زندگی را از عمل ساماں نہ بود — پس مرا ایں آرزو شایاں نہ بود

چونکہ میری زندگی میں کوئی سامانِ عمل نہیں تھا — لہٰذا ایسی آرزو مجھ جیسے شخص کے لیے موزوں نہیں تھی

شرم از اظہارِ او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزاید مرا

مجھے تو اس کے اظہار سے بھی شرم آتی ہے — لیکن تیری رحمت و شفقت میری جرأت میں اضافہ کرتی ہے

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز

اے کہ تیری شانِ رحمت سے دنیا معمور ہے — میں یہ آرزو رکھتا ہوں کہ حجاز میں مروں

مسلمے از ما سوا بیگانۂ — تا کجا زنّاریِ بت خانۂ

ایک ایسا مسلماں جو غیر اللہ سے بالکل بیگانہ ہو — کب تک بت خانۂ ہند کا زناری رہے

حیف چوں او را سرآید روزگار — پیکرش را دیر گیرد در کنار

نہایت افسوس کی بات ہے کہ جب اس کے دن بیت چکیں — تو اس کا جسم بت خانے کی آغوش میں ہو

از درت خیزد اگر اجزائے من — وائے امروزم خوشا فردائے من
اگر روزِ حشر میرے اجزائے بدن تیرے دروازے سے اٹھیں — تو افسوس ہے میرے آج پر اور مبارک ہے میرے کل پر

فرخا شہرے کہ تو بودی دراں — اے خنک خاکے کہ آسودی دراں
کیا ہی مبارک ہے وہ شہر جس میں تو قیام پذیر تھا — اور کیسی خوش قسمت ہے وہ مٹی جس میں تو آسودہ ہے

مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من — پیشِ عاشق ایں بود حبّ الوطن
وہ شہر میرے شاہ کا شہر ہے اور محبوب کا مسکن — سچے عاشق کے لیے یہ ہے صحیح حبِّ وطن

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
میرے ستارے کو دیدۂ بیدار عطا فرما — اور مجھے اپنے سایۂ دیوار میں مزار مرحمت کر

تا بیاساید دلِ بے تابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من
تاکہ میرا مضطرب دل مطمئن ہو جائے — اور میرا پارہ مرتعش ہونے کی بجائے بستگی پیدا کرے

با فلک گویم کہ آرامم نگر
پھر میں آسمان سے کہوں گا میرا آرام دیکھ
دیدۂ آغازم، انجامم نگر (رموزِ بیخودی)
تو نے میرا آغاز تو دیکھا تھا میرا انجام بھی دیکھ

زندہ رود

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطا است
اگرچہ یہ سوال ایک گستاخی ہے لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں
سرِ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است
کہ مجھے اس جوہر کا بھید بتا جس کا نام مصطفےٰ ہے

آدمے یا جوہرے اندر وجود؟
وہ عالمِ وجود میں آدمی ہے یا جوہر؟
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود؟
اور کیا وہ کبھی کبھی دوبارہ ظہور میں آتا ہے؟

حلاّج

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
مصطفٰےؐ کے سامنے تو خود دنیا ماتھا رگڑتی ہے۔ — اور اس نے خود کو اللہ کا بندہ فرمایا ہے۔

عبدہٗ از فہمِ تو بالاتر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
"اللہ کا بندہ" تیرے فہم سے بالاتر ہستی ہے — اس لئے کہ وہ آدمی بھی ہے اور جوہر بھی۔

جوہرِ او نے عرب نے اعجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است
اس کا جوہر نہ عرب سے وابستہ ہے نہ عجم سے — وہ آدم ہونے کے باوجود آدم سے بھی قدیم ہے

عبدہٗ، صورت گرِ تقدیرہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
"اللہ کا بندہ"، ہی تقدیروں کا صورت گر ہے — اس کے باطن میں ویرانے بھی ہیں اور تعمیریں بھی

عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں [1] — عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
"اللہ کا بندہ" جانفزا بھی ہے اور جانستان بھی — اللہ کا بندہ شیشہ بھی ہے اور سنگ گراں بھی

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دگر [2] — ما سراپا انتظار او منتظر
"غلام" کچھ اور چیز ہے اور بندۂ حق کچھ اور — ہم سراپا انتظار ہیں اور بندۂ حق منتظر

---

[1] "جانفزا" مومنین کے لئے اور "جانستان" کفّار و مشرکین کے لئے۔ مومنوں کے ساتھ شیشہ (رحماء اور رحیم

(باقی بر صفحہ ۱۵۲)

عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ است | ما ہمہ رنگیم، او بے رنگ و بوست

بندۂ حق دہر ہے اور دہر بندۂ حق سے پیدا ہوا ہے | ہم سب رنگ ہیں مگر وہ بے رنگ و بے بو ہے

عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست | عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجا ست

بندۂ حق ابتدا بھی رکھتا ہے اور بے انتہا بھی ہے | بندۂ حق ہم جیسے صبح و شام نہیں رکھتا

کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست | عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نیست

کوئی شخص "عبدہٗ" کے صحیح مفہوم سے آگاہ نہیں | "عبدہٗ" کلمۂ توحید کی روحِ رواں ہے

لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ | فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ[1]

لا الٰہ تیغ ہے اور اس کی دھار عبدہٗ | اور اگر تو اسے اور واضح کرنا چاہے تو کہہ ہو عبدہٗ

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات | عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

بندۂ حق کائنات کی مقدار و کیفیت ہے | بندۂ حق کائنات کا رازِ باطن ہے

مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت | تا نہ بینی از مقامِ ما رمیت[2]

ان دو تین شعروں سے مفہومِ عبدہٗ کی وضاحت نہیں ہوتی | تاوقتیکہ تو "ما رمیت" کا مرتبہ خود نہ دیکھے

(بقیہ صفحہ ۱۵۲) وکریم) اور کافروں کے حق میں بھاری پتھر (متشدد) الغرض اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ ؎۵۲ "عبد" بمعنی غلام مخلوق "عبدہٗ" بمعنی بندۂ حق دو بالکل متضاد چیزیں ہیں "عبد" سراپا مشرک اور عبدہٗ" سراپا موحّد۔ پہلا پیکرِ شر اور دوسرا پیکرِ خیر، پہلا سونی صد باطل اور دوسرا سونی صد حق۔ پہلا مجبورِ محض اور دوسرا مختارِ کل۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرا "عبد" (بندہ) ذکر و عبادت میں محو رہتے ہوئے آخر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس

(باقی صفحہ ۱۵۴)

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو — آں کہ از خاکش بروید آرزو

تو جہاں بھی کوئی جہانِ رنگ و بو دیکھے — وہ کہ جس کی خاک سے آرزوئیں پیدا ہو

یا ز نورِ مصطفےٰ اُورا بہا ست! — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

یا تو اس جہان کی قدر و قیمت نورِ مصطفےٰ کی موجودگی سے ہے — یا وہ ابھی مصطفےٰ کی تلاش میں سرگردان ہے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃٌ للعالمینے ہم بود!

الغرض جہاں کہیں ہنگامۂ عالم دکھائی دے گا — وہاں رحمۃٌ للعالمینؐ بھی لازمی طور پر موجود۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

تخلیق، تقدیر اور ہدایت صنعتِ الٰہی کی ابتدا ہے

رحمۃٌ للعالمینی انتہاست (جاوید نامہ)

لیکن مرتبۂ رحمۃٌ للعالمینی اس کی غایت و انتہا

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ — وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

اے کہ تو بیچارہ و بے کس لوگوں کا سہارا ہے — مسلمان قوم کو خوفِ مرگ سے آزاد کر

سوختی لات و مناتِ کہنہ را — تازہ کردی کائناتِ کہنہ را

تو نے پرانے لات و منات کو جلا دیا — اور پرانی کائنات کو تازہ کر دیا

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

جنات اور انسانوں کے اس جہانِ ذکر و فکر میں — تو ہی نمازِ صبح ہے اور تو ہی بانگِ اذاں

(بقیہ صفحہ ۱۵۲) سے وہ بولتا ہے"۔ الغرض یہ ہے عبد اور عبدہٗ کا اتحادِ کامل اور یہ ہے "ہُوَ عبدہٗ" کی صحیح تفسیر و تعبیر۔

۱۵ آیہ شریفہ "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" "اے پیغمبر (کفار پر) وہ کنکر آپ نے نہیں پھینکے تھے بلکہ درحقیقت وہ دستِ خداوندی نے پھینکے تھے"۔

لذّتِ سوز و سرور از لا اِلٰہ　　در شبِ اندیشہ نور از لا اِلٰہ
سوز و سرورِ ایمان کا لطف لا الٰہ سے ہے　　اور انسان کی شبِ خیال میں نور لا الٰہ سے

نے خداہا ساختیم از گاؤ و خر　　نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نہ تو ہم نے گائے اور گدھے کو اپنا معبود بنالیا　　اور نہ کاہنوں اور راہبوں کے سامنے سجدہ ریز

نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر　　نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
نہ ہم نے بڈھے اور پرانے معبودوں کے سامنے سر رکھا　　اور نہ بادشاہ و امیر کے محل کا طواف

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست　　فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست
یہ سب کچھ تیرے لطفِ بے انتہا کا نتیجہ ہے　　میری فکر نے تیرے ہی احسان سے پرورش پائی

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور　　قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
تیرا ذکر ذوق و سرورِ حق کا سرمایہ ہے　　اور وہ قوم کو فکر میں بھی غیرت مند رکھے ہوئے

اے مقام و منزلِ ہر راہرو　　جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو
اے کہ تو ہر راہرو کی منزل اور مستقر ہے　　اور تیری کشش ہر مسافر کے دل میں موجود ہے

سازِ ما بے صوت گردید آں چناں　　زخمہ بر رگہائے او آید گراں
ہمارا ساز اس قدر بے آواز ہو رہا ہے　　کہ مضراب کی چوٹ بھی اس کے تاروں پر بوجھ

در عجم گردیدم و ہم در عرب　　مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
میں تو عجم میں بھی پھرا اور عرب کو بھی دیکھا　　مصطفیٰ ہر جگہ نایاب تھا مگر ابولہب بے شمار

شہسوارا! یک نفس درکش عناں　　حرفِ من آساں نیاید بر زباں
اے شہسوارِ میدانِ حق پرستی! ذرا اپنی باگ تو روک　　میرا مدعائے دل آسانی سے زبان پر نہیں آسکتا

آرزو آید کہ ناید تا بہ لب؟　　می نہ گردد شوق محکومِ ادب
میری آرزو ہونٹوں تک آسکے یا نہ آسکے؟　　جذب و شوقِ محبّت محکومِ ادب نہ ہوگا

آں بگوید لب کشا اے دردمند
شوق کہتا ہے کہ اے دردمند اپنے ہونٹ کھول
ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند
مگر ادب کہتا ہے کہ آنکھیں کھول اور ہونٹ بند کر

گردِ تو گردد حریم کائنات
تمام کائنات ادب سے تیرا طواف کرتی ہے
از تو خواہم یک نگاہِ التفات
میں تجھ سے ایک نگاہ التفات چاہتا ہوں

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
تو ہی میرا ذکر و فکر ہے اور تو ہی میرا علم و عرفان
کشتی و دریا و طوفانم توئی
تو ہی میری کشتی ہے تو ہی دریا اور تو ہی طوفان

آہوئے زار و زبون و ناتواں
میں گویا ایک لاغر اور کمزور و ناتواں ہرن ہوں
کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں
اور دنیا میں کسی نے مجھے اپنے تسمے سے نہ باندھا

اے پناہِ من حریم کوئے تو
اے کہ تیرے کوچے کی چار دیواری میری پناہ ہے
من بامیدے رمیدم سوئے تو
میں ایک امید کے ساتھ تیری طرف بھاگا ہوا آیا ہوں

آں نوا در سینہ پروردن کجا
میں اپنی آواز کو کب تک سینے میں پالتا رہوں
وز دمے صد غنچہ وا کردن کجا
اور ایک سانس سے سو غنچوں کو کب تک کھولوں

نغمۂ من در گلوئے من شکست
میرا نغمہ میرے گلے ہی میں ٹوٹ گیا
شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست
اور میرے سینہ سے ایک شعلہ بھی باہر نہ نکلا

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
میرے سانس میں سوزِ جگر باقی نہ رہا
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند
اور صبح کو قرآن پڑھنے کا لطف بھی نہ رہا

نالۂ کو می نہ گنجد در ضمیر
وہ آہ و نالہ جو میری ضمیر میں نہیں سما سکتا
تا کجا در سینہ ام ماند اسیر
کب تک میرے سینہ میں اسیر رہے؟

یک فضائے بیکراں می بایدش
اسے تو ایک فضائے بے کراں چاہیے
وسعتِ نہ آسماں می بایدش
اور اس کی جولانی کو نو آسمانوں کی وسعت چاہیے

آہ زاں دردے کہ در جان و تن است [۱] — گوشۂ چشمِ تو داروئے من است

فریاد ہے اس درد سے جو میرے جسم و جان میں ہے، — اور اس درد کی صحیح دوا تو تیری چشمِ التفات ہے،

در نسازد با دواہا جانِ زار — تلخ و بویش بر مشامم ناگوار

میری جانِ زار اب دواؤں کی متحمل نہیں ہو سکتی — دوا کڑوی ہے اور اس کی بو میری قوتِ شامہ کو ناگوار

کارِ ایں بیمار نتواں برد پیش — من چو طفلاں نالم از داروئے خویش

ایسا بیمار کس طرح صحتیاب ہو سکے گا — جبکہ میں اپنی دوا سے بچوں کی طرح روتا ہوں

تلخیِ اورا فزودیم از شکر — خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر

میں دوا کی کڑواہٹ کو کھانڈ سے زائل کیا کرتا ہوں — اور میرا معالج یہ دیکھ کر ہنسی ہونٹوں میں دبا لیتا ہے

چوں بصیریؒ [۲] از تو می خواہم کشود — تا بمن باز آید آں روزے کہ بود

میں تو بصیری کی طرح اپنی کشودِ مشکل تجھ سے چاہتا ہوں — تاکہ مجھے پہلے ایامِ صحت واپس مل جائیں

مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است — در خطا بخشی چو مہرِ مادر است

تیری رحمت گنہگاروں کے حق میں بڑھتی رہتی ہے — اور وہ خطا بخشی میں ماں کی محبت کی طرح ہے

با پرستارانِ شب دارم ستیز [۳] — باز روغن در چراغِ من بریز

میں رات کے پجاریوں سے محوِ جنگ ہوں — لہٰذا میرے چراغِ زندگی میں دوبارہ تیل ڈال

---

[۱] علامہ اقبالؒ یہاں سے اپنے مرض کے درد و کرب کا تذکرہ کرتے ہوئے درگاہِ رحمۃٌ للعالمینؐ سے نگاہِ التفات اور پرتوِ رحمت کے خواستگار ہوتے ہیں۔ کہ وہی ان کی بہترین دوا ہے

[۲] بصیریؒ مشہور عربی قصیدہ بردہ کا مصنف۔ یہ قصیدہ حضور رسالتمآبؐ کی نعت میں ہے۔ روایت ہے کہ بصیریؒ کا قصیدہ بارگاہِ نبویؐ میں مقبول ہوا اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی۔

[۳] پرستارانِ شب: رات کی تاریکی کو کفر و باطل کی تاریکی سے تشبیہ دی ہے۔ لہٰذا پرستارانِ

(باقی صفحہ ۱۵۵)

اے وجودِ تو جہاں را نو بہار — پرتوِ خود را دریغ از من مدار

اے کہ تیرا وجود دنیا کے لئے بہارِ نو ہے — اپنے عکسِ نور کو مجھ سے دور نہ رکھ

خود بدانی قدرِ تن از جاں بود — قدرِ جاں از پرتوِ جانان بود

تو خود جانتا ہے کہ جسم کی قدر جان سے ہے — اور پھر جان کی قدر محبوب کے عکس سے ہے

تا ز غیر اللہ ندارم ہیچ امید — یا مرا شمشیر گرداں یا کلید

میں غیر اللہ سے کوئی توقع نہیں رکھتا — لہذا یا تو مجھے تلوار بنا دے یا چابی

فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چست — تخمِ کردارے ز خاکِ من نرست

اگرچہ میری فکر فہمِ دین میں چالاک و چست ہے — لیکن میری خاک سے کسی عمل کا بیج نہ پھوٹا

تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من — محنتے دارم فزوں از کوہکن

پس اب میرے تیشے کو تیز تر کر دے کہ میں — کوہکن سے بھی زیادہ محنت طلب کام رکھتا ہوں

مومنم، از خویشتن کافر نیم

آخر میں مومن ہوں اور اپنی ممکنات سے منکر نہیں ہوں

بر فسانم زن کہ بد گوہر نیم

مجھے سنگِ فساں پر تیز کر دے کہ میری تلوار کا لوہا ناقص نہیں ہے

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است — چیزکے دارم کہ نامِ او دل است

اگرچہ میری عمر کی کھیتی بے حاصل ہے — لیکن ایک چھوٹی سی چیز رکھتا ہوں جس کا نام دل ہے

دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں — کز سمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

میں اسے دنیا کی آنکھ سے پوشیدہ رکھتا ہوں — کیونکہ وہ اپنے اندر تیرے گھوڑے کے سم کا نشان رکھتا ہے

(بقیہ صفحہ ۱۵۷) شب کا مفہوم ہوا باطل کے پجاری۔

بندہ راکو نخواہد ساز و برگ — زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ

وہ بندۂ حق جو دنیوی ساز و سامان نہ چاہتا ہو — اس کے لئے بے حضوریٔ آقا زندگی بھی موت ہے

اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب — بندۂ خود را حضورِ خود طلب

اے کہ جس نے کُرد کو بھی سوزِ عرب عطا کیا — اپنے غلام کو اپنے دربار میں طلب فرما۔

بندۂ چوں لالہ داغے در جگر — دوستانش از غمِ او بے خبر

وہ غلام جو جگر میں لالہ کے سے داغ رکھتا ہو — اور جس کے دوست اس کے غمِ پنہاں سے بے خبر ہیں

بندۂ اندر جہاں نالاں چوں نے — تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے

وہ بندہ جو دنیا میں بنسری کی طرح نالاں ہے۔ — اور مسلسل نغمات درد سے اس کی جان جل اٹھی ہے

در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز — کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز

ایک جنگل میں آدھی جلی ہوئی لکڑی کی طرح — میں ابھی جل رہا ہوں اور قافلہ گذر بھی گیا

اندریں دشت و درے پہناورے — بو کہ آید کاروانے دیگرے

اس توقع میں ہوں کہ اس وسیع جنگل میں — ممکن ہے کہ کوئی اور قافلہ آ وارد ہو

جاں ز مہجوری بنالد در بدن — نالۂ من وائے من! اے وائے من! (پس چہ باید کرد

میری روح جسم میں دردِ فراق سے نالاں ہے — اور میری فریاد یہ ہے کہ صد افسوس میری دوری و مجبوری

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست

ہر وہ شخص جس کا ساز و سامان صرف عشقِ مصطفےٰ ہے

بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست (پیامِ مشرق)

بحر و بر اس کے گوشۂ دامن میں پوشیدہ ہیں

بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام　　سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

میں تیری دہلیز کی خاطر ہندوستان سے لیکر آیا ہوں　　وہ سجدۂ شوق جو میری پیشانی میں خون ہو کر رہ گیا

تیغِ لا[1] در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ دہ　　باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّائے من

پہلے اس پرانے کافر کے ہاتھ میں ذرا تیغ لا تو دے　　پھر دنیا میں میرے ہنگامۂ الّا کے تاثرات دیکھ

گردشے باید کہ گردوں از ضمیرِ روزگار　　دوشِ من باز آرد اندر کسوتِ فردائے من

کوئی ایسی گردشِ عمل چاہیے کہ آسمان ضمیرِ روزگار سے　　میرے گذشتہ کل کو آئندہ کل کے لباس میں واپس لے آئے

از سپہرِ بارگاہت یک جہاں وافر نصیب　　جلوۂ داری دریغ از وادیٔ سینائے من

یہ آسمانِ بارگاہ سے مجھے ایک اور دنیا نصیب　　کیا تو میری وادیٔ سینا سے اپنی تجلی کو چھپا رہا ہے

با خدا در پردہ گویم، با تو گویم آشکار

خدا سے تو میں در پردہ باتیں کرتا ہوں لیکن تجھ سے کھلم کھلا

یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من　(پیامِ مشرق)

یا رسول اللہ! وہ تو پوشیدہ ہے اور آپ میرے لئے ظاہر

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست

میرا جسم تو تھک کر رہ گیا لیکن روح رواں دواں ہے

سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست

اس شہر کی طرف جس کے راستے میں مکّہ ہے

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز

تو یہیں ٹھہر اور اپنے خاص دوستوں کے ساتھ عیش کر

کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست　(ارمغانِ حجاز)

کہ میں تو منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں

---

[1] نفیِ غیر اللہ۔

با ایں پیری رہِ یثرب گرفتم

اس بڑھاپے میں میں نے مدینے کا راستہ اختیار کیا

نوا خواں از سرودِ عاشقانہ

اور سرودِ عاشقانہ میں نغمہ سرا رہا

چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام

اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت

کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ (ارمغان حجاز)

آشیانے میں پہنچنے کے لئے اپنے پر کھولتا ہے

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو

صبح میں نے اونٹنی سے کہا کہ ذرا آہستہ چل

کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است

کیونکہ تیرا سوار تھکا ہوا بھی ہے بیمار اور بوڑھا بھی

قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی

یہ سن کر اس نے قدم اور بھی مستانہ وار اٹھائے کہ گویا

بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است (ارمغان حجاز)

اس کے پاؤں کے نیچے صحرا کی ریت ریشم کی طرح نرم ہے

مہارا اے ساربان او را نشاید

اے ساربان! اس اونٹنی کی ناک میں مہار نہیں چاہیئے

کہ جانِ او چو جانِ ما بصیر است

کیونکہ اس کی روح بھی ہماری روح کی طرح دیدارِ محبوب کرتی ہے

من از موجِ خرامش می شناسم

میں تو اس کے اندازِ رفتار سے یہ اندازہ کر رہا ہوں

چو من اندر طلسمِ دل اسیر است (ارمغان حجاز)

کہ وہ میری طرح دل کے جادو میں اسیر ہے

نمِ اشک است در چشمِ سیاہش

اونٹنی کی چشمِ سیاہ میں آنسوؤں کی نمی موجود ہے

دلم سوزد ز آہِ صبح گاہش

اس کی آہِ صبح سے میرا دل بھی جل رہا ہے

ہماں مے کو ضمیرم را برافروخت

وہی شرابِ عشق جس نے میری ضمیر کو اس قدر روشن کیا ہے

پیاپے ریزد از موجِ نگاہش (ارمغان حجاز)

اس کی موجِ نگاہ سے پے در پے ٹپک رہی ہے

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است

مبارک ہے وہ صحرا جس کی شام بھی صبح خند ہے

شبش کوتاہ و روزِ او بلند است

اس کی راتیں چھوٹی ہیں اور دن بڑے

قدم اے رہروِ آہستہ تر نہ

اے راہروِ حجاز! قدم ذرا آہستہ رکھ

چو ما ہر ذرۂ او دردمند است (ارمغان حجاز)

کیونکہ ہماری طرح صحرا کا ہر ذرہ بھی دردمند ہے

مقامِ عشق و مستی منزلِ اوست

اس رسولِ برحق کی منزل مقامِ عشق و مستی ہے

چہ آتش ہا کہ در آب و گلِ اوست

اس کے آب و گل میں ناقابلِ تصور آگ پنہاں ہے

نوائے او بہ ہر دل سازگار است

اس کی صدائے حیات افروز ہر دل کو سازگار ہے

کہ در ہر سینہ قاشے از دلِ اوست (ارمغانِ حجاز)

کیونکہ ہر سینے میں اس کے دل کی ایک قاش موجود ہے

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم

اے ہم نفس آ کہ ہم مل کر روئیں

من و تو کشتۂ شانِ جمالیم

میں اور تو دونوں اس کی شانِ جمال کے شہید ہیں

دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم

ہم اس کے حضور اپنی مرادِ دل کے دو حرف کہیں

بپائے خواجہ چشماں را بمالیم (ارمغانِ حجاز)

اور آقا کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملیں

حکیماں را بہا کمتر نہادند

دربارِ رسول میں بڑے بڑے فلسفیوں کی کوئی قیمت نہ پڑی

بناداں جلوۂ مستانہ دادند

لیکن مجھ جیسے نادان کو جلوۂ مستانہ عطا کیا گیا

چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے
یہ کتنی خوش نصیبی ہے اور کتنا مبارک زمانہ ہے
درِ سلطاں بہ درویشے کشادند (ارمغانِ حجاز)
کہ ایک درویش پر شاہِ دوجہاں کا دروازہ کھول دیا گیا

دریں وادی زمانی جاودانی
وادیِ رسولؐ میں فانی لوگ بھی جاودانی ہو جاتے ہیں
زخاکش بے صور روید معانی
اس کی خاک سے بغیر صورتوں کے حقائق و معانی پیدا ہوتے ہیں
حکیماں با کلیماں دوش بر دوش
اس جگہ صاحبِ حکمت لوگ کلیموں کے دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں
کہ ایں جا کس نگوید لن ترانی[1] (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ یہاں کوئی شخص "لن ترانی" کا دعویٰ نہیں کرتا

مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے
مسلمان وہ روایتی طور پر غیرت مند خوددار ہے
رمید از سینۂ او سوزِ آہے
جس کے سینے سے آج سوزِ آہ رخصت ہو چکا ہے

---

[1] جب حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر دیدارِ الٰہی کا مطالبہ کیا تھا تو جواب ملا لن ترانی یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ فرماتے ہیں کہ دیارِ رسولؐ میں ایسا مایوس کن جواب نہیں دیا جاتا بلکہ دعوتِ دیدار عام ہے۔

دلش نالد! چرا نالد؟ نداند
اس کا دل روتا ہے۔ اور کیوں روتا ہے؟ یہ وہ جانتا ہی نہیں
نگاہے یا رسول اللہ نگاہے (ارمغانِ حجاز)
یا رسول اللہ! ایسے حال میں ایک نگاہ لطف فرمائیے!

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست
تیرے ہی غم سے میرے دل کی حرارت و روشنی ہے
نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
اور میری آواز بھی تیرے دم کی تاثیر سے پیدا ہوئی ہے
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
میں اس بنا پر آہ و نالہ کر رہا ہوں کہ ملکِ ہند میں
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست (ارمغانِ حجاز)
میں نے ایک شخص بھی ایسا نہ دیکھا جو تیرا راز دار ہو

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است
اب بھی اس نیلے آسمان کی رفتار ٹیڑھی ہے
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
اور اب بھی ملت کا قافلہ منزل سے بہت دور ہے
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم
میں اس کے بے تنظیم کاموں کے متعلق کیا عرض کروں

تو می دانی کہ ملت بے امام است (ارمغان حجاز)

آپ خود جانتے ہیں کہ عہد حاضر میں قوم بے امام ہے

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است

بادشاہت تو سرتا پا شیشہ بازی کا کھیل ہے

از و ایمن نہ رومی نے حجازی است

اور اس کے ظلم و استبداد سے نہ رومی محفوظ ہے نہ حجازی

حضورِ تو غمِ یاراں بگویم

یارسول اللہ! میں آپ کے حضور دوستوں کا غم بیان کرتا ہوں

باُمیدے کہ وقت دل نوازی است (ارمغان حجاز)

اس امید پر کہ مدد اور حوصلہ افزائی کا وقت یہی ہے

بچشمش وا نمودم زندگی را

میں نے مسلمان کی آنکھ پر اسرار زندگی روشن کر دیئے

کشودم نکتۂ فردا و دی را

اور آئندہ کل اور گذشتہ کل کا نکتہ واضح کر دیا

تواں اسرارِ جاں را فاش تر گفت

لیکن ہنوز اسرار روح کو زیادہ واضح اور نمایاں کیا جا سکتا ہے

بدہ نطقِ عرب ایں اعجمی را (ارمغان حجاز)

آپ مجھ عجمی کو عرب کی قوتِ گویائی عطا فرما دیں

دگرگوں کرد لادینی جہاں را
لادینی نے دنیا کی حالت ہی کچھ اور کر دی

ز آثارِ بدن گفتند جاں را
اور لوگ روح کو آثارِ جسم کا درس دینے لگے

ازاں فقرے کہ با صدیقؓ دادی
آپؐ نے جو فقر ابوبکر صدیقؓ کو عطا فرمایا تھا

بشورے آور ایں آسودہ جاں را (ارمغانِ حجاز)
اسی سے میری خاموش و آسودہ روح میں بھی شورش پیدا کیجئے

بدستِ مے کشاں خالی ایاغ است
مے کشوں کے ہاتھ میں پیالے بالکل خالی ہیں

کہ ساقی را بہ بزمِ من فراغ است
کیونکہ میری محفل میں ساقی کو چھٹی دے دی گئی ہے

نگہ دارم درونِ سینہ آہے
میں اپنے سینہ میں وہ آہ محفوظ کئے ہوئے ہوں

کہ اصلِ او ز دودِ آں چراغ است (ارمغانِ حجاز)
جس کی بنیاد چراغِ رسولؐ کے دھوئیں سے ہے

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم
آپؐ نے جو پر مجھے عطا کئے ہیں ان سے اڑتا رہا

بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم

اور میں اپنے نغموں کے سوز سے تڑپ گیا

مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد

وہ مسلمان جس سے موت بھی خائف و لرزاں رہتی ہے

جہاں گردیدم و او را ندیدم (ارمغانِ حجاز)

میں تمام دنیا میں گھوما مگر اسے کہیں نہ دیکھا

زسوزِ ایں فقیرِ رہ نشینے

اس فقیرِ راہ نشیں کے سوز و درد سے

بدہ او را ضمیرِ آتشینے

مسلمان کو ایک آتشیں ضمیر عطا فرمائیے

دلش را روشن و پایندہ گرداں

اور اس کے دل کو زیادہ روشن و پائدار کیجئے

زامیدے کہ زاید از یقینے (ارمغانِ حجاز)

اس امید سے جو قوتِ یقین سے پیدا ہوتی ہے

گہے افتم گہے مستانہ خیزم

میں کبھی تو گرتا ہوں اور کبھی مستانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہوں

چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم

اور کتنے ہی خون تیغ و شمشیر کے بغیر گراتا ہوں۔

نگاہِ التفاتے بر سرِ بام
اپنے بامِ بلند سے مجھ پر ایک نگاہِ لطف ڈالیئے
کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ میں اپنے باطل پرست زمانے سے برسرِ جنگ ہوں

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند
میں نے جو راز بیان کیا مسلمانوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا
زِ شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
اور میرے نخل کی شاخ سے کھجوریں نہ کھائیں
من اے میرِ امم داد از تو خواہم
اے امتوں کے امام و پیشوا میں آپ سے داد چاہتا ہوں
مرا یاراں غزل خوانے شمردند (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ دوستوں نے مجھے محض ایک غزلخواں سمجھا

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
میرے لئے تنہائی اور آہ و فغاں ہی بہتر ہے
سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
اور مدینہ کی طرف بے قافلہ سفر خوب ہے
کجا مکتب، کجا میخانۂ عشق
کہاں مدرسہ اور کہاں عشق و محبت کا میخانہ

تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ (ارمغانِ حجاز)

آپ ہی فرمائیے کہ میرے لیئے یہ بہتر ہے یا وہ؟

خودی دادم ز خود نا محرمے را

اپنے سے غافل و بیخبر لوگوں کو میں نے ذوقِ خودی دیا

کشادم در گِلِ او زمزمے را

اور میں نے مسلمانوں کے دل میں چشمۂ زمزم جاری کردیا

بدہ آں نالۂ گرمے کہ از وے

آپؐ مجھے وہ نالۂ گرم مرحمت فرمائیں

بسوزم جز غمِ دیں ہر غمے را (ارمغانِ حجاز)

جس سے غمِ دین کے علاوہ ہر غم کو جلا ڈالوں

درونِ ما بجز دودِ نفس نیست

ہمارے سینوں میں سانس کے دھوئیں کے سوا کچھ نہیں

بجز دستِ تو مارا دسترس نیست

اور آپؐ کے دستِ مبارک کے علاوہ ہمارا کوئی سہارا نہیں

دگر افسانۂ غم با کہ گویم

پھر میں اپنا افسانۂ غم کس کے سامنے بیان کروں

کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست (ارمغانِ حجاز)

جبکہ سینوں میں بھی آپ کے سوا کوئی نہیں بستا

غریبے دردمندے نے نوازے
مجھ جیسا غریب دردمند اور عاشق نغمہ سرا

زسوزِ نغمۂ خود در گدازے
جو اپنے سوزِ نغمہ ہی سے پگھلا جا رہا ہے

تو می دانی چہ می جوید چہ خواہد
آپ خود جانتے ہیں کہ کیا ڈھونڈتا ہے اور کیا چاہتا ہے؟

دلے از ہر دو عالم بے نیازے (ارمغانِ حجاز)
وہ دل جو ہر دو جہان سے بے نیاز ہو!

نم و رنگ از دمِ بادے نجویم
میں ہوا کے سانس سے نمی اور رنگ کی جستجو نہیں کرتا

زفیضِ آفتابے تو بروہم
بلکہ میں تو آپ کے آفتاب کی برکت سے اگتا ہوں

نگاہم از مہ و پروین بلند است
میری نگاہ ماہ و پروین سے بھی بلند رہتی ہے

سخن را بر مزاجِ کس نگویم (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ میں کسی کے مزاج کا محکوم ہو کر بات نہیں کرتا

درآں دریا کہ اورا ساحلے نیست
اس دریائے عشق میں جس کا کوئی ساحل ہی نہیں

دلیل عاشقاں غیر از دلے نیست
عاشقوں کا رہنما ایک دل کے سوا اور کوئی نہیں
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
آپ نے فرمایا تو ہم نے بطحا کی راہ بھی اختیار کر لی
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست (ارمغان حجاز)
ورنہ آپ کے سوا ہماری کوئی منزل نہیں ہے

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم
ہمیں اپنے دروازے سے دور نہ ہٹایئے کہ ہم حضور کے مشتاق ہیں
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
اور جو دردِ عشق آپ نے عطا فرمایا اس سے بے صبر ہیں
بفرما ہر چہ می خواہی بجز صبر
آپ صبر کے علاوہ ہمیں ہر دوسری چیز کا حکم دیں
کہ ما از وے دو صد فرسنگ دوریم (ارمغان حجاز)
کیونکہ ہم صبر سے تو دو سو فرسنگ دور ہیں۔

فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم
میں آپ کا فقیر ہوں اور جو کچھ چاہتا ہوں صرف آپ سے چاہتا ہوں
دلِ کوہے خراش از برگِ کاہم
آپ میرے برگِ کاہ سے پہاڑ کے دل کو زخمی کر دیں

مرا درس حکیماں دردِ سر داد
فیلسوفوں کے درس نے تو میرے سر میں درد پیدا کیا
کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ میں صرف حضور کے فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں

نہ با ملا نہ با صوفی نشینم
میں نہ تو ملا کے پاس بیٹھتا ہوں نہ صوفی کے پاس
تو می دانی کہ من آنم نہ اینم
آپ جانتے ہیں کہ میں نہ تو وہ ہوں اور نہ یہ
نویس "اللہ" بر لوحِ دلِ من
بس آپ صرف لفظِ اللہ میری لوحِ دل پر لکھ دیں
کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم (ارمغانِ حجاز)
تاکہ میں خود کو بھی روشن اور واضح طور پر دیکھوں اور خدا کو بھی

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست
ابھی میری خاک میں کچھ شرر پنہاں ہیں
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست
اور ابھی یہ سینہ آہِ سحر پیدا کر سکتا ہے
تجلی ریز بر چشمم کہ بینی!
آپ میری آنکھ پر اپنی تجلی ڈالیں تاکہ آپ دیکھیں

بایں پیری مرا تابِ نظر ہست (ارمغانِ حجاز)

کہ اس بڑھاپے میں بھی میں تابِ نظر رکھتا ہوں۔

بچشمِ من نگہ آوردۂ تست

میری آنکھ میں نگاہ آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے

فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست

اور دل میں نورِ لا الٰہ بھی آپ ہی کا عطا کردہ ہے

دو چارم کن بہ صبحِ "من رآنی"[1]

آپ مجھے صبحِ من رآنی سے پھر دو چار کریں

شبم را تابِ مہ آوردۂ تست (ارمغانِ حجاز)

میری رات میں چاند کی روشنی آپ ہی کی لائی ہوئی ہے

چو خود را در کنارِ خود کشیدم

جب میں نے خود کو اپنی آغوش میں سنبھالا

بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم

تو آپ کے نور سے میں نے اپنا مقام دیکھا

دریں دیر از نوائے صبح گاہی

دنیا کے بت خانے میں نوائے صبح کے اثر سے

---

[1] مَنْ رَآنِی فَقَدْ رَأَ اللہ (حدیث) "جس نے مجھے دیکھا اس نے گویا خدا کو دیکھا" یہ اس لحاظ سے کہ رسولِ اکرمؐ صفات و اخلاقِ الٰہی کے مظہرِ اتم ہیں۔

جہانِ عشق و مستی آفریدم (ارمغانِ حجاز)
میں نے ایک جہانِ عشق و مستی پیدا کیا

بیا ساقی بگرداں جامِ مے را
اے ساقیِ یثرب! آ اور جامِ مئے عشق کو گردش دے
ز مے سوزندہ تر کن سوزِ نے را
اور اس شراب سے میرے سوزِ نغمہ میں اضافہ کر
دگر آں دل بنہ در سینۂ من
ایک بار پھر میرے سینہ میں وہ دل رکھ دے
کہ پیچم پنجۂ کاؤس و کے را (ارمغانِ حجاز)
جس کی قوت سے میں کاؤس و کیقباد کا پنجہ مروڑ دوں

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
دنیا تو عشق سے پیدا ہوئی اور عشق آپ کے سینہ سے
سرورش از مئے دیرینۂ تست
اور عشق کا سرور سراسر آپ کی پرانی شراب سے ہے
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل
میں جبریل کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست (ارمغانِ حجاز)
کہ وہ بھی آپ کے آئینہ کا ایک جوہر ہے

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تست

میرے دل کا سوز آپ ہی کے دم کا فیض ہے

بتاکم موجِ مے از زمزمِ تست

اور میری بیل میں موجِ شراب آپ ہی کے زمزم سے آئی ہے

خجل ملکِ جم از درویشیِ من

ملکِ جمشید بھی میری درویشی سے شرمندہ ہو رہا ہے

کہ دل در سینۂ من محرمِ تست (ارمغان حجاز)

کیونکہ میرے سینہ میں دل آپ کا راز دار ہے

بصدقِ فطرتِ رندانۂ من

میری فطرتِ رندانہ کی صداقت و حقانیت سے

بسوزِ آہِ بے تابانۂ من

اور میری آہِ بے تاب کے سوز و اثر سے

بدہ آں خاک را ابرِ بہارے

خاکِ ملت پر وہ ابرِ بہار بھیجئے

کہ در آغوش گیرد دانۂ من (ارمغانِ حجاز)

کہ وہ میرے دانوں کو اپنی آغوش میں سنبھال لے

دلے برکف نہادم دلبرے نیست

میں نے اپنا دل ہتھیلی پر رکھ دیا مگر کوئی دلبر ہی نہیں

متاعے داشتم، غارت گرے نیست

میں سازوسامان تو رکھتا تھا مگر اسے لوٹنے والا ہی نہیں

درونِ سینۂ من منزلے گیر

آپ میرے سینہ کو اپنی منزل بنا لیں

مسلمانے زمن تنہا ترے نیست (ارمغان حجاز)

کیونکہ کوئی مسلمان مجھ سے زیادہ تنہا نہیں

گلستانے ز خاکِ من برانگیز

آپ میری خاک سے ایک گلستان پیدا کریں

نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز

اور میری آنکھ کے آنسوؤں کو خونِ لالہ میں ملا دیں

اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را

اگر میں تیغِ علیؓ کے قابل نہیں ہوں

نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز (ارمغان حجاز)

تو مجھے شمشیرِ علیؓ کی طرح تیز نگاہ تو عطا فرمائیے

ز بحرِ خود بجوئے من گہر دہ

آپ اپنے سمندر سے میری ندی میں موتی ڈالیں

متاعِ من بکوہ و دشت و در دہ

اور میرے سامان کو پہاڑوں جنگلوں اور آبادیوں میں بکھیر دیں

دلم نگشود ازاں طوفاں کہ دادی
جو طوفان آپ نے مجھے دیا اس سے دل کی خاطر خواہ کشود نہ ہوئی
مرا شورے ز طوفانے دگر دہ (ارمغانِ حجاز)
لہٰذا مجھے کسی اور طوفان سے شور و ہنگامہ مرحمت فرمائیں

بنورِ تو برافروزم نگہ را
میں آپ ہی کے نور سے نگاہ کو روشن کرتا ہوں
کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
تاکہ سورج اور چاند کی باطنی کیفیت کو بھی دیکھ سکوں
چو می گویم مسلمانم، بلرزم
جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو لرز اٹھتا ہوں
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ میں لا الٰہ کی عملی مشکلات کو خوب جانتا ہوں

بکوئے تو گدازِ یک نوا بس
آپ کے کوچے میں تو ایک آواز کا گداز ہی کافی ہے
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
اور میرے لئے تو یہ ابتدا اور یہ انتہا کافی ہے
خراب جرأت آں رندِ پاکم
میں اس رندِ پاک باطن کی جرأت کا مستانہ ہوں

خدا را گفت مارا مصطفےٰ بس (ارمغانِ حجاز)
جس نے خدا سے کہا کہ مجھے تو مصطفےٰ ہی کافی ہے

کشادم پردہ را از روئے تقدیر
میں نے تقدیر کے چہرے سے پردہ اٹھا یا
مشو نومید و راہِ مصطفےٰ گیر
اے مسلمان! ناامید نہ ہو اور راہِ مصطفےٰ پر چل
اگر باور نداری آنچہ گفتم
جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اگر تجھے اس پر یقین نہ ہو
ز دیں بگریز و مرگِ کافرے میر (ارمغانِ حجاز)
تو دینِ مصطفےٰ سے گریز کر اور ایک کافر کی موت مر

محبت از نگاہش پائدار است
محبت رسولِ برحق کی نگاہ سے پائدار ہے
سلوکش عشق و مستی را عیار است
اور اس کا راستہ عشق و مستی کا صحیح معیار ہے
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
اس کا مقام تو عبدہٗ بیان کیا گیا لیکن
جہانِ عشق را پروردگار است (ارمغانِ حجاز)
اس کی ذات جہانِ عشق کی پروردگار ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا　　　رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا　　　نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو　　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے　　　بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے　　　اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک[1] دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں، یعنی وہ کالی دنیا　　　وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا　　　عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری　　　مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری　　　تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

---

[1] "اے پیغمبرؐ! ہم نے دونوں جہانوں میں تیرا ذکر بلند کر دیا۔" (قرآن)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں (بانگِ درا)

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ (بالِ جبریل)

اقبالؒ اور مذمّتِ تقلید

حلقۂ شوق میں وہ جراَتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!

اقبالؒ

اقبالؒ اور مذمّتِ تقلید

میں نے گذشتہ مضمون میں "عشقِ رسول" کو "اتباعِ رسول" کے مفہوم میں لیتے ہوئے موضوع کے ہر ممکن پہلو کو حتی الوسع روشن و واضح کیا تھا لیکن اگر میں اس عنوان کے فوری بعد "تقلید" کی مذمّت نہیں کرتا، جس کی تردید و مذمّت سے قرآن و حدیث معمور ہیں، تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ میں نے "عشق رسول" کا موضوع بھی تشنہ و نامکمل چھوڑ دیا۔ خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ "تقلید" بذاتِ خود مقامِ رسولؐ، احترامِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ پر ایک جا ہلانہ اور خطرناک حملہ ہے۔ بالفاظ دیگر "تقلید" اور اتباعِ اسوۂ رسول قطعی طور پر مخالف متضاد چیزیں ہیں اور ان کا اجتماع اسی طرح ناممکن ہے جس طرح حق اور باطل اجتماع۔ میں آئندہ چل کر اس مفہوم کی مزید وضاحت کروں گا۔ فی الحال مجھے س قدر کہنا ہے کہ علامہ اقبالؒ جیسی عالم تبحر، صاحبِ معرفت و بصیرت اور اشقِ رسولؐ ہستی کورانہ تقلید کی نہایت دشمن ہے اور اسے عشقِ رسولؐ

کے منافی سمجھتے ہوئے مسلمانوں کے حق میں بدترین قسم کی ضلالت و محرومی قرار دیتی ہے۔ میں ابتداً قرآن و حدیث کی روشنی میں اس موضوع کی ضروری مبادیات بیان کروں گا۔ تاکہ تاثراتِ اقبال کے صحیح اور حق بجانب ہونے میں یہ دلائل و براہین آپ کی رہنمائی کر سکیں۔

کتابِ کامل، دینِ کامل اور رسولِ کامل

یہ چیز ہر صحیح العقیدہ مسلمان کے نزدیک مسلّم ہے۔ کہ جو آسمانی کتاب امتِ محمدیہ کو تفویض کی گئی۔ وہ انسان کی دنیوی و اُخروی فلاح و بہبود کے لیے مکمل ترین کتاب ہے، جو دین (اسلام) عطا کیا گیا۔ وہ ہر جہت سے مکمل ترین دین ہے اور اسی طرح جو رسولِ برحق اس امت کا قائد و رہبر بنا، وہ بھی اپنے فہم و شعور، علم و دانش، راست بازی اور حسنِ عمل کے لحاظ سے ایک رسولِ کامل تھا اور اس لیے اس نے اپنے فرائضِ قیادت کما حقہٗ ادا کر دیئے۔ پس کتابِ کامل دینِ کامل اور رسولِ کامل کی شانِ تکمیل پر خود کلام اللہ کی گواہی بھی بغور ملاحظہ فرمائیے۔ تکمیلِ قرآن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ کَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ۝ (پ ۱۵ : ۲۰ ع)	ہم نے اس قرآن میں لوگوں (کی فلاح و بہبود) کے لئے ہر طرح کی مثالیں بار بار بیان کی ہیں مگر انسان (کی کج فہمی و کوتاہ اندیشی کا عالم یہ ہے کہ) اکثر چیزوں کی صداقت و معقولیت پر (بلا وجہ) بحث کرتا ہے۔
مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ	قرآن کوئی مصنوعی اور خود ساختہ بات نہیں ہے، بلکہ وہ سابقہ کتب سماوی کی

بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (پ ۱۳ : ۶ ع ۱)	تصدیق کرنے والا ہے۔ تمام چیزوں کو تفصیل و تشریح سے بیان کرنے والا ہے اور ایمانداروں کے لئے سراپا ہدایت و رحمت ہے۔

بعد ازاں "تکمیلِ دین" کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ (پ ۶ : ۵ ع)	آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اپنی تمام (روحانی واخلاقی) نعمتیں تم پر تمام کر دیں اور دینِ اسلام کو تمہارے لئے پسند کر لیا۔[1]

اور پھر "تکمیلِ نبوت و رسالت" کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝	اے پیغمبر! ہم نے تجھے ہر دو جہان کے لئے (سراپا) رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (پ ۲۲ : ۹ ع)	اے پیغمبر! ہم نے تجھے تمام دنیا کے لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ (تیرے اس مقامِ نبوت سے) جاہل و بے خبر ہیں۔

---

[1] یعنی تمہاری دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لئے اسلام کو معین و منتخب کر لیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝

(پ ۲۱ : ۱۹ ع)

جو شخص رضائے الٰہی کی آرزو، اور روزِ قیامت (نجات) کی توقع رکھتا ہو اور کثرت سے ذکرِ حق بھی کرتا رہتا ہو، اس کے لئے رسول اللہ کی زندگی ایک موزوں ترین اور بہترین عملی نمونہ ہے۔

کیا کتاب اللہ اور اسوۂ حسنہ میں کوئی کمی یا خامی ہے؟

ان تمام حقائق وشواہد کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حیاتِ انسانی کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ میں کسی قسم کی کمی یا خامی بھی ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ قطعاً کوئی کمی و خامی نہیں اور اس سوال کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ حضرات! ضرورت یوں پیش آئی کہ مسلمانوں کی اکثریت لاعلمی، غلط قیادت، جاہلانہ تقریر و تحریر، نیم ملاؤں کے گمراہ کن خطبات، اور فرقہ دارانہ عقائد و تصورات کی کش مکش میں مبتلا ہو کر وقت کے بے سند رسم و رواج، لغو و تباہ کن عادات و اطوار، بدعات و خرافات اور نفاق انگیز توہمات میں تو ضرور محصور و مقید ہے۔ لیکن صحیح و مستند تعلیماتِ قرآنی اور طریقِ سنتِ رسولؐ سے کوسوں دور ہے!

اور جب ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ رسول اکرم نے قرآنِ مجید کی تعلیمات کو بہترین، موزوں ترین اور مکمل ترین طریق پر عملی جامہ پہناتے ہوئے امت کے لئے ایک ایسا اسوۂ حسنہ، یا حسین و جمیل "نمونہ"، قائم کیا جس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں اور جو تا قیامت "ناقابلِ ترمیم" اور "ناقابلِ تغیر" طور پر ہمارے لئے

ایک معیّن دستورِ عمل ہے، شمع ہدایت ہے، تو پھر اس اسوۂ حسنہ سے غفلت و روگردانی اختیار کرتے ہوئے، دیگر پیروں، فقیروں، مولویوں اور اماموں کی کورانہ تقلید کیوں اختیار کی جاتی ہے؟ ان مسلمانوں کے درمیان، جو ایک ہی خالق و مالک، ایک ہی معبود، ایک ہی رسول، ایک ہی کتاب مقدس اور بنیادی طور پر ایک ہی عقیدہ و مسلک رکھتے ہیں، ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کا بازار کیوں گرم ہے؟ یہ بے شمار فرقے اور گروہ کہاں سے آئے؟ جب آپ کے روحانی باپ ابراہیم علیہ السلام نے فیصلہ کن طور پر آپ کا نام صرف "مسلمان"[1] رکھ دیا ہے، تو پھر آپ کو حنفی، وہابی، شیعہ، احمدی، مالکی، حنبلی، شافعی اور چکڑالوی وغیرہ جیسے مصنوعی اور نفاق انگیز "لیبل" اختیار کرنے کا کیا حق ہے؟ فرمائیے کہ ان کی

---

[1] قرآن مجید میں امت مسلمہ کے لئے نہ صرف "مسلمان" ہی کا عنوان ہمیشہ کے لئے معین و منتخب کر لیا گیا بلکہ اس امت کو میانہ روی اور سلامتی فکر و عمل کی وجہ سے تمام دیگر امتوں کی رہنما اور شاہدِ عادل بھی قرار دیا گیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس امت نے تقلید و فرقہ بندی کی وجہ سے اپنی وحدت و جمعیت کو از خود پارہ پارہ کر کے "مسلمان" کا ازلی خطاب بھی عملاً برباد کر دیا اور قیادت و رہبری کا حق بھی کھو دیا۔ ہاں تو دنیا کے موحدِ اعظم اور ہمارے روحانی باپ ابراہیم علیہ السلام نے ہمارا نام "مسلمان" کیونکر تجویز کیا؟ اور ہمیں حق قیادت و سیادت کیونکر ملا؟ اس پر آیۂ ذیل شاہد ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۚ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۚ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ

(مسلمانو) طاعت الٰہی اور رضا کے حق میں اپنی طرف سے کوشش کا حق ادا کر دو۔ اس نے تمہیں (تبلیغ و اتباع حق کے لئے) چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی دشواری نہیں رکھی۔ یہ دین (اسلام) تمہارے

باقی بر صفحہ ۱۹۰

اجازت اللہ نے دی ہے، یا اس کے رسولؐ نے؟ یا کسی امام و بزرگ نے؟ ——
وہ تمام امام اور بزرگ جن کی آپ نے کورانہ تقلید اختیار کر رکھی ہے، اور ان کے علاوہ بھی اُمت کے تمام بزرگ، امام اور اولیاء اللہ عمر بھر چلا چلا کر مسلمانوں کو یہی تاکید و تلقین کرتے رہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو اپنی ہدایت، و رہبری اور فلاح دارین کے لیے بالکل کافی سمجھو اور محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے "اسوۂ حسنہ" اور "خلقِ عظیم" سے غفلت و کنارہ کشی اختیار کر کے کسی اور شخص کی طرف رجوع نہ کرو خواہ وہ کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو، ہم خود بھی اسی آفتابِ رسالت سے روشن و منور ہیں، اسی خرمن کے خوشہ چین ہیں اور اسی سرچشمۂ حیات سے سیراب ہوئے ہیں، لہٰذا مرکزی اور بنیادی حیثیت میں اسوۂ رسولؐ کو محکم پکڑو، اور وفاداری سے ہمیشہ اسی کی پیروی کرو۔ رحمۃ للعالمین کی سیرتِ طیبہ کا علم اور ان کا مخلصانہ اتباع تمہیں ہر دوسرے شخص کی تقلید سے قطعی طور پر بے نیاز کر دے گا۔"

انتہا یہ ہے کہ خود آنحضرتؐ نے بطورِ وصیت فرمایا کہ "اے مسلمانو! میں تمہارے پاس دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک تم ان کی پیروی کرو گے، ہرگز

بقیہ صفحہ ۱۸۹ ۔

مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

(پ ۱۷ : ۱۷ ع)

باپ ابراہیم کا دین ہے اس نے نزولِ قرآن سے پہلے اور اس کتاب (قرآن) میں بھی تمہارا نام مسلمان رکھ دیا ہے تاکہ روزِ قیامت ہمارا رسول (تکمیل و تبلیغ دین کے لئے) تم پر گواہ ہو اور تم دیگر امتوں (کے طرزِ عمل) پر گواہ ٹھہرو۔

گمراہ نہ ہوگے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری میرا اسوۂ حسنہ۔"

آیاتِ کتاب اللہ اور ارشاداتِ رسول کی رو سے اسلام دنیا کا سادہ ترین، واضح ترین اور آسان ترین دین ہے۔ لیکن آج اس کے فطری اور سیدھے سادے مسائل واعمال عوام الناس کے لئے ایک گورکھ دھندا اور بھول بھلیاں جو بن رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی ہر کس و ناکس کی تقلید، اور جاہل و غیر ذمہ دار ملاؤں کے وعظ ہیں جنہوں نے ذاتی اغراض کے لئے اسلام کے چشمۂ صافی کو مکدر کر دیا۔ اور ناخواندہ و سادہ لوح مسلمانوں کو ایسے فتنہ انگیز تعصبات و تصورات میں مبتلا کیا کہ وہ بلا وجہ ایک دوسرے کو کافر سمجھنے لگے۔

ہر لئیمے راز دارِ دیں شد است — تنگ بر ما رہگذارِ دیں شد است
ہر نا اہل دینِ حق کا راز دار بن بیٹھا ہے — اور اس لئے ہم پر دین کا راستہ تنگ ہو گیا ہے

دینِ حق از کافری رسوا تر است — زانکہ ملا مومنِ کافر گر است
دینِ حق کافری سے بھی زیادہ بدنام ہے — اس کی وجہ یہ ہے کہ ملا کفر کے فتوے لگانے میں بہت تیز ہے

شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است — از نگاہِ او یمِ ما شبنم است
ہماری شبنم ہمارے نقطۂ نظر سے تو سمندر ہے — لیکن ملا کے نقطۂ نظر سے ہمارا سمندر بھی شبنم ہے

از شگرفیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامیں را در خروش
اس قرآن فروش کی عجیب و غریب تاویلات سے — میں نے جبریل کو بھی آہ و فریاد کرتے دیکھا ہے

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزدِ او امّ الکتاب [1] افسانۂ
آسمان سے ماورا کی دنیا سے بالکل غافل و بے خبر ہے — اس کے نزدیک قرآن بھی گویا ایک افسانہ ہے

---

[1] افسانہ اس حیثیت سے کہ ملا کے نزدیک اس کی آیات کا کوئی متعین مفہوم ہی نہیں اور حسب

(باقی صفحہ ۱۹۲)

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی

وہ دینِ نبیؐ کی حکمت سے بالکل بے بہرہ ہے — اور اس کا آسمانِ علم ستاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہے

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

وہ کوتاہ نظر، کور ذوق اور آوارہ خیال ہے — قوم اس کے نفاق انگیز مباحث سے پارہ پارہ ہو چکی ہے

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

ملا کے سامنے تو قرآن کے اسرار و حکم ایسے ہیں — جیسے کسی مادر زاد اندھے کو نورِ آفتاب دکھایا جائے

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد

کافر کا مذہب و مشرب تو فکر و تدبیرِ جہاد بن رہا ہے

دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد (جاوید نامہ)

مگر دینِ ملا یہ ہے کہ خلقِ خدا میں مفت کا فساد برپا کرو

الغرض لاکھ باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو فتنہ و فساد، نفاق واختلاف اور ہر ممکن گمراہی سے محفوظ رہنا ہے تو انہیں چاہیئے کہ تقلید سے بالکل دست بردار، اور تمام درمیانی واسطوں سے بے نیاز ہو کر براہِ راست درگاہ

بقیہ صفحہ ۱۹۱- ضرورت تاویل و تفسیر بازانے بسے وہ انہیں توڑ مروڑ کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

ز من بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را

میری طرف سے صوفی اور ملا کو سلام پہنچے — کہ انہوں نے ہمیں اللہ تعالے کا پیغام پہنچایا

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

لیکن ان کی تاویلات نے تو حیرت میں ڈال دیا — خدا کو، جبرئیل کو اور مصطفےٰ کو

رسول تک پہنچیں اور اس اسوۂ رسولؐ کا مطالعہ و اتباع کریں جس نے بدترین قسم کے کافر و مشرک اور فاسق و فاجر لوگوں کو بہترین قسم کے مومن و موحّد اور راست باز و متقی انسان بنا دیا تھا۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

ترجمہ: "تو خود کو محمد مصطفیٰ کے دربار میں پہنچا کیونکہ دین اسلام کا مستند منبع و مخزن انہیں کی ذات ستودہ صفات ہے اگر تو ان کے قدموں میں نہ پہنچا تو سمجھ لے کہ تیرا عقیدہ و عمل سراپا کفر ہے۔"

قرانِ مجید میں احکام اتباعِ رسولؐ

قرآن مجید میں بے شمار جگہ اتباع رسول اور پیروی اسوۂ حسنہ کی تاکید آئی ہے جس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! اتباع رسولؐ جیسی مستند، معتبر، اور کافی و شافی چیز کے ہوتے ہر دوسری ہستی کی "تقلید" سے کنارہ کش رہو۔ ورنہ تم نہ تو سچے "مومن" سمجھے جاؤ گے اور نہ تمہیں خدا کی محبت و رضا حاصل ہو گی۔ دلائل ملاحظہ ہوں:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۞	(اے پیغمبرؐ!) قسم تیرے پروردگار کی کہ یہ لوگ سچے مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے (تمام) اختلافات و مناقشات کا فیصلہ تجھ سے نہ کرائیں اور پھر تیرے فیصلہ سے ان کے دلوں میں کچھ تنگی وا داسی بھی پیدا نہیں ہونی چاہیئے اور وہ (بخوشی) اسے تسلیم کرلیں۔
(پ ۵: ع ۶)	

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(پ۳ : ع ۱۲)

(اے پیغمبرؐ!) کہیئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میرے نقش قدم پر چلو۔ پھر اللہ بھی تم سے محبت رکھے گا۔ اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝

(پ۵ : ع ۸)

جس نے رسول کی اطاعت کی۔ اس نے بلاشبہ اللہ کی اطاعت کی اور جس نے رسولؐ کی نافرمانی کی، تو پھر ہم نے تجھے ان پر محافظ و نگہبان بنا کے نہیں بھیجا۔

يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝

(پ ۵ : ع ۵)

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو، اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور ان حکام کی اطاعت کرو جو تم میں سے (مومن و متقی) ہوں۔ اور اگر تمہارے درمیان کوئی جھگڑا یا اختلاف پیدا ہو جائے تو (صحیح فیصلے کے لئے) اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور آخری دن (قیامت) پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ طرزِ عمل (تمہارے حق میں) سب سے بہتر ہے۔ اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔

قرآنِ مجید میں مذمتِ تقلید

رسولِ کریم نے منصبِ نبوّت پر فائز ہوتے ہی جب کفّارِ عرب کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دی اور فرمایا کہ کلام اللہ کو غور سے سنو، مخلوق خدا وندوں کو چھوڑ کر صرف ربِّ واحد کی پرستش کرو اور اس نے توحید، تقویٰ اور راستبازی کی جو راہِ حق مجھے سمجھائی، اسی پر پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ تو انہوں نے اپنے نسلی اور تعصباتی غرور میں ہمیشہ یہی جواب۔ دیا کہ ہم صرف تیرے مطالبہ اور تیری خود ساختہ کتاب کے احکام پر اپنے قدیمی معبودوں اور دیوتاؤں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ بلکہ ہمیں جو عقائد اور جو اعمال واشغال اپنے باپ دادا سے بطورِ ورثہ ملے ہیں۔ ہمارے لئے وہی کافی ہیں اور ہم ہمیشہ انہیں کی پیروی کریں گے۔ ہم تیرے مشورے پر اپنے بزرگوں کے مسلک ومشرب سے دست بردار نہیں ہو سکتے"

آنحضرتؐ سے پیشتر بھی تمام انبیاء کو مشرکینِ وقت نے ہمیشہ اسی قسم کا جواب دیا اور فہم وشعور کو استعمال کرنے، حواس سے صحیح کام لینے، اور حق کی تحقیق وجستجو کرنے کی بجائے ہمیشہ تقلیدِ آباؤ اجداد ہی کو اپنا ذریعۂ نجات سمجھا۔ چنانچہ حق وباطل کے تصادم، صدق وکذب کی باہمی آویزش، خیر وشر کی جنگ اور تقلید واجتہاد کے مسلسل مقابلہ نے نتیجہ کار یہ ثابت کر دیا کہ مقلّدین راہ باطل اختیار کیئے ہوتے تھے اور فہم وشعور سے کام لینے والے متلاشیانِ حق فی الواقع راہِ حق پر گامزن تھے۔

قرآنِ مجید کی اکثر آیات میں ضد اور ہٹ دھرمی سے مسلکِ اجداد اختیار کرنے والے مقلّدین کے عقائد بھی بیان کئے گئے ہیں اور پھر شدّت سے ان کی تردید بھی کی گئی ہے مثال کے طور پر یہ تین چار آیات ملاحظہ ہوں:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ — اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے

اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

(پ ۲ : ۲۱ ع)

اتارے ہوئے (مستند، اوامر و نواہی) پر عمل کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں صاحب ہم تو اس طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو چلتے ہوئے پایا۔ بھلا (پوچھو تو) اگر ان کے بزرگ (باپ دادا) خود ہی محروم عقل و شعور اور گمراہ ہوں (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے؟)

(پ ۲ : ۲۱ ع)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

(پ ۷ : ۱۴ ع)

اور جب ان (کفار و مشرکین سے) کہا جاتا ہے کہ (اپنے عقائد و اعمال کی صحیح رہبری کے لئے) اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب (قرآن مجید) اور اس کے پیغمبر برحق کی طرف رجوع کرو۔ تو کہتے ہیں ہمارے لئے تو وہی دستورِ زندگی از بس کافی ہے۔ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا (پوچھو تو) اگر ان کے باپ دادا بالکل بے علم اور گمراہ ہوتے (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے؟)

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ

اور (اے پیغمبرؐ) اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے بھی جب کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا (پیغمبر)

إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ۝ قُلْ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ ۖ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝

(پ ۲۵: ع ۲)

بھیجا تو وہاں کے مالدار لوگ کہنے لگے "ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم تو انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں گے"۔ پیغمبر نے (جواباً) کہا۔ اگر میں تمہیں اس سے زیادہ صحیح و روشن راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا (تب بھی انہیں کی تقلید کرو گے؟) انہوں نے کہا (کچھ بھی ہو) ہم تو اس شریعت کو قبول نہیں کر سکتے، جو تم لے کر آئے ہو۔ آخر ہم نے ان سے (عبرت انگیز) انتقام لیا (اور وہ تباہ کر دیئے گئے) تو اے پیغمبر! دیکھ تو سہی (ہمارے عطا کردہ دستورِ زندگی کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا!

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

اور جب یہ کافر و مشرک لوگ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا اور اللہ نے ہمیں یہ کام کرنے کا حکم دیا ہے (اے پیغمبر) کہیئے کہ اللہ کسی برے کام کا حکم ہرگز نہیں دیتا (اے جاہلو!) جن باتوں کے صحیح یا غلط ہونے کا تمہیں علم تک نہیں، انہیں اللہ کے سر تھوپتے ہو؟

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝

(پ ۱۲ : ۹ ع)

تو یہ مشرک (اللہ کے سوا) جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں، تجھے ان کے کذب و بطلان میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی ان چیزوں کی اس طرح پرستش کرتے ہیں جس طرح ان کے باپ دادا کرتے رہے۔ (اس شرک و تقلید کی وجہ سے) ہم قیامت کے دن ان کے عذاب کا پورا پورا حصہ انہیں پہنچائیں گے اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

انصاف اور دیانتداری سے دیکھا جائے تو تقلیدِ آباؤ اجداد کا بھوت آج بیچارے مسلمان پر بھی پوری شدت سے سوار ہے اور حالت یہ ہے کہ ہر گھرانے ہر خاندان اور ہر فرقے کو اپنے آباؤ اجداد اور بزرگوں سے جو عقائد، عادات و اطوار اور رسم و رواج ورثہ میں ملتے چلے آئے ہیں، وہ انہیں کسی حالت میں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اور یہی وہ خطرناک ہٹ دھرمی اور غلط فہمی ہے جو ہمیں نہ صرف صحیح فہمِ قرآن اور اسوۂ رسولؐ سے محروم کئے ہوئے ہے، بلکہ قوم کے تنزل و انتشار کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ اور جب تک ہم یہ جاہلانہ اصرار نہیں چھوڑیں گے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (ہمیں وہی طریقِ عمل کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا) نہ تو ہمیں تقلید کی لعنت سے رہائی مل سکتی ہے اور نہ ہم قرآن و حدیث میں "خالص اسلام" اور "غیر تغیّر یافتہ" دینِ فطرت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ اسی اور صرف اسی احساس کے تحت علامہ اقبال بھی کیا خوب فرما گئے ہیں کہ:۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے
زبندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتے (پیامِ مشرق)

ترجمہ: "کیا ہی اچھا ہوتا کہ نیکی کی راہ پر چلنے والا شخص (آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی) پرانی داستانوں کے قید وبند سے آزاد چلا جاتا۔ اگر تقلید کوئی مستحسن طریقہ ہوتا تو آنحضرتؐ بھی یقیناً آباؤ اجداد کے راستے پر گامزن ہوتے۔"

کوئی ہے جو اس دلیلِ محکم کو کسی دلیل سے بھی قطع کر سکے؟ اور دلیل یہ ہے اگر "تقلید" کسی لحاظ سے بھی مفید و مستحسن شے ہوتی تو رسولِ کریمؐ جیسا صاحبِ حکمت و بصیرت، سرچشمۂ علم و معرفت، فراخدل اور معقول پسند شخص سب سے پہلے اپنے اباؤ اجداد کی پیروی اختیار کرتا۔ لیکن وہاں تو یہ حالت تھی کہ یتیمی بے کسی اور بے سروسامانی کے باوجود فکروعمل کے قدیمی اور خود ساختہ بتوں کو پاش پاش کرتے ہوئے اعلانِ توحید کر دیا گیا۔ اس پر اپنے پرائے سب دشمن و بدخواہ ہو گئے اور ہر ممکن طریقے سے نہ صرف پیغمبرِ برحق کو خائف و مرعوب کرنے کی کوشش کی بلکہ "ترہیب" کے ساتھ ہی ساتھ "ترغیب" کے تمام بڑے بڑے حربے (مثلاً مال وزر، سیادت و امامت اور خوبصورت عورتوں کی پیش کش) بھی استعمال کئے، لیکن خدا کا وہ "اولوالعزم" پیغمبر تھا کہ کوہِ صبر و استقلال بن کر کتاب اللہ کی معین کردہ صراطِ مستقیم پر پامردی سے ڈٹا رہا اور "شیوۂ تقلید" کو نہ تو کسی "ترہیب" سے اختیار کیا اور نہ کسی "ترغیب" سے۔

اب یہ ہمیں خود سوچنا ہے کہ ایسے پرستارِ حق پیغمبرؐ کی "امت" ہونے کے

لحاظ سے راہِ تقلید کے بے سند اوہام چھوڑ دینے اور براہِ راست حق و صداقت کی جستجو میں ہمارے فرائض کیا ہیں، بایں ہمہ اگر ہم آباؤ اجداد سے چلی ہوئی رسومِ شرک و بدعات سے وابستہ رہیں تو ہمیں "عاشقِ رسول" یا کم از کم "امتی" کہلانے کا کیا حق ہے؟:-

جب نہیں ہے جستجوئے حق کا تجھ میں ذوق و شوق
"امتی" کہلا کے پیغمبرؐ کو تو رسوا نہ کر!
ہے فقط توحید و سنّت امن و راحت کا طریق
فتنہ و جنگ و جدل "تقلید" سے پیدا نہ کر!
لا الٰہ سے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
بُت شکن بن، دل میں آزر کے صنم برپا نہ کر!
تو ہے خود بت گر تو غیروں پر ہے طنز و طعن کیوں؟
کر علاجِ شرک و بدعت، کفر کا شکوا نہ کر!

یہاں ایک ممکن اعتراض کا جواب تحریر کرنا ضروری ہے۔ وہ ممکن اعتراض یہ ہے جب قوم کو آنحضرتؐ کی پیروی اور اطاعتِ کاملہ کے لئے مامور و مکلّف کیا جا رہا ہے تو یہ بھی ایک طرح کی "تقلید" ٹھہری۔ لہٰذا ہمیں کلام اللہ کے اوامر و نواہی ہی بس ہیں اور پیروی حدیث یا اطاعتِ رسول کی تقلید زائد در کار نہیں۔

یہ وہ اعتراض ہے جو صرف اعتراض ہی نہیں بلکہ اس بدنصیب ملک کے ایک فرقہ ضالہ کا مستقل "عقیدہ" بھی ہے۔ جواباً عرض ہے کہ لفظِ "تقلید" طبعاً اور روایتاً ایک بہت برا مفہوم رکھتا ہے اور حقیقتہً اسی برے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی لغت میں "قلادہ" کے معنی ہیں پٹہ۔ آپ یہ پٹہ کسی بھی جانور کی گردن میں ڈال لیں اور اپنے

حسب منشا اس مجبور و بے بس مخلوق کو جہاں چاہیں لئے لئے پھریں اور پھر قلادہ" سے "تقلید" کے معنی ہوئے کسی شخص کا پٹا اپنی گردن میں ڈال لینا۔ یا بالفاظ دیگر آنکھوں پر پٹی باندھ کر بالالتزام اسی کے نقشِ قدم پر چانا خواہ وہ اندھیرے کنوئیں ہی میں لے جا پھینکے۔ تو بہر کیف لفظ "تقلید" چونکہ ہمیشہ بُرے مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا آنحضرت ؐ کی ذاتِ اقدس پر اس کا اطلاق ہی نہیں ہوتا اور اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ (۱) کلی طور پر معصوم عن الخطا ہیں (۲) ان کے قول و فعل سے کسی کے لیے مشرک و فاسق ہو جانے یا کسی جہت سے مبتلائے گناہ ہونے کا کوئی خدشہ نہیں (۳) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود خالقِ کائنات اور صاحب قرآن ہمیں بار بار اتباعِ رسول ؐ اور پیروی اسوۂ حسنہ کی حکماً تاکید فرماتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک ایسا "اتباع" ہے نہ کہ "تقلید" جس میں لغزش و گمراہی کی گنجائش ہی نہیں۔

باقی رہا وہ فرقہ جو احادیثِ رسول کو ایک فالتو اور "زائد" چیز بتاتا ہے تو وہ صریحاً خود اللہ تعالےٰ کا دشمن ہے اور اللہ کے اس کلامِ مقدس کا دشمن ہے جسے وہ اپنی رہنمائی کے لئے "کافی" سمجھتا ہے۔ قرآنِ مجید تو اکثر جگہ اتباع اسوۂ رسول کی تاکید کرتا ہے اور اسی درسِ "حکمت" اور اسی تفسیرِ آیات کو مسلمانوں کے لیئے صحیح و مستند قرار دیتا ہے جو نبی امّی ؐ کی زبانِ حقیقت ترجمان سے صادر ہوئی، اور احادیث صحیحہ ہیں کیا؟ قرآنِ مجید ہی کی بہترین اور معتبر ترین تفسیر و تشریح تو ہیں! پھر ان کی تردید و مخالفت قرآن کی تردید و مخالفت نہ ہوئی تو کیا ہوئی۔؟

تقلیدِ آباؤ اجداد کے عقلی، اعتقادی نسیاتی اور عملی مفسدات و مضرات

کورانہ تقلید کسی امام و بزرگ کی ہو، یا آباؤ اجداد کی، اس سے جو مضر اور تباہ کن نتائج پیدا ہوتے

ہیں، ان کا ایک مختصر سا تذکرہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ علم و عرفان کی پستی و کوتاہی

تقلید وسعتِ علم و مطالعہ کی دشمن ہے، وہ اس لئے کہ جب کسی ایک خاص ہستی ہی کی تقریروں یا تحریروں پر بلاچون وچرا ایمان لے آنا ہے تو پھر مطالعہ کی کیا ضرورت رہی؟ اور علم کیونکر وسیع ہوگا؟ عرفانِ حق کی راہ کیونکر روشن و آشکارا ہوگی؟

چنانچہ "تقلید" انسان کو نہ صرف آزاد مطالعہ اور وسعتِ علم سے محروم رکھتی ہے، بلکہ اُس مشاہدۂ قدرت۔ اور مطالعہ کائنات سے بھی، جس سے عجائبات ارض وسما اور صنعت و عظمتِ خالق کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کے حواسِ خمسہ یعنی قوتِ باصرہ قوتِ شامہ، قوتِ ذائقہ اور قوتِ لامسہ کی حقیقی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ بہ نظرِ غائر کائنات کا مشاہدہ کر کے مختلف حیوانوں، پرندوں، چشموں، ندیوں وغیرہ کی نوا ہائے فطرت ترجمان کو سن کر، گلستانِ عالم کی متنوع خوشبوؤں کو سونگھ کر، خدا کی بے شمار اور مختلف الذائقہ نعمتوں کو چکھ کر اور عناصر کے تمام نرم و سخت اجزا کو چھو کر خالقِ کائنات کو پہچانے، عالمِ مجاز سے عالمِ حقیقت کی طرف پرواز کرے، عرفانِ حق حاصل کرے اور پھر بے اختیار تسلیم کرے کہ ـــــ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ "تمام پیدا کرنے والوں میں خدا ہی بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ لہٰذا تمام برکت و عظمت اسی کے لئے مخصوص ہے"۔

قرآنِ مجید میں تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر نے بھی مشاہدۂ قدرت کے ذریعہ عرفانِ حق حاصل کیا اور تدبّر فی الخلق سے "خلیل اللہ" کا مقام پایا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں نہ صرف حواسِ خمسہ کو کما حقہٗ استعمال کرنے اور کائنات میں غور و تدبر کرنے کی پے در پے دعوت دی گئی ہے، بلکہ ہر ایسے مدبّر و

ن کو صحیح معنوں میں دانا اور "عقلمند" تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً

لْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۙ	اور صاحب یقین لوگوں کے لئے (مخلوقات)
اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا	زمین میں (عرفانِ حق کے لئے) بہت سی
ـرُوْنَ ۞	نشانیاں ہیں اور (ایسی نشانیاں) خود تمہارے
(پ ۲۶ : ۱۸ع)	جسم میں بھی موجود ہیں۔ کیا تم (غور سے) نہیں
	دیکھتے؟

ـوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ	(اے پیغمبر) کہئے کہ اسی قادرِ مطلق نے تمہیں
ـلسَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ	پیدا کیا اور (عرفانِ حق کے لئے) تمہیں کان
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۞	آنکھیں اور دل عطا کیئے۔ تم (ان نعمتوں کا) بہت
(پ ۲۹ : ۲ع)	کم شکر ادا کرتے ہو[1]

ـخَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور
ـلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ	رات دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کے
ـلِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۙ	لئے (قدرتِ حق کی) بہت سی نشانیاں
ـنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا	ہیں۔ وہ عقلمند جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور
ـدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَ	لیٹے (ہر حالت میں) یاد کرتے رہتے ہیں
ـرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش (کائنات)

---

[1] ان آنکھ اور دل کو ان کے اصل مقصدِ تخلیق کے لئے استعمال نہیں کرتے۔

وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

(پ ۴ : ۱۱ع)

میں غور کرتے ہیں (اور پھر کہتے ہیں) اے ہمارے خالق و پروردگار! تونے یہ سارا کارخانہ بیکار و بے مقصد نہیں بنایا۔ تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے تو ہمیں عذابِ دوزخ سے بچالے۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ جو شخص حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا[1] کہہ کر آباؤ اجداد کی کورانہ "تقلید" پر مُصر ہے، وہ مشاہدۂ کائنات اور عرفانِ حق کے لئے اپنے حواس کو کیونکر استعمال میں لائے گا؟ اور یہ نہ ہوا تو وہ زبانِ الٰہی میں" اُولِی الْاَلْبَاب" (عقلمند) تو نہیں، البتہ بدترین قسم کا احمق ضرور ہے۔ کیونکہ اس نے منشائے قدرت کے مطابق اپنے حواس کا صحیح فائدہ ہی نہیں اٹھایا۔ اس لحاظ سے ہر مقلّد شخص نہ صرف محرومِ علم رہتا ہے بلکہ بے بہرۂ مشاہدہ و عرفان بھی!

۲۔ عقل و فہم کا تعطّل

مقلّد اپنے نشۂ تقلید میں عقل و فہم کو قطعًا استعمال ہی میں نہیں لاتا۔ مثلاً جب آپ ایک ایسے شخص کو جو آباؤ اجداد یا کسی بزرگ و امام کی پیروی پر فیصلہ کن طریق پر قسم کھائے بیٹھا ہو، غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے یہ کہیں کہ میاں کچھ عقل و شعور سے بھی کام لو اور کم ازکم اتنا تو غور کرو کہ جن چیزوں پر تم یقین کیئے ہوئے ہو اور جن پر شب و روز عمل پیرا ہو، وہ کہیں نہ کہیں تعلیماتِ قرآن، اسوۂ رسولؐ، تمدّنِ اسلامی اور تہذیب و معقولیت سے متصادم تو نہیں ہوتیں! ــــ تو وہ اس معقول مطالبہ کو بھی نامعقول سمجھتے ہوئے

---

[1] "ہمیں تو وہی طریق عمل کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔"

اور آپ کو کسی نہ کسی لحاظ سے مشتبہ تصور کرتے ہوئے کچھ اسی نوعیت کا جواب دے گا کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" ہمیں تو وہی طریق عمل کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔"

الغرض دنیا کا ہر مقلد شخص عقل و فہم کو استعمال میں لانا ایک گناہ عظیم سمجھتا ہے، اور اس کے نزدیک یہ چیز ایک ایسی لغزش و گمراہی ہے جو اسے یقیناً دوزخ میں لے جائے گی!

۳۔ تحقیق و جستجوئے حق سے محرومی | قرآن مجید اور احادیث رسول میں اکثر جگہ تحقیق حق اور جستجوئے حق کی طرف دعوت دی گئی ہے اور غور کیجئے تو یہی چیز تمام انبیائے کرام، اولیاء اللہ اور صلحائے امت کے استحکام ایمان کا باعث ثابت ہوئی۔ جہاں تحقیق و جستجوئے حق نہیں وہاں باطل تو پوری شدت سے دل و دماغ پر حاوی رہے گا۔ لیکن جلوۂ حق ہرگز آشکار نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسانی کے تمام بڑے بڑے روحانی اور اخلاقی مصلحین نے ہوش سنبھالتے ہی صرف اپنے آبائی عقائد و تصورات پر قناعت نہیں کی اور نہ ہی اپنے ملک و ماحول میں اپنی تمام قوم کے عقائد اور عادات و اطوار کے پابند ہوئے، بلکہ عقل و فہم سے کام لے کر ہدایاتِ فطرت کی رہنمائی میں براہِ راست "حق" کی تحقیق و جستجو کی اور بعد ازاں تمام مقلدین کو بھی اپنے ثمرۂ تحقیق و جستجو سے فیض یاب کیا۔ اگر اولادِ آدم راہ و رسمِ تقلید ہی پر قناعت کرتی اور تحقیقِ حق کا ولولہ کسی دل میں پیدا نہ ہوتا۔ تو دنیا کے بت کدوں میں اصنام پرستی بدستور جاری رہتی۔ خالق کی جگہ مخلوق کو بدستور حاجت روا و مشکل کشا سمجھا جاتا۔ عین بیت اللہ شریف میں لات و منات کی پوجا حسب سابق ہوتی رہتی اور کسی گوشے سے لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ[1] یا لَا اِلٰهَ اِلَّا

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

اللہ کی صدائے توحید ہرگز بلند نہ ہوتی!

پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلمان فطرتاً "مقلد" نہیں بلکہ "محقق" پیدا کیا گیا اور مقلد کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ تحصیلِ حق کے لیے "محقق" بننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

۴۔ عزم و عمل کا فقدان عزمِ محکم، ذوقِ عمل اور جذبۂ تسخیر تو صرف اس شخص کے سینے میں ہوتا ہے جو شخص تقلید کی مرگ آفریں بندشوں سے آزاد ہو، جس کے حواس زندگی کی ازلی اور فطری قدروں کو تحقیق و مسخر کرنے کے لئے کسی قید و پابندی کے بغیر عرصۂ حیات میں پوری آزادی و جولانی سے مصروفِ کار رہیں اور جو اپنی پروازِ جستجو میں کسی سے معلّق و وابستہ نہ ہو، لیکن بیچارے مقلّد کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ دامِ تقلید میں مقیّد ہونے کے باعث نہ تو تحقیق و تسخیر کا "عزم" کر سکتا ہے، اور نہ فطرت کی مخفی اقدار کو ظاہر و نمایاں کرنے کے لئے "مصروفِ عمل" ہو سکتا ہے۔ پس ہر مقلّد کی عبرت انگیز کوتاہیِ نظر، تنگیِ ظرف، پستیِ ہمت اور "قناعت" کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر تلقین و تفہیم اور کیا کی جا سکتی ہے کہ:۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

لہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ ہیں۔ ترجمہ: "میں فانی چیزوں کو ہرگز محبوب نہیں رکھتا۔"

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

ئدکا غیر تمناہی اختلاف، امت کا
ق و شقاق، اور فرقہ بندی کی وبا

آپ ہی اندازہ فرمائیں کہ جب کوئی فرد، یا خاندان یا جماعت قطعی طور پہ یہ

ے کہ ہم تو کسی بحث و تمحیص اور تحقیق و اجتہاد میں پڑے بغیر اپنے باپ دادا
ے قدم پہ چلیں گے۔ یا بلا چون و چرا فلاں امام کی پیروی کریں گے۔ تو اس سے
کے عقائد میں کس قدر وسیع اور غیر تمناہی اختلافات پیدا ہوں گے۔ اللہ
نے تو بذریعۂ "قرآن اور بذریعۂ "دینِ اسلام" مسلمانوں کو ان کے دستور
ے لئے کچھ ایسے معین و مقرر اور دوامی عقائد عطا کئے ہیں، جن میں تاقیامت
ل یا بحث و اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن "تقلید" ہی وہ ملعون
ز اصولی طور پر ایک ہی متفقہ عقیدہ رکھنے والی امتِ محمدیہ میں بے شمار
ے اور بے شمار مذاہب و ادیان پیدا کر چکی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ عقائد و
کے اس اختلاف سے فرقہ بندی کی وہ مہلک وبا پھوٹی ہے، جس نے
سلمان کی روحانی و اخلاقی زندگی کو ختم کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب افراد
ں اپنا اپنا الگ ذہنی بت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دیں اور اسی محویت
للہ اور قال الرسول تک کو توجہ نہ دیں تو پھر امت کے عقائد میں کس قدر
اف پیدا ہوگا؟ اور اس بنا پر کس قدر گروہ اور فرقے پیدا ہوں گے؟ ان
ں کس قدر نفرت و عداوت ہوگی؟ ایک دوسرے کی تکفیر کا بازار کس تیزی
ر ہے گا؟ اور "کفر بازی" سے پیدا شدہ فسادات امن و عافیت کو غارت

کرکے تباہی و بربادی کے کتنے ہنگامے برپا کریں گے؟

یہ کوئی نئی چیزیں نہیں ہیں "تقلید" زمانۂ ماضی میں ایسے اکثر پھول کھلاتی رہی ہے اور آپ ان کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں تقلید ہی نے امتِ مسلمہ کو اس اختلاف وانتشار اور ضعف و کمزوری تک پہنچا دیا ہے کہ وہ کفار کے لئے بھی مضحکہ خیز بن رہی ہے اور تقلید ہی نے تمام قوم کو "حبل اللّٰہ" کے مرکز سے جدا کرکے وشتِ اوہام و رسوم میں پراگندہ و منتشر کر رکھا ہے۔ اور پھر تقلید ہی نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ جیسے اصولِ اتحاد و اتفاق کو قطعی طور پر فراموش کرا کے ہمیں ایک دوسرے کا بدترین دشمن بنا دیا ہے۔ الغرض ہم نے تقلید کی نحوست سے اسلام کی روحِ اخوت و مودت کھو دی اور نفرت و عداوت کو قوم میں عام کر دیا۔ اگر ہم "توحید" اور "اسوۂ رسول" پر قناعت کرتے ہوئے شخصیت پرستی اور تقلیدِ آباؤ اجداد میں مبتلا نہ ہوتے تو ہم میں اختلاف و نفاق اور فرقہ بندی کا یہ عالم نہ ہوتا جو آج ہے۔ ہم تقلید کے طفیل توحید و سنّت کی مستند شاہراہ سے بھٹک کر شرک و بدعت کی خود ساختہ وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دین و مذہب کے متعلق بھی یقین و اطمینان رکھنے کی بجائے ہمارے دل و دماغ بے شمار شکوک و شبہات میں گھرے رہتے ہیں اور اسلام ایک خوشگوار اور تعمیری دستورِ حیات معلوم ہونے کی بجائے ہمیں ایک ناقابلِ برداشت اور تکلیف دہ بارِ دوش محسوس ہوتا ہے۔

ؐ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، "سب کے سب مل کر خدا کی رسّی (قرآن) کو مضبوطی سے پکڑ لو اور نفاق و اختلاف پیدا نہ کرو"

ؑ "تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"

تقلید کے تمام مذکورہ بالا مفسدات و مضرات اور تباہ کن نتائج و اثرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر علّامہ اقبال نے مقلّد کے متعلق مندرجہ ذیل فیصلہ صادر کیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے!

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے!

جس "زندگی" میں زندگی کا بنیادی مقصد یعنی تحقیق و جستجوئے حق اور اتباعِ حق ہی نہیں، اسے "زندگی" کیونکر کہیئے؟ اور جب مردِ مقلد زندگی کے حقیقی نصب العین یعنی تحقیقِ حق، اتباعِ حق اور اعلانِ حق سے محروم رہا تو کیا اس کا عدم اس کی ہستی سے بہتر نہ ہوگا؟ پس علّامہ اقبال کے حسبِ ارشاد ہر مقلّد ننگِ ہستی اور توہینِ کائنات ہے۔ اس نے اعتقاداً اور عملاً انسانیت کے مقامِ اعلیٰ کی تذلیل و تحقیر کی ہے اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے اپنے کلامِ حقیقت ترجمان میں بے شمار جگہ فرمایا کہ دنیا میں بڑے بڑے انقلابات، محیّر العقول کارنامے اور معجزاتِ علم و ہنر صرف محقّق اور مجتہد لوگوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے ہیں، مقلّدوں کے ہاتھوں نہیں۔ اور اس لئے زندگی کو اپنا غیر متناہی اقدامِ جستجو اور عملِ تسخیر جاری رکھنا چاہیئے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

تقلید ایک سبیل بے دلیل ہے

اس ضمن میں بالآخر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ کسی مقلّد کے پاس اپنے طریق عمل کے لئے پختہ دلیل و برہان نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ جب آپ اسے کسی ٹھوس دلیل کی رو سے شریعت کے اصولِ حقّہ کا قائل بھی کرنا چاہیں تو وہ ہرگز قائل نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں مقلّدین کے اس عقیدہ کی ترجمانی اکثر جگہ کی گئی ہے اور میں قبل ازیں ایسی مثالیں بھی پیش کر چکا ہوں، تاہم مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ پر بھی غور فرمایئے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ۔

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کرو۔ تو وہ کہتے ہیں۔ ہم تو اسی (طریق عمل) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ (بھلا ان سے پوچھیئے) اگرچہ شیطان تمہارے باپ دادا کو (دوزخ کے) دردناک عذاب کی طرف لئے جا رہا ہو (تب بھی تم انہیں کی تقلید کرو گے؟))

الغرض تقلید قطعی طور پر ایک سبیل بے دلیل ہے۔ چنانچہ خود فقہ کی معتبر کتاب شرح مسلّم الثبوت مطبوعہ نولکشور صفحہ ۶۲۴ پر "تقلید" کی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے "التقلید العمل بقول الغیر من غیر حجۃ" یعنی تقلید اسے کہتے ہیں کہ کسی شخص کے قول پر کسی دلیل و برہان کے بغیر عمل کیا جائے، خواہ قرآن و حدیث اس کی تائید میں ہوں یا نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ امتِ مرحومہ کے بہت سے راسخ و معتبر علما بلکہ خود وہ تمام مجتہد بزرگ جن کی تقلید کو واجب قرار دیا گیا ہے، بڑی شدّت سے تقلید کی مذمّت

کرتے چلے آئے ہیں اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے پے درپے تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ جو شخص بھی چاہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام طحاوی محمد عبد العظیم رومی، امام عبد البر، شیخ محی الدین بن عربی، امیر ابن الحاج خطیب البغدادی وارکی، امام علائی، امام رافعی، علامہ جلال الدین سیوطی، ابن حجر عسقلانی، علامہ ہارون مرجانی، امام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم، امام فخر الدین رازی، ابن حزم، مجدد الدین فیروز آبادی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ عبد العزیز وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے اقوال وارشادات کو تفسیر نیشاپوری، تفسیر مظہری، تفسیر کبیر، تفسیر فتح البیان، جامع ترمذی اور مسند امام احمد میں تحت آیہ شریفہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ[لہ] الخ اور تفسیر عزیزی میں تحت آیہ شریفہ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا[لہ] الخ اور بحث لفظ وَلَا الضَّآلِّيْنَ[لہ] میں اور تحت آیہ شریفہ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ[لہ] الخ اور "قول سدید" بنگلوری صفحہ ۱۴ اور میزان شعرانی دہلوی جلد اول صفحہ ۴۲-۶۱، ناظورۃ الحق بلغاری صفحہ ۲۶، فتوح الغیب مطبوعہ

لہ "ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے مولویوں اور صوفیوں (علماء ومشائخ) اور عیسیٰ ابن مریم کو اپنا معبود وحاجت روا بنا لیا۔ حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبود برحق کی پرستش کریں، اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک ہے (پ۱۰: ۱۱ع)

لہ یہ آیہ شریفہ اسی مضمون میں پہلے آچکی ہے۔ (پ۲: ۵ع) لہ سورۃ فاتحہ۔

لہ "اور ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسے جانور کے پیچھے چلائے جو صرف پکارنا اور چلانا تو سنتا ہے (لیکن مطلب خاک نہیں سمجھتا) یہ کافر بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ لہٰذا (حق کو) سمجھ نہیں سکتے" (پ۲: ۵ع)

لاہور صفحہ ۱۶۰، عقد الجید فاروقی صفحہ ۴۵ - ۶۶ - ۹۷ - وغیرہ میں خو
بھال کر اپنا اطمینان کرے۔

کلامِ اقبالؒ میں مذمتِ تقلید اور تاکیدِ اتباعِ اسوۂ رسولؐ

حکیم الامت، مجتہد العصر او
علامہ اقبالؒ نے جہاں تقلید
تردید و مذمت فرمائی ہے،
ہی ساتھ اتباعِ اسوۂ رسولؐ کی پے در پے تلقین و تاکید بھی کی ہے ، ک
نزدیک مستند و معتبر اور ضامنِ فلاحِ دارین " دین " ہے تو یہی ہے ۱۱
علاوہ ہر دوسرا عقیدہ و مسلک سراپا کفر!

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اے مسلمان! خود کو طریقِ مصطفےٰ تک پہنچا کیونکہ دینِ حق وہی ہے
اگر بہ او نرسیدی ، تمام بولہبی است
اگر تو اس کا مسلک اختیار نہ کرسکا تو سمجھ کہ سب کچھ کفر ہے

میں ذیل میں علامہ مرحوم کے وہ تمام اشعار پیش کئے دیتا ہوا
مذمتِ تقلید بھی ہے اور تلقینِ اتباعِ کتاب و سنت بھی:

اے کہ از اسرارِ دین بیگانہ	با یک آئین ساز[۱] اگر
اے کہ تو دین کے اسرار سے بے خبر ہے	اگر تو عقلمند ہے تو ایک ہی آئی
من شنیدستم ز نباضِ حیات	اختلافِ تست مقراضِ
میں نے زندگی کے ایک رازدار سے سنا ہے کہ	تیرا اختلاف تیری زندگی کے لئے گ

---

[۱] یک آئین سے مراد ہے قرآن

از یک آئینی مسلماں زندہ است | پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
مسلمان صرف یک آئینی ہی سے زندہ ہیں | اور جسمِ قومی صرف قرآن سے زندہ و پائندہ ہے
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست | اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست
ہم سب خاک ہیں مگر دلِ آگاہ صرف قرآن ہے | تو اسے مضبوطی سے پکڑ کیونکہ وہ خدا کی رسی ہے

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
موتی کی طرح اس کے تاگے میں پرو دیا جا
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو
ورنہ گرد و غبار کی طرح پراگندہ ہو جا

سینۂ ما از محمد داغ داغ | از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
میرا سینہ محمد کے ہاتھوں داغ داغ ہو رہا ہے | اس کے دم سے کعبہ کا پرانا چراغ بجھ گیا
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود | نوجواناں را ز دستِ ما ربود
اس نے قیصر و کسریٰ کی ہلاکت کا اعلان کیا | اور نوجوانوں کو ہمارے ہاتھ سے چھین کر لے گیا
ساحر و اندر کلامش ساحری است | ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است
وہ جادوگر تھا اور اس کے کلام میں جادو بھرا ہوا ہے | اور یہ دو حروفِ لا الٰہ بھی سراپا بغاوت ہیں
تا بساطِ دینِ آبا در نورد | با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
جب سے اس نے دینِ آباؤ اجداد کا بستر لپیٹ دیا | ہمارے دیوتاؤں سے وہ سلوک کیا جو کیا

---

[1] اس مثنوی میں روحِ ابوجہل آنحضرت کی تبلیغِ توحید اور مذمتِ تقلید کی وجہ سے طریقِ آباؤ اجداد کے برباد ہونے اور اپنے ذہنی دیوتاؤں کے پاش پاش ہونے پر حرمِ کعبہ میں نوحہ و فریاد کرتی ہے۔

[2] یعنی اس کعبہ کا چراغ گل ہوا جس میں ہمارے دیوتاؤں کے بت رکھے تھے۔

پاش پاش از ضربتش لات و منات — انتقام از وے بگیراے کا
اس کی ضرب کاری سے ہمارے لات و منات پاش پاش ہو گئے — اے کائنات اس سے انتقام

دل بغائب بست و از حاضر گسست — نقش حاضر را فسونِ او ش
اس نے اپنا دل ہستیٔ غائب سے باندھا اور عالمِ حاضر سے رشتہ توڑ لیا — اس کے جادو نے نقشِ حاضر کو با

دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست — آنچہ اندر دیدہ می ناید
ہستیٔ غائب پر اپنی نظر جما لینا غلطی ہے — اور جو دکھائی ہی نہیں دیتا وہ

پیشِ غائب سجدہ بردن کوری است — دینِ نو کور است و کوری د
ہستیٔ غائب کے سامنے سجدہ کرنا اندھاپن ہے — اس کا نیا دین اندھا ہے اور اندھا

خم شدن پیشِ خدائے بے جہات
جو خدا کوئی سمتیں اور اطراف ہی نہیں رکھتا

بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوات
اس کے سامنے جھکنے کا طریقِ نماز بندے کو کوئی سرور نہیں دیتا

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ
اس کا مذہب ملک و نسب کو منقطع کرتا ہے — وہ قریش میں سے ہو کر بھی فضیلہ

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خوان
اس کی نظر میں بلند و پست بالکل یکساں ہیں — وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہ

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در
اس نے احرارِ عرب کی قدر و قیمت ہی نہ سمجھی — اور حبشہ کے موٹے اور بھدے لوگو

احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند

جب سرخ فام لوگ سیاہ فام لوگوں سے مخلوط ہو گئے — تو انہوں نے اپنے قبیلہ و خاندان کی عزت گرا دی

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

یہ یکسانیت اور یہ بھائی چارہ بالکل عجمی چیز ہے — میں خوب جانتا ہوں کہ سلمانؓ اصلاً ایرانی ہے

ابنِ عبداللہ فسونش خوردہ است — رستخیزے بر عرب آوردہ است

ابن عبداللہ (محمدؐ) نے اس کا دھوکا کھایا — اور عرب کی آبادی پر ایک قیامت لے آیا

عزتِ ہاشم ز خود مہجور گشت — از دو رکعت چشمِ شاں بے نور گشت

اسی طرح ابن ہاشم کی عزت و آبرو خاک میں مل گئی — اور دو رکعتوں سے ان کی آنکھ بے نور ہو گئی

اعجمی را اصلِ عدنانی کجاست — گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست [1]

عجمی شخص عدنانی نسل سے تو نہیں ہو سکتا — اور گونگا آدمی سحبان کی تیز گفتاری کہاں سے لائیگا

چشمِ خاصانِ عرب گردیدہ کور — بر نیائی اے زہیر از خاکِ گور؟

عرب کے خاص لوگوں کی آنکھ مساواتِ محمدؐ سے اندھی ہو گئی — اے زہیر تو خاکِ قبر سے کیوں نہیں اٹھ کھڑا ہوتا!

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل — بشکن افسونِ نوائے جبرئیل [2]

اے کہ تو اس صحرائے عرب میں ہمارا رہنما ہے — وحیِ محمدؐ کا جادو لوگوں کے دل و دماغ سے توڑ دے

طرفگیہا در نہادِ کائنات — نیست از تقلید تقویمِ حیات

کائنات کی سرشت میں عجیب تغیرات پنہاں ہیں — اور زندگی کی جنتری تقلید سے مرتب نہیں ہوتی

---

[1] "عجم" کے لغوی معنی ہیں کند زبان اور گونگے لوگ۔ عربوں کو اپنی فصاحت و بلاغت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ مردمِ غیر عرب کو اپنے مقابلے میں گونگے سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر فرمایا۔ ع "گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست"۔ سحبان بن وائل، ایک بہت بڑا فصیح و بلیغ عرب۔

[2] نوائے جبرئیل سے مراد ہے قرآن مجید۔ کیونکہ جبریلِ امین ہی نے یہ کتابِ مقدس آنحضرتؐ تک پہنچائی

ایک زندہ دل تو نئے زمانے پیدا کرتا رہتا ہے — اور اس کی روح تقلید سے بے نور

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قر

اگر تو مسلمانوں کا سا دل و جگر رکھتا ہے — تو اپنے ضمیر اور قرآن پر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ

سینکڑوں تازہ دنیائیں اس کی آیات میں مخفی ہیں — اور اس کے لمحات میں بہت سے زما

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا

بندۂ مومن خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے — اور ہر دنیا اس کے جسم پر لباس کی حیثیّ

چوں کہن گردد جہانے در برش

جب ایک دنیا اس کے جسم پر پرانی ہو جاتی ہے

می دہد قرآں جہانے دیگرش (جاوید نامہ)

تو قرآں اسے ایک نئی دنیا عطا کرتا ہے

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی ا

ہماری محفل میں نہ شراب ہے نہ ساقی — سازِ قرآں کی بھی صرف آوازیں

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں ز

اگر ہماری مضراب تارِ ساز پر بے اثر پڑے — تو آسمان کے پاس ہزاروں سازند

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد

ذکرِ حق قوموں کی وابستگی سے آزاد ہے — وہ زمان و مکان کی قیود سے بھی

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است — احتیاجِ روم و شام اور ر

ذکرِ حق ہر ذاکر کے ذکر سے بلند و بالا ہے — اسے روم و شام وغیرہ کی ضرورت

حق اگر از پیشِ ما بردارِدش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

اگر خدا اسے ہمارے سامنے سے اٹھا لے — تو پھر کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن

میں نے تو مسلمان میں تقلید اور شکوک و شبہات ہی دیکھے — لہٰذا میری روح جسم میں لرزاں رہتی ہے

ترسم از روزے کہ محرومش کنند

میں اس دن سے خائف ہوں جبکہ خدا اس کو ذکرِ حق سے محروم کریگا

آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند (جاوید نامہ)

اور اپنی آگ کسی اور دل کے سپرد کر دے گا

زندہ رود

آنکہ خود را بہتر از آدم شمرد — در خم و جامش نہ مے باقی نہ دُرد

وہ ابلیس جس نے خود کو آدم سے بہتر سمجھا — اس کے خم و جام میں نہ تو شراب ہے نہ تلچھٹ

مشتِ خاکِ ما بگردوں آشناست — آتشِ او بے سر و ساماں کجاست

ہماری مشتِ خاک تو آسمان کی سیر کرتی ہے — لیکن اُس کی بے سروسامان آگ کہاں ہے

حلّاج

کم بگو زاں خواجۂ اہلِ فراق — تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق

اس خواجۂ اہلِ فراق کا ذکر کم کرو — وہ تو روزِ ازل سے پیاسا ہے اور جام لبریزِ خون رکھتا ہے

ما جہول او عارفِ بود و نبود — کفرِ او ایں راز را بر ما کشود

ہم جاہل و بے خبر ہیں مگر وہ ہست و بود کو جانتا ہے — اس کے کفر نے یہ راز ہم پر ظاہر کیا ہے

ازفتادن لذتِ برخاستن عیشِ افزودن زدردِ کاستن

گرنے ہی سے دوبارہ اٹھنے کا لطف ہے اور بڑھنے کا مزاجب ہے کہ پہلے گھٹیں۔

عاشقی در نارِ او وا سوختن سوختن بے نارِ او نا سوختن

سچی عاشقی یہ ہے کہ اس کی آگ میں جلا جائے اور اس کی آگ کے بغیر جلنا نہ جلنے کے برابر ہے

زانکہ او در عشق و خدمت اقدم است آدم از اسرارِ او نامحرم است

چونکہ وہ عشق و خدمت میں قدیم و مقدم ہے لہذا آدم اس کے بھیدوں سے بے خبر ہے

چاک کن پیراہنِ تقلید را

تو تقلید کا لباس چاک چاک کر دے

تا بیاموزی از و توحید را (جاوید نامہ)

تاکہ اس سے توحید کے اسرار سمجھے

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار بر نمی آید ز جبر و اختیار

بندہ جب تک حق کو بالکل واضح صورت میں نہ دیکھے وہ جبر و اختیار کی بحث سے چھٹکارا نہیں پا سکتا

تو یکے در فطرتِ خود غوطہ زن مردِ حق شو بر ظن و تخمیں متن

تو ایک دفعہ اپنے اعماقِ فطرت میں غوطہ لگا حق کا مطیع ہو اور شکوک و شبہات پر فخر نہ کر

تا ببینی زشت و خوب کار چیست اندر این نہ پردۂ اسرار چیست

تاکہ تو دیکھے کہ عمل کا برا بھلا کیا ہے اور ان نو پردوں (آسمانوں) کے اندر کیا بھید ہیں

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پَے

کیا ہی اچھا ہوتا کہ نیکی کی راہ پر چلنے والا شخص

ز بندِ پاستاں آزاد رفتے

پرانی داستانوں کی پیروی سے آزاد ہو جاتا

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب

اگر تقلید کوئی اچھا اور مفید طریق عمل ہوتا

پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتے (پیامِ مشرق)

تو آنحضرتؐ بھی یقیناً باپ دادا کی راہ پر چلتے

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذّتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق (ضربِ کلیم)

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق (ضربِ کلیم)

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو خود ہے لبِ گور (ضربِ کلیم)

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لیے ہے اکسیر
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر (ضربِ کلیم)

علامہ اقبالؒ نے "تقلید" کو صرف عقائد، اعمال اور مذہبیات ہی تک محدود رکھتے ہوئے اس کی تردید و مذمت نہیں کی، بلکہ وہ علوم و فنون اور تمدن میں بھی روشِ تقلید کے شدت سے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک "تقلید در علم" انسان کو تحقیق و اجتہاد، وسعتِ نظر، تبحرِ علمی اور تازگیِ افکار سے محروم رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر علمِ مقلد ایک نہایت محدود و پست علم ہے اور وہ بحیثیتِ علم ترقی و تجلی سے بالکل محروم رہتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ مقلد کا علم، خواہ وہ دینی علم ہو یا دنیوی، صحیح و مستند اور مفید و صحت مند بھی ہو۔ اس خرابی و کوتاہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ مقلد اپنے تصورِ علم اور دائرۂ علم میں کسی ایسے فرد یا قوم کے علم سے وابستہ و مقید ہو رہا ہے، جس سے آگے بڑھنا، یا تحقیق (ریسرچ) کرنا اس کے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ بعینہٖ یہی کیفیت "تقلید در فن" کی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک دنیا کا کوئی فن، کوئی ہنر، کوئی صنعت اور کوئی آرٹ اس وقت تک کسی قسم کی جدت و ندرت اور راہِ ترقی پیدا ہی نہیں کر سکتا، جب تک وہ پرانے طرز و اسلوب اور ساخت و پرداخت سے آزاد ہو کر کوئی "کارِ نادر" پیدا نہ

کرے۔ پس تقلیدِ اندازِ قدیم اور پیرویِ روشِ پارینہ سے کنارہ کش رہتے ہوئے اگر کوئی شخص نادر و نو چیز پیدا کر دکھائے تو پھر ان کے نزدیک ؎

گناہ ہے ہم اگر باشد ثواب است!

اسی طرح علامہ مرحوم کے نزدیک "تقلید در تمدّن" کی بنیادی قباحت و خباثت یہ ہے کہ وہ فرد و ملت کو اپنی ان مخصوص تاریخی و ملّی روایات سے بالکل غافل و بے تعلق کر دیتی ہے۔ جن کے بغیر کسی قوم کی قومی و اجتماعی زندگی ممکن ہی نہیں، اور پھر غیر قوموں کے تہذیب و تمدّن کی کورانہ تقلید سے جو شرمناک قسم کی ذہنی و فکری غلامی پیدا ہوتی ہے، وہ رسمی طور پر آزادی پا لینے اور "آزاد" ہو جانے کے بعد بھی قوموں کے قلب و دماغ سے اپنا رنگ آسانی کے ساتھ اترنے نہیں دیتی۔ پس یورپ کے تہذیب و تمدّن نے ایشیائی اقوام پر اپنی تقلید کا جو رنگِ مکروہ چڑھایا ہے۔ وہ آج "آزاد" ہو جانے والی اقوام میں بھی بدستور دیکھا جا سکتا ہے اور اس کا ادنیٰ ثمرہ یہ ہے کہ ہم اپنی قومی و ملّی روایات سے غافل و بے خبر ہی نہیں بلکہ متنفر بھی ہو چکے ہیں؛ اور اگر متنفر نہیں؟ تو ہماری روزمرّہ زندگی میں اُن روایات کا عکس کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ باقی رہا یہ سوال کہ افکار و تصوّرات اور تہذیب و تمدّن میں اغیار کی یہ مستقل تقلید ہمارے دل و دماغ کو صحیح معنوں میں کبھی آزاد و مختار رہنے بھی دے گی یا نہیں؟ ـــــ تو اس کا جواب سراسر آپ کے اندازِ فکر اور طرزِ عمل پر موقوف ہے۔ اگر آپ باقاعدہ طور پر روزانہ کچھ وقت دے کر اخلاق و آدابِ قرآنی، سیرتِ نبویؐ اسوۂ صحابہؓ اور تاریخِ اسلام میں اپنے روایتی تمدّنِ ملّی کا پورے انہماک سے مطالعہ

؎ یہ مبالغہ محض زورِ بیان اور تاکید و تلقین کے لئے ہے۔ ورنہ فی الواقعہ "گناہ" ہرگز مقصود نہیں

فرمائیں اور پھر اپنی حیاتِ اجتماعی کے لئے ان روایات کو عملی جامہ پہنانے کا عزم واقدام بھی کریں، تو تقلیدِ اغیار کا طلسم آناً فاناً از خود ٹوٹ جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ گذشتہ صدیوں کی طرح آئندہ صدیاں بھی "تقلید در تمدن" اور "ذہنی غلامی" کی آئینہ دار ہوں گی۔ اور اگر یہی صورتِ حال رہی تو "آزادی" کا کیا ثبوت؟ بہرکیف میں نے تقلید در علم، تقلید در فنون اور تقلید در تمدن کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے اس کے شواہد اقبال کی مندرجہ ذیل منظومات میں ملاحظہ ہوں:۔

میانِ آب و گل خلوت گزیدم[1]
میں نے دنیائے آب و گل میں تنہائی اختیار کی
ز افلاطون و فارابی بریدم
اور افلاطون و فارابی سے اپنا تعلق قطع کر لیا
نکردم از کسے دریوزۂ چشم
میں نے دنیا میں کسی غیر سے آنکھ نہیں مانگی[2]
جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم (پیامِ مشرق)
بلکہ دنیا کو صرف اپنی آنکھ سے دیکھا

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
تو اپنے تیشے سے اپنا راستہ خود بنا
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
کیونکہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستے پر چلنا عذاب روح ہے

---

[1] یعنی فکر و جستجوئے حق کے لئے خلوت اختیار کی۔ [2] یعنی کسی کی تقلید اختیار نہیں کی۔

گر از دستِ تو کارِ نادر آید

اگر تیرے ہاتھ سے کوئی جدید و نادر کام ہو جائے

گناہے ہم اگر باشد صوابؔ است (پیامِ مشرق)

تو اگرچہ وہ گناہ ہو، ثواب کا حکم رکھتا ہے

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں

بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو

دنیا ہے روایاتؔ کے پھندوں میں گرفتار

کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت

وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (ضربِ کلیم)

جدّت

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے

افلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحر سے

لہ یہ مبالغہ محض تاکید و اثر اندازی کے لیے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ گناہ کسی حالت میں بھی "صواب" نہیں ہو سکتا۔

لہ یہاں "روایات" کا مفہوم مذہبی و ملّی روایات نہیں۔ بلکہ وہ توہمات و بدعات و خرافات جو آباؤ اجداد سے رسماً و تقلیداً منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔

خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیّل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی (ضربِ کلیم)

مصوّر

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیّل
ہندی بھی فرنگی کا مقلّد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی! (ضربِ کلیم)

مردِ بزرگ

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبّت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق!
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اُس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق (ضربِ کلیم)

مشرق و مغرب

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری (ضربِ کلیم)

عالمِ ایجاد

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ!
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ!

اُس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ "تجدید"
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اقبالؒ

گذشتہ صفحات میں "تقلید" کے معائب و مضرات اور "تحقیق و جستجو" کے محاسن و مفادات بالتفصیل بیان کیئے جا چکے ہیں۔ یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ میں مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں کا بنیادی سبب ہی "تقلید" ہے۔ پ ہم "حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا" جیسے وسوسۂ شیطانی اور تصور کو بالکل ترک نہیں کرتے، ہم میں سے نہ تو شرکیات و بدعات رفع دفع ہو سکتی نہ ہم توحید و سنّت کی صراطِ مستقیم کو پا سکتے ہیں۔

اسلام کی یہ "صراطِ مستقیم" دریافت کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ خود قرآن مجید کا ترجمہ پڑھیں اور مفہوم سمجھیں، بلکہ اپنی اولادوں کو بھی پڑھائیں سمجھائیں رکھیئے اور پھر یاد رکھیئے کہ کلام اللہ کا مفہوم و مدعا سمجھے بغیر نہ تو تقلید کے شجرۂ خبیث کٹ سکتی ہے اور نہ آپ کے بے شمار اعتقادی اور عملی اختلافات و مناقشا ہو سکتے ہیں۔ تقلید سراپا نفاق و اختلاف ہے اور قرآن سراپا درسِ اخوت وا "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" مسلمانو! سب کے سب مل کر خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور (اس مرکزِ اتحاد سے دور رہتے ہوئے) پراگندہ و منتشر نہ رہو۔

---

[1] ہمیں تو اعتقادی و عملی حیثیت سے وہی کچھ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔"

اقبالؒ کی حکمتِ یقین

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے!

اقبالؔ

اقبال کی حکمتِ یقین

کلامِ اقبال میں "یقین" کا مفہوم و مطلب

علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں اکثر جگہ مسلمان کو "یقین" کی تاکید فرمائی ہے اور "شک" سے منع کیا ہے۔ یاد رہے کہ ہر جگہ "یقین" سے اقبال کی مراد ہے "ایمان" اور "شک" سے مراد ہے "کفر" —— اور یوں بھی غور فرمائیے تو خود قرآن میں جہاں کہیں "ایمان" کی تاکید و تلقین کی جا رہی ہے، اس کا حقیقی مقصد و مدعا "یقین محکم" نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح جہاں کہیں "کفر" کی مذمت پائی جاتی ہے۔ تو اس کا اصل باعث "کافر" کے شکوک و شبہات نہیں تو اور کیا ہے؟ پس اقبال جیسا "مردِ مومن" جب بھی "یقین" کی تلقین کرتا ہے۔ تو اس سے اُس کا اصل مدعا ہے "تجدیدِ ایمان" اور جہاں کہیں "شک" یا "تخمین و ظن" کی تردید و مذمت کی گئی ہے تو اس سے اس کی مراد ہے "کفر"، اب ہم آئندہ دو عنوانات کے تحت اسلامی نقطۂ نظر سے

"یقین" کے مفادات اور "شک" کے مضرات پر بحث کرتے ہیں۔

"یقین" کی اسلامی اہمیت اور اس کے عملی مفادات

حقیقت یہ ہے کہ تمام اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہی "یقین" (ایمان) پر رکھی گئی ہے اور اس کے بغیر انسانی عقائد و اعمال کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ اگر اسلام کو ایک "شجرۂ طیبہ" (پاک درخت) کہیے تو یقین اس درخت کی جڑ ہے۔ فرائض ہوں یا نوافل، اخلاق ہوں یا آداب، تمام انسانی اعمال ہمیشہ چند معین عقائد سے جنم لیتے ہیں۔ جب کسی چیز کے متعلق آپ کا "عقیدہ" یا "تصور" ہی معین و مقرر نہیں تو آپ اس کی آرزو کیا کریں گے؟ اور اس حد تک رسائی کرنے کے لئے قدم کیا اٹھائیں گے؟ — یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بڑے عمل اور ہر اقدام سے پہلے اسلام آپ کے "یقین" کو صحیح اور پختہ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ آپ اپنی محنت اور جدوجہد سے مکمل فائدہ اٹھائیں!

چنانچہ اسلام آپ سے شدت کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ:۔

(۱) آپ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین محکم رکھیں، تاکہ آپ اس کے خالق، مالک، رازق اور مدبر کائنات کی حیثیت میں ان تمام صوری اور معنوی نعمتوں سے خاطر خواہ طور پر فیض یاب ہو سکیں جو اس نے آپ کے لئے پیدا کی ہیں۔ پھر ذات و صفات کے علاوہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے ان تمام "وعدوں" پر بھی یقین کامل ہونا چاہئیے، جو اس نے دنیوی اور اخروی زندگی میں سچے مسلمانوں کے ساتھ کئے ہیں۔ ایسے تمام وعدے کلام اللہ میں مذکور ہیں اور ان میں سب سے بڑا اور اہم وعدہ یہ ہے کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے، کہ ان کو

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ	اسی طرح اپنی زمین کی حکومت و سیادت عطا
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ	کرے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی
لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی	تھی اور جس دین (اسلام) کو ان کے لیے پسند
لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ	کیا ہے، اسے غالب و توانا کرے گا اور دشمنوں
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط	کے خوف و خطرے نجات دے کر انہیں امن و
(پ ۱۸ : ۱۳ ع)	عافیت کی زندگی بخشے گا۔

(۲) آپ تمام انبیائے کرام اور ان کی لائی ہوئی آسمانی کتب کی صداقت و افادیت پر یقین کامل رکھیں، تاکہ آپ اُن تمام احکامِ الٰہی کی پیروی سے زندگی میں راحت و آرام اور سکون و اطمینان حاصل کریں، جنہیں بالفاظِ دیگر نیکیاں (صالحات) کہا جاتا ہے اور اُن تمام بدیوں (سیّئات) سے محفوظ رہیں جو عملاً اور نتیجۃً انسان کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں۔

(۳) آپ حیاتِ بعد الممات اور "جزا و سزا" پر یقینِ محکم رکھیں تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معیّن کردہ "اُخروی انعامات" کی تحصیل کے لئے عملاً کوشاں ہوں اور اس کے عتاب و سزا سے محفوظ و مامون رہیں۔ "نیکی" کا حاصل مفاد یہ ہے کہ وہ صرف دنیا ہی کو انسان کے لئے بہشت نہیں بناتی بلکہ عقبیٰ میں بھی عزت و وقار کے ساتھ بہشت دلاتی ہے۔ بخلاف اس کے "بدی" کی ادنیٰ سزا یہ ہے کہ وہ صرف دنیا ہی کو انسان کے لئے بدتر از دوزخ نہیں بناتی۔ بلکہ عقبیٰ میں بھی ذلت و رسوائی کے ساتھ اسے دوزخ کا ایندھن بنا دیتی ہے اور یوں سچ پوچھئے تو صاحبِ معرفت و بصیرت لوگ محبوبِ حقیقی کے "عتاب" ہی کو دوزخ اور اس کی رضا و خوشنودی ہی کو بہشت قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ مومنؔ نے اسی مقامِ عشق کی صحیح ترجمانی کی ہے:۔

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں تری رحمت کا طالب ہوں
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنّت کا

(۴) اور ان تمام قسم کے شعوب "یقین" کا بہترین حاصل و مفاد یہ ہے کہ ـــــ آپ کو بحیثیت "انسان[1]" اور بالخصوص بحیثیت "مومن" اپنے "مقام و مرتبہ" اور اپنی "ممکناتِ قوّتِ تسخیر" کا نہ صرف "صحیح" "اندازہ" ہو بلکہ "یقینِ محکم" بھی ہو۔

اوّلاً آپ ایک مستند اور مدلّل طریق پر اپنے مقام و مرتبہ کا صحیح اندازہ اور یقین و اذعان ان وجوہ کی بنا پر حاصل کریں کہ :-

(۱) آپ روزِ ازل ہی مسجودِ ملائکہ رہ چکے ہیں جس "آدمِ خاکی" کی شان یہ ہو کہ وہ تخلیقِ کائنات کی ساعتِ اوّل میں فرشتوں کا مسجود اور ابلیس کا محسود بن جائے اس کی عظمت و فوقیت پر کوئی اور دلیل پیش نہ بھی کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہ تو دلیلِ آغاز ہے۔ علاوہ ازیں "عروجِ آدمِ خاکی" کے لئے ہمارے پاس اور بھی عظیم الشان دلائل و شواہد موجود ہیں۔

(۲) آپ حسبِ آیۂ قرآنی روئے زمین پر اللہ تعالےٰ کے "خلیفہ" یا "نائب" د

---

[1] میں نے یہاں صرف وضاحت اور اثر اندازی کے لیے "انسان" اور "مومن" کے دو الفاظ استعمال کر دیئے ہیں، ورنہ غور کیجئے تو مفہوم و معانی کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں جس شخص میں انسانی صفات ہی ناپید ہوں اور جو اللہ تعالےٰ اس کے انبیاء اور کتبِ سماوی کی تعلیمات پر یقین و ایمان ہی نہیں رکھتا، اسے "انسان" جیسے جلیل القدر خطاب ہی کیوں دیا جائے؟ ـــــ بلکہ حسبِ کلامِ الٰہی وہ "انسان" تو ہرگز نہیں، البتہ چوپایہ ضرور ہے، بلکہ اس سے بھی گمراہ تر۔ پس جو شخص "انسان" ہے وہ یقیناً "مومن" بھی ہے اور "مومن" تو اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے انسانِ کامل ہی ہے!

جانشین بھی ہیں۔ اللہ اکبر! نائب بھی کس کے؟ اس ہستی کے جو اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا ہے! اس ہستی کے جو خالق ہر دو سرا ہے، اول و آخر ہے، ظاہر و باطن ہے، حی و قیوم ہے، ہر نقص و عیب سے پاک ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ پر حاکم و متصرف ہے!

غور فرمایئے کہ مخلوق میں سے ایک معمولی بادشاہ کا نائب (وائسرائے) بھی جانشینِ شاہ کی حیثیت سے ملک کے ہر سیاہ و سفید، غلط و صحیح، زشت و خوب اور فساد و امن کا مکمل طور پر ذمہ دار اور جواب دہ ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اس احکم الحاکمین اور شہنشاہِ کا نائب جو اپنے خالق و مالک کے دربار میں قوانینِ الٰہی کے تحت نہ صرف اپنے اعمال کا جوابدہ ہے۔ بلکہ اپنے مقام و مرتبہ کا پاس رکھتے ہوئے قوم اور معاشرہ کے حقوق ادا کرنے پر بھی مجبور ہے۔ بہرکیف "مسجودِ ملائکہ" ہونے کے بعد آپ نائب حق،، کا بلند و ممتاز مرتبہ بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ کو اس مقام و مرتبہ کا پورا علم و شعور ہو، اس کا احترام ہو، اور اس مقامِ رفیع سے آپ پر خالق و مخلوق کے حق میں جو فرائض و واجبات عائد ہوتے ہیں، آپ انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے پورے اخلاص و انہماک سے جدوجہد کریں۔

پس کلام اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر آپ میں اللہ تعالیٰ کا "خلیفہ،، ہونے کا فہم و شعور اور یقین و اذعان نہیں، اور آپ اس مقامِ خلافت و نیابت کے فرائض و واجبات ادا کرنے سے قاصر ہیں، تو آپ کو "انسان" کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ ایسے تمام غافل و بدمست اور غلامِ ہوا و ہوس لوگوں کو زبانِ الٰہی میں چوپایوں سے بھی بدتر و گمراہ تر قرار دیا گیا ہے۔ دلیل ملاحظہ ہو:۔

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ (اے پیغمبر!) کیا تو نے اس شخص کو نہیں

هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۙ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (پ ۱۹ : ۲ ع)

دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ کیا تو اس (کے عمل) کا ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ ایسے لوگ (حق کو) سنتے اور (عقل و شعور رکھتے ہیں؟ نہیں وہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

ہاں۔ تو ایسے ہی "انعام" (چوپائے) بجا طور پر اس چیز کے مستحق ہیں کہ انہیں "احسن تقویم[1]" (بہترین ہیئت انسانی) کے مقام رفیع سے گرا کر "اسفل سافلین" یعنی غفلت و معصیت کے عمیق ترین گڑھوں میں گرا دیا گیا اور یہی ذلت و پستی کیا کم ہے کہ وہ چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیئے گئے؟ یہ ہے اپنے مقام خلافت و نیابت کا احترام نہ کرنے کی کم از کم سزا۔

بہرکیف "نائب حق" کا صحیح مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس کی ممکنات عمل کیا ہیں؟ اور وہ نوع انسانی کو اپنی جد و جہد اور ایثار سے کس قدر وسیع پیمانہ پر فیضیاب کرتا ہے؟۔

اس کا جواب علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل مثنوی میں ملاحظہ ہو:۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است ۔۔۔ بر عناصر حکمراں بودن خوش است

دنیا میں خدا کا خلیفہ ہونا بہت مبارک ہے ۔۔۔ اور عناصر پر حاکم (غالب) ہونا بھی مبارک ہے

---

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ (پ ۳۰ : ع ۲۰)

"بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین شکل و ہیئت میں پیدا کیا۔ پھر (بوجہ گناہ و سرکشی) ہم نے اسے نچلے سے نچلے طبقے میں گرا دیا۔"

گر شتربانی جہاں بانی کُنی　　زیبِ سر تاجِ سلیمانی کُنی

اگر تو شتربان ہے تو نائبِ حق ہو کر جہانبانی کریگا　　اور اپنے سر پہ تاجِ سلیمانی سجائے گا

تا جہاں باشد جہاں آرا شوی　　تاجدارِ مُلکِ لایبلیٰ شوی

جب تک دنیا قائم ہے تو جہاں آرا ہوگا　　اور ایک غیر فانی ملک کا بادشاہ بنے گا

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است　　ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است

خدا کا نائب گویا روحِ عالم ہے　　اور اس کی ہستی خدا کے اسمِ اعظم کا سایہ ہے

از رموزِ جزو و کُل آگہ بود　　در جہاں قائم بامر اللہ بود

وہ جزو و کل کے اسرار سے باخبر ہے　　اور دنیا میں خدا کے حکم سے قائم و دائم ہے

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند　　ایں بساطِ کہنہ را برہم زند

جب وہ دنیا کی وسعت میں اپنا خیمہ گاڑتا ہے　　تو اس کے پرانے فرش کو درہم برہم کر دیتا ہے

فطرتش معمور و می خواہد نمود　　عالمے دیگر بیارد در وجود

اس کی فطرت معمورِ حق ہے اور نمود و اظہار کی آرزومند　　لہٰذا وہ ایک نئی دنیا کو عالمِ وجود میں لاتا ہے

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کُل　　روید از کشتِ خیالِ او چو گُل

جہانِ جزو و کل کی طرح سینکڑوں دنیائیں　　اس کے خیالات کی کھیتی سے پھول کی طرح اگتی ہیں

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را　　از حرم بیروں کند اصنام را

اس کی فطرت ہر خام کو پختہ کر دیتی ہے　　وہ بتوں کو کعبہ سے باہر نکال پھینکتا ہے

نغمہ زا تارِ دل از مضرابِ او　　بہرِ حق بیداریٔ او خوابِ او

تارِ دل اس کی مضراب سے نغمے پیدا کرتا ہے　　اور اس کا جاگنا اور سونا سراسر رضائے حق کیلئے ہے

شیب را آموزد آہنگِ شباب　　می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

وہ بڑھاپے کو بھی جوانی کے انداز سکھاتا ہے　　اور دنیا کی ہر چیز کو رنگِ شباب عطا کرتا ہے

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

وہ نوعِ انسانی کو خوشخبری سنانے والا بھی ہے ڈرانے والا بھی وہ سپاہی بھی ہے، سپاہ گر بھی اور قائدِ لشکر بھی

مدعائے علم الاسما ستے [1] سرِّ سبحان الذی اسریٰ ستے

وہ علمِ اسما کا حقیقی مقصد و مدعا ہے وہ آیۂ معراج النبیؐ کا راز بھی ہے

از عصا دستِ سفیدش محکم است قدرتِ کامل بعلمش توام است

اس کا سفید ہاتھ عصا سے مضبوط و توانا ہے اور قوت و اختیارِ کامل اس کے علم سے ہم آہنگ ہے

چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار تیز تر گردد سمندِ روزگار

جب وہ شہسوار اپنے ہاتھ میں باگ لیتا ہے تو اسپِ زمانہ کی رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے

خشک سازد ہیبتِ او نیل را می برد از مصر اسرائیل را

اس کی ہیبت و دہشت نیل کو بھی خشک کر دیتی ہے اور وہ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال لے جاتا ہے

از قُمِ او خیزد اندر گورِ تن مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

اس کی صدائے قم سے جسم کی قبر میں مردہ روحیں یوں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جیسے چمن میں صنوبر

ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است از جلالِ او نجاتِ عالم است

اس کی ذات وجودِ عالم کی صحیح تعبیر ہے اور اسی کے جلال سے دنیا کی نجات ہے

ذرہ خورشید آشنا از سایہ اش قیمتِ ہستی گراں از مایہ اش

اس کے سایہ سے ذرہ بھی آفتاب کا ہمدم ہے اور اس کے سرمایہ سے زندگی کی قیمت بڑھ جاتی ہے

زندگی بخشد ز اعجازِ عمل می کند تجدیدِ اندازِ عمل

وہ اعجازِ عمل سے دنیا کو حیاتِ نو بخشتا ہے اور یہاں اندازِ عمل کو نیا رنگ ڈھنگ عطا کرتا ہے

---

[1] وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا " اور خدا نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتا دیئے۔"

جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او　　صد کلیم آوارۂ سینائے او

اس کے نقشِ پا سے بے شمار جلوے پیدا ہوتے ہیں　　اور سینکڑوں کلیم اس کے طور کی تلاش میں رہتے ہیں

زندگی را می کند تفسیرِ نو　　می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

وہ زندگی کی ایک نئی تفسیر سمجھتا ہے　　اور وہ اس خواب کی نئی تعبیر بیان کرتا ہے

ہستیِ مکنونِ او رازِ حیات　　نغمۂ ناشنیدہ سازِ حیات

اس کی پوشیدہ ہستی ہی رازِ حیات ہے　　اگرچہ وہ ابھی سازِ زندگی کا اَن سنا نغمہ ہے

طبعِ مضموں بندِ فطرت خوں شود　　تا دو بیتِ ذاتِ او موزوں شود

فطرت کی مضمون بند طبیعت خون ہو جاتی ہے　　تب کہیں جا کر اس کی ذات کے دو شعر موزوں ہوتے ہیں

مشتِ خاکِ ما سرِ گردوں رسید　　زیں غبار آں شہسوار آید پدید

ہماری مشتِ خاک آسمان پر جا چڑھی　　اور اس غبار سے وہ شہسوار نمودار ہوتا ہے

خفتہ در خاکسترِ امروزِ ما　　شعلۂ فردائے عالم سوزِ ما

ہمارے آج کی راکھ میں ہمارے کل کا　　عالم سوز شعلہ رنائبِ خفی ، سویا ہوا ہے

غنچۂ ما گلستاں در دامن است　　چشمِ ما از صبحِ فردا روشن است

ہمارا غنچہ اپنی آغوش میں گلستاں سمیٹے ہوئے ہے　　اور ہماری آنکھ صبحِ فردا کے نور سے روشن ہے

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

اے اسپِ زمانہ کے شہسوار ہمارے پاس آ　　اے چشمِ عالم کے نور ہم میں نمودار ہو

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

اور دنیا کے ہنگامۂ ایجاد کی رونق بن　　اور آنکھوں کی سیاہی میں آباد ہو جا

شورشِ اقوام را خاموش کن　　نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

آ اور اقوامِ عالم کے ہنگامۂ اختلافات کو خاموش کر　　اور اپنے نغمۂ محبت کو بہشتِ گوش بنا دے

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ
اٹھ اور اب اخوت کا نغمہ چھیڑ دے — اور شرابِ محبت کا جام ہمیں پھر دے

باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویان را بدہ پیغامِ صلح
دنیا میں دوبارہ امن و صلح کے دن لا — اور جنگجو لوگوں کو پیغامِ صلح سُنا۔

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی
نوعِ انسانی ایک کھیتی ہے اور تُو اس کا حاصل — اور زندگی کے قافلے کی منزل بھی تُو ہی ہے

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر — چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر
خزاں کے ظلم سے درخت کے پتے بھی جھڑ گئے — تُو ہمارے باغ میں بادِ بہار بن کر آ

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر — از جبینِ شرمسارِ ما بگیر
تو بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے سجدے — ہماری شرمندہ و بدنام پیشانیوں سے قبول کر

از وجودِ تو سرافرازیم ما
ہم تیرے ہی وجود سے باعزت و سربلند ہیں
پس بہ سوزِ ایں جہاں سوزیم ما (اسرارِ خودی)
اور بعد ازاں ہم اسی سوز سے دنیا کو جلا سکتے ہیں

(۳) آپ کو اپنے مقام و مرتبہ کی بلندی کا یقین اس لئے بھی ہونا چاہیئے کہ آپ حاملِ کتابِ الٰہی اور امانت دارِ دستورِ شریعت ہیں اور آپ کو اس منصب کا حق ادا کرنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اللہ کی کتاب کو دنیا میں لانے اور انسانیت تک پہنچانے والی ہستی پیغمبر ہی کی معین و مخصوص ہستی ہوا کرتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر دہ "امانتِ الٰہی" قوم کے سپرد کرتے ہوئے اور اپنا فرضِ منصبی بوجہِ احسن ادا کرتے ہوئے اپنے "رفیقِ اعلیٰ" سے واپس جا ملا۔ اوّل تو روزِ ازل

ہی "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ"[1] کے جواب میں "بلیٰ"[2] کہہ کر آپ دستورِ شریعت اور احکامِ الٰہی کے پابند ہو چکے ہیں، مگر بعد ازآں کتابِ حق کی قبولیت سے بھی آپ اس مقدس "امانت"[3] کے حامل ہو چکے ہیں، جس کی ذمہ داری قبول کرنے سے تمام کائنات خائف ہو گئی تھی۔ دلیل ملاحظہ ہو:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (پ ۲۲: ۶ ع)	ہم نے آسمان، زمین اور پہاڑوں کے سامنے اپنی امانت[3] پیش کی۔ لیکن انہوں نے اس کے اٹھانے (ذمہ داری قبول کرنے) سے انکار کر دیا اور اس (کی عظمت و بزرگی) سے خائف ہو گئے لیکن انسان نے (جھٹ) اس کو اٹھا لیا۔ بیشک وہ بڑا ظالم[4] اور جاہل ہے!

---

[1] کیا میں تمہارا سچا معبود و پروردگار نہیں ہوں؟ [2] بے شک تو ہی ہے [3] مراد دستورِ شریعت، فرائض و احکامِ الٰہی۔ [4] "ظالم" اور "جاہل" کی صحیح و مستحسن تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان نے اپنے نفس پر ظلم و تشدد اور جبر کرتے ہوئے بھی بھاری "امانت" کی گرانباری و ذمہ داری کو قبول کر لیا اور پھر مقتضیاتِ توحید کی تعمیل میں غیر اللہ سے "جاہل" (بے خبر) ہوا۔ اگر "ظالم و جاہل" کا یہ مفہوم نہ لیا جائے اور وہی لیا جائے جو لغات میں ہے یا جو عام طور پر مروّج ہے۔ تو پھر (معاذ اللہ) خود انبیائے کرام پر یہ مفہوم بدرجۂ اولیٰ چسپاں ہو گا۔ کیونکہ کتبِ سماوی اور دستورِ شریعت کے حاملِ اوّل تو وہی رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی شانِ نبوت کے سراسر منافی ہے۔ پس مجھے تو مذکورہ مفہوم ہی پر اصرار ہے اور غالباً علّامہ اقبال کا مندرجہ ذیل شعر بھی اسی کا موید ہے:۔

سختیاں سہتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں — آہ! کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں!

اور جب انسان نے دنیا کے اسباب غفلت و معصیت میں غرق ہو کر اس عظیم امانت کی عظمت و اہمیت، افادیت اور تعمیری خصائص کا احساس نہ کیا اور نہ ہی اس کے احترام میں کوئی عملی ثبوت پیش کر سکا، تو اللہ تعالےٰ نے اس کے معنوی جلال و ہیبت کا بالفاظِ ذیل اندازہ کراتے ہوئے اس کی پشتِ غفلت پر ایک اور تازیانہ لگایا:۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝

(پ ۲۸ : ۶ ع)

(اے پیغمبرؐ) اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے (حالانکہ پہاڑ جمادات میں سے ہے) تو تُو دیکھتا کہ وہ اللہ کے ڈر سے جھک رہا ہے اور پھٹ رہا ہے اور ہم لوگوں کے لئے یہ مثالیں اس غرض سے بیان کرتے ہیں کہ وہ (بحیثیت انسان) اپنے مقام و مرتبہ کو سمجھیں اور قرآن کے متعلق (اپنی ذمہ داریوں پر) غور و فکر کریں۔

پس اس بحث کا حاصل و مقصد یہ ہے کہ آپ خدا کی عظیم ترین نعمت و امانت (قرآن مجید) کے حامل ہیں، اور آپ کے دل میں امانتِ شریعت کا نہ صرف یقینِ محکم ہونا چاہیئے، بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی فکر بھی! پس یہ "حفظِ امانت" بھی آپ کے مقام و مرتبہ پر ایک اور قابلِ فخر دلیل ہے!

(۴) آپ کو اپنے مقام و مرتبہ کی رفعت و عظمت کا یقین اس لئے بھی ہونا چاہیئے کہ آپ ہی کی جنس و نوع سے بڑے بڑے اولوالعزم، برگزیدہ اور رفیع الشان پیغمبر صدیق، شہید، صلحاء اور مصلحینِ نوعِ انسانی پیدا ہوئے اور بجز پیغمبر تا قیامت پیدا ہوتے رہیں گے!

(۵) آپ کو اپنے مقام کی رفعت کا احساس و یقین اس لئے بھی ہونا چاہیئے۔ کہ

آپ خلیفۂ الٰہی، نائبِ حق، حاملِ دستورِ سماوی، احسنِ تقویم (بہترین شکل و ہیئت) اشرف المخلوقات اور حاکم و متصرّفِ اشیائے عالم ہونے کے لحاظ سے روحِ وجود، مظہرِ موجودات اور مقصود و مطلوبِ کائنات ہیں۔ بالفاظِ دیگر ارض و سما میں سب کچھ آپ ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے اور آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ عالمِ وجود میں صرف آپ ہی خالقِ کائنات کا حقیقی نصب العین ہیں، آپ ہی مقصدِ تخلیق ہیں اور تمام مخلوق کی سیادت و رہبری آپ ہی کے سپرد کی گئی ہے۔ فطرت نے اپنی ماہرانہ صناعی، تکمیلِ حسنِ صورت اور سیرابیِ حسنِ معنوی کے ہزارہا دشوار گذار مرحلے طے کر کے اپنا جو منفرد "شاہکار" تیار کیا، وہ آپ کا وجودِ مسعود ہے۔ پس جب آپ کی خودی "(اَنا)" ہی مقصود و مطلوبِ کائنات ہے تو آپ کو اپنی عظمت و رفعت کا مکمل اندازہ اور پختہ یقین کیوں نہ ہو؟

پس ان تمام مستند قسم کے اسلامی اور قرآنی دلائل و شواہد سے ایک معیّن اندازہ ہو گیا کہ کائنات میں بحیثیتِ "انسان" آپ کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ آپ کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ اور آپ کو ان تمام ازلی و فطری حقوق پر کس قدر "یقینِ محکم" ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے بھی نہایت واضح الفاظ میں فرمایا:۔

ضمیرِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست

خدا کے حکمِ کُن "کا مرجع تیرے سوا اور کوئی نہیں ہے

نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست

غائب خدا کو موجود و مشہود صرف تو نے کیا ہے

قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست
زندگی کے راستے میں قدم پوری بے باکی سے رکھو
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست (پیامِ مشرق)
اس لئے کہ وسعتِ عالم میں تیرے سوا کچھ نہیں ہے

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر
اپنی عظمت و قوت کو سمجھو اور دنیا کے اس جنگل سے ڈرتا ہوا نہ گذرو
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست
کیونکہ یہاں وجودِ حقیقی تو صرف تیرا ہے اور دونوں جہاں کوئی چیز نہیں

اور پھر اردو کلام میں بھی ایک جگہ کس قدر زوردار، مبنی بر حقیقت اور لبریزِ یقین" الفاظ میں آپ کو "مقامِ انسانی[1]" کا یقین دلایا جا رہا ہے:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے!
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے!
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے!

---

[1] میں کسی اور جگہ عرض کر چکا ہوں کہ "انسان" اور "مومن" ایک ہی ہستی کے دو خطاب ہیں۔ جو شخص "مومن" نہیں اسے "انسان" نہیں کہا جا سکتا۔

مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے!
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے!
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے!
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے!
یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے!
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (بانگِ درا)

اور بنابریں علامہ اقبال یہ دعویٰ باندھنے میں بھی سو فیصدی حق بجانب ہیں کہ جب تک آپ "انسان" کا صحیح مقام و مرتبہ نہ سمجھیں اور اس کی ممکنات پر یقینِ محکم نہ رکھیں؛ آپ نہ تو خدا کی ذات و صفات کو پہچان سکتے ہیں، اور نہ اس تک آپ کی رسائی ممکن ہے بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کا عرفان اور اس پر ایمانِ کامل اسی وقت ممکن کہ پہلے آپ "آدمی" کا مقام سمجھیں اور خود کو پہچانیں۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو   تری نظر سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام ([illegible])

یعنی جب تیری نظر سے آدمی کا مقام ہنوز مخفی ہے۔ تو خدا تک تیری رسائی میرے نزدیک بالکل مشکوک و مشتبہ ہے!

اور پھر اس "عرفانِ نفس" اور "عرفانِ حق" کا مقصدِ اعلیٰ یہ ہے کہ :۔

نمود اُس کی نمود تیری، نمود تیری نمود اس کی
خدا کو تُو بے حجاب کر دے، خدا تجھے بے حجاب کر دے! (اقبال)

اور جب اللہ تعالےٰ نے انسان کے پیکرِ خاکی میں اپنی روح پھونکی ہے، اور یہ اس کی صفات کا بہترین مظہر و آئینہ دار ہے، تو پھر اس فطری ممکنات کی نمود خدا کی نمود کیوں نہ ہو، اور خدا کی نمود مومن کی نمود کیوں نہ ہو! پس ایمان و یقین کا یہی ازلی واسطہ خدا اور انسان ہر دو کو منصۂ شہود پر لاتا ہے! مومن صفاتِ خداوندی کو اپنے کردار سے نمایاں تر کرتا ہے، اور خدا مومن کی فطری اور طبعی ممکناتِ تسخیر کو چشمِ عالم پر روشن کرتا چلا جاتا ہے!

اب رہا یہ مسئلہ کہ آپ کی ممکناتِ تسخیر کس قدر وسیع و بسیط ہیں؟ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ جب حسبِ کلام اللہ اور حسبِ تجربہ و مشاہدہ کائنات کی تمام اشیاء آپ ہی کی خادم و محکوم ہیں اور مخلوقاتِ زمین تو کیا۔ آسمان کے شمس و قمر تک کو آپ کے لئے "مسخّر" کر دیا گیا ہے۔ تو لازمًا آپ کا عمل، آپ کا جذبۂ تحقیق و جستجو اور آپ کی قوتِ تسخیر بھی غیر محدود ہے۔ اس سلسلے میں انسان نے آج تک جو کچھ مسخر کر لیا وہ مبارک، لیکن ابھی نجانے کیا کچھ اور کتنا کچھ اس کی تحقیق و جستجو اور فتح و تسخیر کے لئے بیتابی سے چشم انتظار وا کئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کے ذوقِ جستجو اور قوتِ تسخیر کو للکار کر فرمایا۔

---

[1] قرآنِ مجید میں اس مفہوم کی آیات بکثرت موجود ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے آسمان و زمین کی تمام مخلوقات کو انسان کے لئے "مسخّر" کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ آسمان و زمین کی کائنات میں غور و فکر کرو، ان کے باطن کی تحقیق کرو اور ان سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں!
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں!
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں! (بالِ جبریل)

اور ان فارسی اشعار میں یہی مفہوم و مقصد زیادہ بلیغ و موثر انداز میں بیان فرمایا۔

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز
اے کہ تو ساحل پہ آرام سے بیٹھا ہے، اٹھ کھڑا ہو
کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
کیونکہ ابھی تجھے بھنور اور مگرمچھ سے دوچار ہونا ہے
از سرِ تیشہ گذشتن زخردمندی نیست
تیشہ چھوڑ کر بیٹھ رہنا عقلمندی کی علامت نہیں

لے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز

ابھی تو بہت سے ہیرے کان کے اندر چھپے ہوئے ہیں

شک وشبہ کے خبائث ومضرات

اب تک آپ پر "اسلامی" اور "عقلی" ہر دو لحاظ سے "یقین" کے انفرادی اور اجتماعی فوائد واضح کئے گئے ہیں۔ بعد ازاں یہ دیکھنا ہے کہ "یقین" کی ضد اور مخالف چیز یعنی "شک" سے انسانی زندگی میں کیا کیا خبائث ومضرات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر "یقین" کو عین "ایمان" کہیئے تو شک عین "کفر" ہے۔ اور اس کفر سے جو اعتقادی، عملی، نفسیاتی روحانی، اخلاقی اور صحی ضعف وزوال انسان پر طاری ہوتا ہے، اس کی باقاعدہ تفصیل درج ذیل ہے:-

(۱) مبتلائے شک وشبہ شخص اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، کتبِ سماوی، حیاتِ بعد الممات، حشر ونشر اور جزا وسزا کے متعلق بالکل مذبذب اور بے یقین رہتا ہے۔ لہٰذا ملحد ہونے کی بنا پر ان مذہبی وملی اعتقادات کے اُن تمام عملی فیوض وبرکات سے محروم رہتا ہے جن سے ایک "مومن" بہرہ ور ہے۔

(۲) چونکہ ایسا شخص اپنے مقامِ خلافت ونیابت کے متعلق بھی مبتلائے شک وشبہ رہتا ہے، لہٰذا وہ ان مقاصدِ ہستی اور فرائضِ زیست کو بجا نہیں لا سکتا، جو "نائبِ حق" پر فطرتاً اور پیدائشاً عائد کئے گئے ہیں۔

(۳) ایسا شخص چونکہ اپنے شکوک وشبہات اور تذبذب کی وجہ سے اپنے لئے کائنات میں "اشرف المخلوقات" کا مقام ومرتبہ نہیں پا سکا۔ لہٰذا وہ اس سیادت وقیادت سے بھی محروم رہا جو اسے تمام اشیائے عالم پر عطا کی گئی ہے۔ بنا بریں وہ "اشرف المخلوقات" نہ رہا بلکہ اس مرتبہ کی توہین سے "ارذل المخلوقات" (رذیل ترین مخلوق) ہو گیا۔ یہاں وہ مدارجِ

ہستی کے "اسفل السافلین" "اپست ترین گڑھے" میں پڑا ہوا ناموسِ زندگی کا نوحہ کر رہا ہے۔

(۴) ایسا مبتلائے شک و شبہ شخص چونکہ اپنی ممکناتِ عمل، قوتِ تسخیر اور تحصیلِ مقاصد کے متعلق بھی مذبذب ہے، لہٰذا بطورِ نتیجہ اس میں قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی مفقود ہو جاتی ہے۔ طبیعت پر مایوسی اور افسردگی طاری رہتی ہے، ایک بلا وجہ اور مسلسل خوف و ہراس کا غلبہ رہتا ہے، غم و اندوہ دل و دماغ کو گرفت میں لئے رہتا ہے، اقدام کی جگہ پسپائی اور ذوقِ فتح کی بجائے احساسِ شکست حواس کو گھیرے رہتا ہے اور پھر بس صورتِ حال کا ثمرہ ہے۔ اپنے ہم چشموں اور معاشرہ میں احساسِ کمتری جو ہر موضوع پر ناکامی و نامرادی سے دوچار ہوتا ہے۔

(۵) اور اس سلسلے میں آخرکار ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جو شخص اپنے مقام و مرتبہ اور ممکناتِ عمل ہی کے متعلق مبتلائے شک و شبہ رہتا ہے، اسے اپنے ماحول کی تمام اشیاء بلکہ کائنات کی تمام چھوٹی بڑی مخلوق موضوعِ شک و شبہ کیونکر معلوم نہ ہوگی؟ دنیا کے خارجی تاثرات تو ایک عکس و آئینہ ہوا کرتے ہیں انسان کے اپنے داخلی اور ذہنی تاثرات کا۔ پس جو شخص خود سراپا یاس و اوہام ہے اسے دنیا کی ہر دوسری چیز بھی مرکزِ یاس و نامرادی دکھائی دے گی، اور اس لحاظ سے وہ ننگِ ہستی ہے، قوم کا عضوِ معطل ہے، معاشرہ پر ناروا بوجھ ہے، اور دیگر ہم جنسوں کے لئے یاس و قنوطیت کا ایک زہریلا کیڑا ہے۔

ذہن و مزاج کی اسی افسوسناک ہیئتِ ترکیبی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:-

فارغ از اندیشۂ اغیار شو — قوتِ خوابیدۂ بیدار شو

تو غیروں کے خوف و خطرے آزاد ہو جا — تو ایک سوئی ہوئی طاقت ہے بیدار ہو جا

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد ۔۔۔ شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

جب پتھر نے خود پر شیشہ ہونے کا گمان کیا ۔۔۔ وہ شیشہ ہوگیا اور ٹوٹنا پھوٹنا اپنا مقدر بنا لیا

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد ۔۔۔ نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

ایک راہرو نے جب خود کو کمزور سمجھ لیا ۔۔۔ تو اس نے اپنی جان کی پونجی رہزن کو سپرد کردی

تا کجا خود را شماری ما و طیں؟ ۔۔۔ از گلِ خود شعلۂ طور آفریں!

تو کب تک خود کو پانی اور مٹی سمجھتا رہے گا؟ ۔۔۔ اپنی مٹی سے شعلۂ طور پیدا کر!

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است ۔۔۔ سیل را پست و بلندِ جادہ چیست

اگر ہمت بلند ہو تو راستے کا پتھر بھی پانی ہے ۔۔۔ موج کے لیے راہ کا نشیب و فراز کیا معنی رکھتا ہے

سنگِ رہ گردد فسانِ[1] تیغِ عزم ۔۔۔ قطعِ منزل امتحانِ تیغِ عزم

ارادے کی تلوار کے لیے راستے کا پتھر گویا سان بن جاتا ہے ۔۔۔ منزل کو کاٹنا طے کرنا تیغِ عزم کا امتحان ہے

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود؟ ۔۔۔ گر بخود محکم نہ بودن چہ سود؟

حیوان کی طرح کھانے اور آرام کر لینے کا کیا فائدہ ۔۔۔ اگر تو مضبوط و توانا نہیں تو پھر زندگی کا کیا فائدہ

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو ۔۔۔ گر بقا خواہی بخود آباد شو!

اگر تو فنا چاہتا ہے تو اپنے سے غافل و بے خبر ہوجا ۔۔۔ اگر بقا چاہتا ہے تو اپنی خودی کو پہچان

چیست مردن؟ از خودی غافل شدن ۔۔۔ تو چہ پنداری فراقِ جان و تن!

مرنا کیا ہے؟ خودی سے غافل ہو جانا! ۔۔۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ جسم و روح کی جدائی کا نام موت ہے!

در خودی کن صورتِ یوسفؑ مقام ۔۔۔ از اسیری تا شہنشاہی خرام

یوسفؑ کی طرح اپنے نورِ خودی میں مقیم ہو ۔۔۔ اور پھر قید سے نکل کر بادشاہی کے مرتبے کو پہنچ جا

---

[1] وہ پتھر جس پر چھری اور تلوار وغیرہ تیز کرتے ہیں۔

از خودی اندیش و مردِ کار شو

اپنی خودی کو پہچان اور کام کا آدمی بن

مردِ حق شو، حاملِ اسرار شو (اسرارِ خودی)

خدا کا مطیع ہو اور اسرارِ شریعت کا حامل

غلبۂ شکوک و اوہام کی اصل وجوہ اور ان کا علاج

شک و شبہ کے ہولناک اور تباہ کن مفاسد و مضرات کا مطالعہ کر لینے کے بعد، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شکوک کے اصل اسباب کیا ہیں؟ اور پھر انہیں کن ذرائع سے نیست و نابود کیا جا سکتا ہے؟ بالفاظ دیگر یہ کہ شک کن کن ذرائع سے انسان کے دل و دماغ پر غلبہ پاتا ہے اور پھر مرضِ شک کا صحیح و موزوں علاج کیا ہے؟ —— اس سوال کا مختصر مگر جامع اور مستند جواب درج ذیل ہے:۔

(۱) اس سلسلے میں غلبۂ شکوک و اوہام کی پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ اس قرآنِ مجید کے مفہوم و معانی اور تعلیمات سے اب تک بے خبر ہیں جس کا بنیادی مقصد و مدعا ہی آپ کے "یقین و ایمان" کو پختہ کرنا ہے۔ اگر آپ مرضِ شکوک و اوہام کا موثر ترین علاج چاہتے ہیں تو اپنی پہلی فرصت میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر پڑھیں۔ اگر آپ اتنی تکلیف بھی گوارا کرنے کے لئے آمادہ نہیں، تو یاد رکھیئے کہ آپ ہمیشہ افواجِ شکوک و اوہام میں گھرے رہیں گے اور آپ کو یقین و اطمینان کسی قیمت پر میسر نہیں ہوگا۔

(۲) غلبۂ شکوک و اوہام کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ابھی تک آپ نے ان مقدس ہستیوں کی سیرت کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا جنہوں نے مخزنِ یقین و ایمان یعنی قرآن پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ تمام فرائضِ حیات ادا کئے جو نعمتِ یقین کا لازمی حاصل و ثمر ہیں۔ پس اگر آپ شکوک کو زائل کرنا اور قوتِ یقین سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو کم از کم

سیرتِ نبویؐ، سیرِ خلفائے راشدین اور حالاتِ صحابہؓ کا ضرور مطالعہ کریں۔ ان برگزیدہ ہستیوں کی سوانح عمریاں "یقین" کی معجزنما قوت کے بے مثال شاہکار ہیں۔ اہمتِ عظمتِ اسلاف کا مطالعہ آپ کی روحِ یقین میں ایک حیاتِ نو پیدا کر دے گا!

(۳) غلبۂ شکوک و اوہام کی تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ ابھی تک ان زندہ اہل اللہ اور صاحبِ دل بزرگوں کے "فیضِ صحبت" اور "سوزِ نظر" سے محروم ہیں جو اپنے عقیدتمندوں اور ہم نشینوں میں ہر لحظہ یقین و ایمان کے خزانے لٹا رہے ہیں۔ اثرِ صحبت سے کس کو مجال انکار ہے۔ اور پھر خصوصاً اہلِ دل کی صحبت جو دل و دماغ کو برق رفتاری سے منقلب کر دیتی ہے اور بدترین دہریوں اور فاسقوں کو چشم زدن میں بہترین مومن اور متقی بنا دیا کرتی ہے۔ یہاں تو شکوک و شبہات کے انبار سے کر آؤ اور انہیں چشم زدن میں تلف کر کے یقین و ایمان کی مستقل کانِ جواہر لے کر اٹھو۔ یہ کوئی مبالغہ آمیز خیال آرائی نہیں بلکہ وہ حقیقتِ بینہ ہے جس پر گذشتہ اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی سیرتیں آج بھی شاہد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے خود صحابۂ کرام کے عقائد و افکار کی کیا حالت تھی؟ کیا ان کے دل و دماغ بدترین قسم کے شکوک و اوہام کی آماجگاہ نہیں بنے رہتے تھے؟ —— اور وہ تمام بے بنیاد اور بے سند شکوک و اوہام رفع کس چیز سے ہوئے؟ —— آنحضرتؐ کے فیضِ صحبت سے جو ہمہ وقت نعمتِ یقین سے لاامال تھی، اور جہاں شک ایک لمحہ کے لئے بھی دخل نہیں پا سکتا تھا۔ چونکہ حسبِ ارشادِ رسولؐ علمائے حق اور صلحائے امت بھی معنوی طور پر وارثِ انبیاء ہیں۔ لہٰذا ان کی مجلس میں بھی شکوک و شبہات کو زائل کرنے اور یقین و اذعان کو مستحکم کرنے کا مکمل سامان موجود ہے۔ ضرورت صرف اس چیز کی ہے کہ آپ پورے ذوق و شوق اور حسنِ عقیدت سے ایسے مخلص اہل اللہ کی مجلس میں پہنچیں۔ اور پھر "جمالِ

ہم نشین۔ خود بخود آپ کے دل و دماغ پر تجلی ریز ہوگا۔ سعدی نے کیا خوب کہا ہے:۔

گِلے خوشبوئے در حمام روزے	رسید از دستِ محبوبے بدستم
ایک دن حمام میں خوشبو دار مٹی	ایک معشوق کے ہاتھوں میرے ہاتھ آئی
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری!	کہ از بوئے دلآویز تو مستم
میں نے اس سے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر؟	کہ میں تیری دلپذیر خوشبو سے مست ہو رہا ہوں
بگفتا من گِلِ ناچیز بودم	ولیکن مدتے با گُل نشستم
اس نے کہا کہ میں تو ناچیز مٹی ہی تھی	لیکن میں ایک مدت پھول کی صحبت میں رہی

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد

پس میرے ہم نشین کا حسن مجھ میں سرایت کر گیا

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں جو کہ ہوں،

اور جب اہل اللہ لوگ شک کو یقین سے، یاس کو امید سے، غم کو خوشی سے، کفر کو ایمان سے، بلکہ یوں کہیے کہ موت کو زندگی سے بدل دیتے ہیں تو پھر اس میں کیا وجہِ شبہ ہے کہ وہ اپنی "موجِ نفس" (پھونک) سے بجھی ہوئی شمع کو روشن بھی کر سکتے ہیں:۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی

الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں!

پس ان "خرقہ پوشوں" کے پاس عقیدت و ارادت سے جائیے، اور پھر وہ اپنے ایمان کے "ید بیضا" سے یقین کی تجلیات بکھیر کر آپ کے شکوک و شبہات کی

تمام گمراہ کن اور اضطراب انگیز نا کیوں کو یکسر فنا کر دیں گے :

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں گویا آستینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

اور سیرتِ اولیاء اللہ سے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ یہاں تو ایک نگاہ غلط انداز سے بھی تقدیر منقلب ہو جاتی ہیں :-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(۴) غلبہ شکوک و اوہام کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک آپ کو کسی "صاحب یقین" اور "اہل دل" کی مجلس تو نصیب نہیں ہوئی، لیکن آپ کا رابطہ و تعلق اور گفتگو کسی ایسے شخص یا معاشرہ سے ہے جو فکر و عقیدہ کے لحاظ سے "قنوطی" یعنی نا امید اور یاس پسند ہے، چونکہ ایسی مجلس میں ہر قول اور ہر فعل "یقین" کے خلاف اور شک و شبہ کی حمایت میں ہوگا، لہٰذا لازماً آپ کا دل و دماغ بھی شکوک و اوہام سے مسموم ہوتا رہے گا۔ اور آپ ہی فرمائیے کہ جب آپ کی نشست و برخاست اور بود و باش کا تمام ماحول ہی متعفن ہو تو آپ کے دل و دماغ کیونکر صحت مند رہ سکتے ہیں؟ آپ "عطار" کے پاس تو کبھی بیٹھے نہیں کہ اس کی خوشبوئیں آپ کے مشامِ جان کو معطر کریں۔ لیکن آپ لوہار کے یہاں ضرور بیٹھتے ہیں، جس کی بھٹی سے چنگاریاں اڑ اڑ کر آپ کے کپڑوں کو جلائیں اور دھواں طبیعت کو پریشان کرے۔

بہر کیف ایسے مغلوبِ شکوک اور یاس پسند لوگوں سے حاصل کردہ مرضِ

شک کا علاج بھی فقط یہ ہے کہ آپ ان کی مجلس و ملاقات سے فوراً کنارہ کش ہو جائیں ورنہ وہ وبائی جراثیم کی طرح آپ کو ہلاک و برباد کر دیں گے۔ علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل شعر اسی موضوع پر چسپاں ہو رہا ہے:۔

تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہیں زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

ترجمہ:۔"جب کوئی شاہین کا بچہ قفس میں دانے دنکے پر قناعت کرے تو اس کا جسم چکورے کے پروں کے سایہ سے بھی کانپنے لگتا ہے۔"

(۵) غلبۂ شکوک و اوہام کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ آپ نے ذخائرِ نظم و نثر میں سے کوئی ایسی کتاب پڑھ لی ہے جس کا بنیادی عنصر قنوطیت (یاس و ناامیدی) ہے اور یہ فلسفہ آپ کے دل و دماغ پر بری طرح سے حاوی ہو گیا ہے۔ مشرق و مغرب میں ایسے فلسفی، شاعر اور مصنف ہو گذرے ہیں جن کی تحریریں یاس و ناامیدی، غم و اندوہ، افسردگی و نامرادی، مجبوری و بیچارگی، تذبذب اور شکوک و اوہام کے مضامین سے معمور ہیں۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا سرسری مطالعہ بھی یقین و امید کی بربادی اور بے بنیاد شکوک و اوہام کے غلبہ و استحکام کے لئے کافی ہے۔ کہیں برکلے آپ کو تلقین کر رہا ہے کہ کائنات اور تمام اشیائے مادی محض خیال و واہمہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ سب ہمارے ارتسامات ذہنی ہیں ورنہ حقیقتاً کوئی چیز ٹھوس وجود نہیں رکھتی۔ غالب کا مندرجہ ذیل شعر اسی فلسفہ کا ترجمان ہے:۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

گویا اس فلسفہ کی رو سے تمام نظامِ ہستی اور اشیائے کائنات محض "فریبِ خیال"

کی حیثیت رکھتی ہیں اور جب یہی عقیدہ ہو تو انسانی زندگی بذاتِ خود ایک واہمہ ہے!
پھر جب فلسفۂ شوپن ہار کی طرف نظر کیجئے تو وہ زندگی کے ہر پہلو سے مایوس ہو کر فقط موت کو تمام بیماریوں اور تکلیفوں کا علاج بتاتا ہے۔ گویا بالفاظِ غالب:۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک!

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اور اس لئے علامہ اقبال جیسے مردِ مومن اور علمبردارِ رجائیت کو شوپن ہار کے متعلق لکھنا پڑا کہ:۔

شوپن ہار و نیٹشا[1]

مُرغکے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید
ایک پرندہ اپنے گھونسلے سے سیرِ چمن کے لئے اڑا
خارے ز شاخِ گُل بہ تنِ نازکش خلید
اور شاخِ گُل سے ایک کانٹا اس کے نازک جسم میں چبھ گیا

---

[1] شوپن ہار ایک جرمن فلسفی ہے اور اس کا فلسفہ سراپا یاس و قنوطیت چنانچہ نیٹشے کا فلسفہ اسی کا ردِ عمل ہے اور اس نے یقین و رجائیت اور فتح و تسخیر کا وہ آتشیں درس دیا ہے کہ علامہ اقبال سے پیشتر دنیا کے تمام لٹریچر میں اس کی مثال ہی نہیں۔ [2] مراد شوپن ہار

بدگفت فطرتِ چمنِ روزگار را

اتنے ہی پر اس نے باغِ زمانہ کی فطرت وطینت کو برا بھلا کہا

از دردِ خویش و ہم ز غمِ دیگراں تپید

وہ اپنے دکھ درد اور دوسروں کے غم و رنج سے بھی تڑپا کیا

داغے ز خونِ بے گنہے لالہ را شمرد

اس نے گلِ لالہ کو کسی بے گناہ کے خون کا داغ سمجھا

اندر طلسمِ غنچہ فریبِ بہار دید

اور غنچے کے جادو میں بہار کے مکر و فریب دیکھے

گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج

اس نے کہا کہ اس سرائے دنیا میں جس کی بنا ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے

صبحے کجا کہ چرخ درو شامہا نہ چید

وہ کونسی صبح ہے جس میں آسمان نے بہت سی شامیں چن دی ہوں

نالید تا بجوصلۂ آں نوا طراز

چنانچہ وہ نغمہ سرا اس حد تک نالہ و فریاد کرتا رہا

خوں گشت نغمہ و ز دو چشمش فرو چکید

کہ اس کا نغمہ خون بن کر اس کی دو آنکھوں سے ٹپک پڑا

سوزِ فغانِ او بدلِ ہدہدے گرفت

اس کی آہ و فغاں کا سوز آخر ایک ہدہد کے دل پر اثر انداز ہوا

با نوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید

اور اس نے اپنی چونچ سے کانٹا اس کے جسم میں سے نکال لیا

گفتش کہ سودِ خویش ز جیبِ زیاں برآر
اور پھر اس نے کہا "اپنا فائدہ اپنے نقصان کے جیب سے پیدا کر
گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید
دیکھتا نہیں کہ پھول نے اپنے شگافِ سینہ سے خالص سونا پیدا کیا
درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
اگر تیرا جسم خستہ د زخمی ہو تو اس کی دوا درد سے بنا
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی (پیامِ مشرق)
خود کو کانٹوں کا عادی بنا تا کہ تو سراپا چمن ہو جائے

اور چونکہ افلاطونِ یونانی بھی شوپن ہار کا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ ہے لہٰذا مسلمانوں کو اس کے فلسفۂ گوسفندی اور اور تعلیماتِ یاس و تذبذب سے محترز رہنے کی پر زور تاکید فرمائی:۔

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
وہ پرانا راہب افلاطون فلسفی — جو قدیمی بھیڑوں کے گروہ میں سے ہے
رخشِ او در ظلمتِ معقول گم[۱] — در کہستانِ وجود افگندہ سُم
اس کا گھوڑا صرف فلسفے کی تاریکی میں گم ہو گیا — اور محض عالمِ وجود کے پہاڑ میں سم مارتا رہا
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد — اعتبار از دست و چشم و گوش برد
اس پر نامحسوس دنیا کا ایسا جادو چلا — کہ جسم اور حواسِ خمسہ کا اعتبار ہی جاتا رہا
گفت سرِ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
اس نے کہا کہ رازِ زندگی مرنے میں ہے — اور شمع کی روشنی بجھنے ہی سے بڑھتی ہے

---

[۱] ظلمتِ معقول: فلسفے کی تاریکی۔

بر تخیل ہائے ما فرماں رواست — جامِ او خواب آور و گیتی رُباست

وہ ہمارے عقاید و تخیلات پر حاوی ہو رہا ہے — مگر اس کا جام نیند لاتا ہے اور دنیا کو ہم سے گم کر دیتا ہے

گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

وہ آدمی کے لباس میں ایک بھیڑ ہے — اور اس کا حکم صوفی کی روح پر سوار ہو رہا ہے

عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند — عالمِ اسباب را افسانہ خواند

اس نے اپنی عقل کو آسمان کے اوپر پہنچا دیا — اور اس عالمِ اسباب کو ایک افسانہ کہا

کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

اس کا کام ہے اجزائے زندگی کو فنا کرنا — اور زندگی کے خوبصورت سرو کی شاخوں کو کاٹنا

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت — حکمتِ او بود را نابود گفت

فکرِ افلاطون نے نقصان کو فائدہ کہا — اور اس کے فلسفہ نے ہستی کو عدم بتایا

فطرتش خوابید و خوابے آفرید — چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

اس کی فطرت سو گئی اور اس نے ایک خواب پیدا کیا — اور اس کی چشمِ ہوش نے ایک سراب نمایاں کیا

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود

وہ ذوقِ عمل سے بالکل محروم تھا — اور اس کی روح موجود کی بجائے معدوم کی عاشق تھی

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

وہ اس دنیا کے ہنگامۂ موجود کا منکر ہوا — اور غیر موجود و غیر مرئی چیزوں کو بیٹھا ہوا بناتا رہا

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است — مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

زندہ روح کے لئے تو یہ عالمِ امکان (دنیا) ہی اچھا ہے — اور مردہ دل کیلئے ایک خیالی و تصوراتی دنیا اچھی ہے

آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام — لذتِ رفتار بر کبکش حرام

اس کا ہرن لطفِ خرام سے بالکل محروم ہے — اور اس کے چکور پر لذتِ رفتار حرام ہے

شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب — طائرش را سینہ از دم بے نصیب

اس کی شبنم پرواز کی طاقت سے بے بہرہ ہے — اور اس کے پرندے کا سینہ سانس سے محروم

ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش — از طپیدن بے خبر پروانہ اش

اس کا دانہ اگنے کا ذوق ہی نہیں رکھتا — اور اس کا پروانہ لطفِ اضطراب سے بے خبر ہے

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت — طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

ہمارا راہب دنیا سے گریز کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رکھتا تھا — اور اس میں اس دنیا کے شور و شغب کی طاقت ہی نہ تھی

دل بسوزِ شعلۂ افسردہ بست — نقشِ آں دنیائے افسوں خوردہ بست

اس نے بجھے ہوئے شعلہ کے سوز سے دل بستگی اختیار کی — اور اس خیالی اور طلسمی دنیا کا نقش باندھا

از نشیمن سوئے گردوں پر کشود — باز سوئے آشیاں نامد فرود

چنانچہ اس نے دنیا کے گھونسلے سے آسمان کو پرواز کی — اور پھر اس گھونسلے کی طرف واپس نہ آیا

در خمِ گردوں خیالِ او گم است — من ندانم دُرد یا خشتِ خم است

اس کا خیال آسمان کے ٹھیکے میں گم ہو رہا ہے — میں نہیں جانتا کہ وہ تلچھٹ ہے یا خم کے نیچے رکھنے کی اینٹ

قومہا از سُکرِ او مسموم گشت

بہرکیف قومیں اس کے نشے سے زہر آلود ہو گئیں

خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت (اسرارِ خودی)

وہ سو گئیں اور ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں

اور صرف برکلے، شوپن ہار، افلاطون اور غالب ہی پر کیا موقوف ہے، مشرقی شاعری کے فارسی اور اردو ذخائر پر نظر دوڑائیے تو آپ کو بیشتر دواوین میں یاس و ناامیدی اور شکوک و اوہام کے تیرہ و تاریک سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ان کا مطالعہ سرمایۂ یقین کی بربادی اور شکوک و شبہات کا فروغ

ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ''حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات
افسوس اس قوم پر جو موت سے سامانِ زندگی اخذ کرتی ہے
شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات
اور اس کا شاعر زندگی کے ذوق شوق سے محروم ہے

خوش نماید زشت را آئینہ اش
ایسے شاعر کا آئینہ بدصورت کو بھی خوبصورت کر دکھاتا ہے
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش
اور اس کے شہد سے نوعِ انسانی کے جگر میں سینکڑوں نشتر ہیں

بوسۂ او تازگی از گل برد
اس کا بوسہ پھول سے تازگی اڑا لے جاتا ہے
ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد
وہ دلِ بلبل سے ذوقِ پرواز چھین لیتا ہے

سست اعصابِ تو از افیونِ او
اس کی افیون سے تیرے پٹھے سست ہو جاتے ہیں
زندگانی قیمتِ مضمونِ او
اور اس کے یاس انگیز مضمون کی قیمت زندگی ہے

می رباید ذوقِ رعنائی زسرو
وہ سرو سے ذوقِ حسن چھین لیتا ہے
جرّہ شاہیں از دمِ سردش تذرو
اور اس کے ٹھنڈے سانس سے شاہیں بھی چکور بن جاتا ہے

نغمہ ہایش از دلت دزدد ثبات
اس کے نغمے تیرے دل سے پائداری چھین لیتے ہیں
مرگ را از سحرِ او دانی حیات
اور اس کے جادو سے تو موت کو بھی زندگی سمجھنے لگتا ہے

دایۂ ہستی زجانِ تو برد
وہ تیری روح سے زندگی کی خواہش زائل کر دیتا ہے
لعلِ عنابی زکانِ تو برد
اور تیری کان سے سرخ لعل اڑا لے جاتا ہے

چوں زیاں پیرایہ بندد سود را
وہ ہر فائدے کو نقصان ثابت کر دکھاتا ہے
می کند مذموم ہر محمود را
اور ہر قابلِ تعریف چیز کو قابلِ مذمت ظاہر کرتا ہے

در یمِ اندیشہ اندازد ترا
وہ تجھے تفکرات کے سمندر میں لا پھینکتا ہے
از عمل بیگانہ می سازد ترا
اور تجھے عمل سے غافل و بیگانہ کر دیتا ہے

خستہ و ما از کلامش خستہ تر — انجمن از دورِ جامش خستہ تر

وہ خستہ ہے اور ہم اس کے کلام سے خستہ تر ہو رہے ہیں — اور محفل اس کے دورِ جام سے مضمحل ہو رہی ہے

جوئے برقے نیست در نیسانِ او — یک سرابِ رنگ و بو بستانِ او

اس کے ابرِ نیسانی میں کسی بجلی کی نہر نہیں ہے — اور اس کا باغ محض ایک سرابِ رنگ و بو ہے

حسنِ او را با صداقت کار نیست — در یمش جز گوہرِ تف دار نیست

اس کے حسن کو سچائی اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں — اور اس کے سمندر میں عیب دار موتیوں کے سوا کچھ نہیں

خواب را خوشتر ز بیداری شمرد — آتشِ ما از نفسہایش فسرد

اس نے نیند کو بیداری سے بہتر سمجھا — اور ہماری آگ اس کے سانسوں سے بجھ گئی

قلبِ مسموم از سرودِ بلبلش — خفتہ مارے زیرِ انبارِ گلش

اس کی بلبل کے نغمات سے دل زہر آلود ہو گئے — اور اس کے پھولوں کے ڈھیر میں سانپ سوئے ہیں

از خم و مینا و جامش الحذر

پس اے مسلمان! اس کے مٹکے صراحی اور پیالے سے دور رہ

از مئے آئینہ فامش الحذر

اور اس کی شیشۂ آئینہ روشن شراب سے کنارہ کش رہ

اے ز پا افتادۂ صہبائے او — صبحِ تو از مشرقِ مینائے او

اے وہ شخص جو اس کے نشۂ شراب سے زمین پر گر رہا ہے — اور تیری صبح اس کی مینا کے مشرق سے نمودار ہوتی ہے

اے دلت از نغمہ ہایش سرد جوش — زہرِ قاتل خوردۂ از راہِ گوش

اے کہ تیرا دل اس کے نغموں سے سرد و خاموش ہو رہا ہے — تو نے کانوں کے راستے زہرِ قاتل کھا لیا ہے

اے دلیلِ انحطاط اندازِ تو — از نوا افتادہ تارِ سازِ تو

اے کہ تیرا اندازِ زندگی وجہ ذلت و پستی ہے — اور تیرے ساز کے تار نغمے پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں

اُں چناں زار از تنِ آسانی شدی ... در جہاں ننگِ مسلمانی شدی

تو تن آسانی سے اس قدر کمزور و ناتواں ہو گیا ... کہ دنیا میں اسلام و مسلمانی کے لئے باعثِ ذلت بن گیا

از رگِ گل می تواں بستن ترا ... از نسیمے می تواں خستن ترا

تجھے تو پھول کی رگوں سے باندھا جا سکتا ہے ... اور ہوا کے ایک جھونکے سے تجھے زخمی کیا جا سکتا ہے

عشق رسوا گشتہ از فریادِ تو ... زشت رو تمثالش از بہزادِ تو

تیری آہ و فریاد سے عشق بدنام ہو گیا ... اور تیرے بہزاد کی مصوری سے اس کی تصویر بدنما ہو گئی

زرد از آزارِ تو رخسارِ او ... سردیٔ تو بردہ سوز از نارِ او

تیرے دکھ درد سے عشق کا رخسار بھی زرد ہو گیا ... اور تیری سرد مزاجی نے آتشِ عشق کی حرارت کھو دی

خستہ جاں از خستہ جانی ہائے تو ... ناتواں از ناتوانی ہائے تو

تیری خستہ جانی سے عشق بھی خستہ جاں ہو گیا ... اور تیری کمزوری و ناتوانی سے وہ بھی ناتواں ہو گیا

گریۂ طفلانہ در پیمانہ اش ... کلفتِ آہے متاعِ خانہ اش

چنانچہ اب عشق کے پیمانہ میں گریۂ طفلانہ کے سوا کچھ نہیں ... اور اس کے گھر میں کوئی ساز و سامان ہے تو آہ و فریاد

سرخوش از دریوزۂ میخانہ ہا ... جلوہ دزدِ روزنِ کاشانہ ہا

وہ میخانوں کی شراب مانگ کر مست و بیخود ہے ... اور گھروں کے روزن سے جلوۂ حسن دیکھ رہا ہے

ناخوشے افسردۂ آزردۂ ... از لگد کوبِ نگہباں مردۂ

وہ بیمار و ناخوش ہے، بجھا ہوا اور نڈھال ہے ... اور دربانِ معشوق کے لتاڑے سے مردہ ہے

از غماں مانندِ نے کاہیدۂ ... وز فلک صد شکوہ بر لب چیدۂ

وہ غموم و ہموم سے بنسری کی طرح لاغر ہو رہا ہے ... اور آسمان کے خلاف سینکڑوں شکوے اس کی زبان پر ہیں

لابہ و کیں جوہرِ آئینہ اش ... ناتوانی ہمدمِ دیرینہ اش

مکر و فریب اور کینہ اس کے آئینہ کے جوہر ہیں ... اور کمزوری اس کی پرانی ہمدم ہے

پست بخت و زیردست و دوں نہاد — ناسزا و ناامید و نامراد

وہ بدنصیب، محکوم و مجبور اور بدنہاد ہے — وہ نا اہل ہے اور ناامید و نامراد۔

شیونش از جانِ تو سرمایہ برد — لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ برد

عشق کی آہ و فریاد نے تیری روح کا جوہر چھین لیا — اور پڑوسیوں کی آنکھ سے نیند کا لطف بھی

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد

افسوس اس عشق پر جس کی آتشِ اخلاص بجھ گئی

در حرم زائید و در بت خانہ مُرد

وہ بیت اللہ میں پیدا ہوا اور بت خانہ میں جا مرا

اے میان کیسہ ات نقدِ سخن — بر عیارِ زندگی او را بزن

اے کہ تیرے جیب میں شعر کی نقدی ہے — تو اسے زندگی کی کسوٹی پر پرکھ

فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است — چوں درخشِ برق پیش از تندر است

چشمِ دل کو روشن صورت میں دیکھنے والی فکر عمل کی رہبر ہے — اور وہ کڑک سے پہلے تجلی برق کی حیثیت رکھتی ہے

فکرِ صالح در ادب می بایدت — رجعتے سوئے عرب می بایدت

تجھے شعر و ادب میں فکرِ صالح چاہیئے — اور راہ و رسمِ عجم کو چھوڑ کر عرب کی طرف رجوع چاہیئے

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد [1] — تا دمد صبحِ حجاز از شامِ کرد

اب تو دل سلمائے عرب کے سپرد کرنا چاہیئے — تاکہ شامِ کرد سے صبحِ حجاز پیدا ہو

از چمن زارِ عجم گل چیدۂ — نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ

تو نے اب تک چمنِ عجم سے پھول چنے ہیں — اور ہند و ایران کی بہاریں دیکھی ہیں

---

[1] سلمیٰ:- ادبیاتِ عرب میں معشوقہ کا نام۔

اندکے از گرمیِ صحرا بخور — بادهٔ دیرینه از خرما بخور
اب کچھ نہ کچھ گرمیِ صحرا بھی برداشت کر — اور کھجوروں کی پرانی شراب بھی ؟

سر یکے اندر برِ گرمش بده — تن دمے با صرصرِ گرمش بده
ایک مرتبہ اپنا سر عرب کے سینۂ گرم میں بھی رکھ — اور اپنا جسم اس کی ہوائے گرم کے سامنے کھول دے

مدتے غلطیدهٔ اندر حریر — خو بہ کرپاسِ درشتے هم بگیر
تو ایک مدت ریشم ہی میں ملبوس رہا — اب ذرا سخت ٹاٹ کا بھی عادی ہو

قرنها بر لاله پا کوبیدهٔ — عارض از شبنم چو گل شوئیدهٔ
صدیوں تک تو لالہ زار پر رقص کرتا رہا ہے — اور پھول کی طرح شبنم سے اپنا رخسار دھویا ہے

خویش را بر ریگِ سوزاں هم بزن — غوطه اندر چشمهٔ زمزم بزن
اب خود کو تپتی ہوئی ریت پر بھی بٹھا — اور وہاں کے چشمۂ زمزم میں بھی غوطہ لگا

مثلِ بلبل ذوقِ شیون تا کجا؟ — در چمن زاراں نشیمن تا کجا؟
تو بلبل کی طرح کب تک وقفِ نالہ و فریاد رہے گا — اور اپنا گھونسلہ چمن میں کب تک بنائے رکھے گا

اے هما از یمنِ دامت ارجمند — آشیانے ساز بر کوهِ بلند
اے کہ تیرے جال کی برکت سے ہما بھی بلند اقبال ہے — اب کسی کوہِ بلند پر اپنا آشیانہ بنا۔

آشیانے برق و تندر در برے — از کنامِ جُرّهٔ بازاں برترے
وہ آشیانہ جو اپنی آغوش میں بجلی اور کڑک لئے ہو — اور جو بازوں کے گھونسلے سے بھی بلند تر ہو

تا شوی در خوردِ پیکارِ حیات
تاکہ تو زندگی کی جنگ لڑنے کے قابل ہو سکے

جسم و جانت سوزد از نارِ حیات (اسرارِ خودی)
اور تیرے جسم و جان زندگی کی آگ سے گرم و سوزاں ہوں

بہرکیف حاصلِ کلام یہ ہے کہ اگر آپ کوئی ایسی کتاب پڑھ رہے ہوں جو مجموعی طور پر یاس و نا اُمیدی اور شکوک و اوہام کی معلّم ہو تو آپ اس کا مطالعہ فوراً بند کر دیں۔ اور اگر کسی سابقہ مطالعہ سے مرضِ شک طبیعت میں فساد برپا کر چکا ہے، تو اس مرض کا کوئی "مُصلح" تجویز کریں۔ یہ علاج بالضد (Antidote) کا موقع ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یقین و ایمان اور عزم و عمل کو فروغ دینے والا لٹریچر مطالعہ فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع پر ہماری مشرقی ادبیات میں کلامِ اقبالؔ سے بہتر "مُصلح" اور کوئی نہیں!

جو کوکنار[۱] کے خوگر تھے اُن غریبوں کو
مری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند! (اقبالؔ)

(۶) غلبۂ شکوک و اوہام کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ کو کسی آرزو یا کسی مقصد میں ناکامی ہوئی ہو، تو اس کا صدمہ ایک خوف و خدشہ بن کر آپ کے دل و دماغ پر یوں سوار ہوا کہ آپ زندگی کے دیگر مقاصد و عزائم کے متعلق بھی مبتلائے شک و شبہ ہو گئے؛

اوّل تو یہ تصوّر ہی بالکل لغو و بے سند ہے کہ چونکہ آپ کو ایک مقصد میں ناکامی اور نقصان سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لہٰذا ہر دوسرے مقصد کا انجام بھی یہی ہوگا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ناکامی اور ہر ٹھوکر انسان کو ایک نیا تجربہ

---

[۱] کوکنار: پوست

سکھاتے ہوئے اور نشیب و فرازِ ہستی کا ایک نیا درس دیتے ہوئے آئندہ کے لیے نہ صرف زیادہ محتاط اور مستحکم بنا دیتی ہے بلکہ اس کے اسپ عزم و ہمت پر ایک اور تازیانہ رسید کرتی ہے جس سے رفتارِ عمل بدرجہا تیز تر ہو جاتی ہے۔ گویا:۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور! (غالبؔ)

علامہ اقبال نے زندگی کے اسی اصولِ ارتقاء کی نقشہ کشی کرتے ہوئے فرمایا کہ زندگی ناکامیوں اور ٹھوکروں سے ضعیف و مضمحل نہیں بلکہ "محکم تر" ہو جاتی ہے۔ یہ اندیشۂ سود و زیاں سے بلند تر چیز ہے۔ قیدِ زمانی اور قیدِ مکانی سے ماورا ہے۔ محنت و جفاکشی سے پائندہ تر ہوتی ہے۔ ایک پیکرِ خاکی میں پنہاں ہو کر بھی ہر جگہ اپنی قوّتِ تسخیر کو آشکارا کیے ہوئے ہے اور زیاں خانۂ دنیا میں انسان کے صبر و ہمت اور عزم و استقامت کا امتحان ہے۔ لہٰذا بحالتِ خامی تم محض مٹی کا ایک انبار ہو اور یقین و امید سے پختہ ہو کر ایک بے پناہ تلوار! ملاحظہ ہوں یہ اشعار:۔

زندگی

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست!
میں نے ایک بلند نظر شخص سے پوچھا کہ زندگی کیا ہے؟

گفتا مئے کہ تلخ ترِ او نکوتر است
اس نے کہا کہ وہ ایک ایسی شراب ہے، جو جتنی بھی کڑوی ہو اتنی ہی اچھی ہے،

گفتم کہ کرمک است و زگل سر بروں زند
میں نے کہا کہ زندگی تو ایک ایسا کیڑا ہے جو مٹی سے سر باہر نکالتا ہے،

گفتا کہ شعلہ زاد مثالِ سمندرؔ است

اس نے کہا وہ کیڑا ہی سہی اگر وہ سمندر کی طرح آگ سے پیدا ہوا ہے

گفتم کہ شر بفطرتِ خامش نہادہ اند

میں نے کہا قدرت نے تو اس کی ناپختہ فطرت ہیں شر ہی شر رکھا ہے

گفتا کہ خیرِ او نشناسی ہمیں شر است

اس نے کہا تیرا اس کے عناصرِ خیر کو نہ سمجھنا ہی بنیادِ شر ہے

گفتم کہ شوقِ سیر نہ بردش بمنزلے

میں نے کہا کہ زندگی کو شوقِ سیر نے کسی منزل تک پہنچنے ہی نہ دیا

گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است

اس نے کہا کہ اس کی منزل اسی ذوق شوق میں پوشیدہ ہے

گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند

میں نے کہا کہ زندگی اصلاً خاکی ہے اور آخر اسے خاک کے سپرد کر دیتے ہیں

گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تر است (پیامِ مشرق)

اس نے کہا کہ اس سے کیا ہوا، دانہ جب مٹی کو پھاڑ ڈالے تو گلِ تر بن جاتا ہے

اور جب انسانی زندگی میں جزائے محنت کے متعلق قدرت کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی تو پھر صرف کسی ایک واقعۂ ناکامی سے، جو

---

[1] سمندر ایک ایسا جانور ہے جو آگ میں سے پیدا ہوتا ہے اور اسی میں مرتا ہے۔ شعرِ غالبؔ ملاحظہ ہو:

جا رہی تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

بہت ممکن ہے کہ آپ ہی کی ناتجربہ کاری اور خامیٔ عقل وعلم کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی ہو، آئندہ کے لئے بھی امید وآرزو سے دست بردار ہو جانا، کہاں کی انسانیت ہے؟ - ہمیں تو ندبتا یہ تلقین کی گئی ہے کہ :-

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (پ: ۵ ع) مسلمانو! نہ تو ہمت ہارو اور نہ رنجیدہ وغمزدہ ہو، کیونکہ اگر تم (سچے) ایماندار ہو تو غالب ور فاتح تمہیں رہو گے۔

اور پھر مایوسی، تذبذب اور اللہ کی رحمت پر بے یقینی ہمارے عقیدہ میں "کفر" کے مترادف ہے :-

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (پ۱۳: ۴ ع) اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ونا امید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

میں نے مذکورہ بالا سطور میں تمام قسم کے امراضِ شکوک واوہام، ان کے اسباب اور نسخہ ہائے علاج بیان کر دیئے ہیں، اب یہ غور کرنا آپ کا کام ہے کہ ان میں سے کونسا مرض آپ کو لاحق ہے، کیوں لاحق ہے، اور پھر اس کا موزوں علاج آپ کیونکر عمل میں لا سکتے ہیں۔ بہرحال حقیقی نصب العین یہ ہے کہ آپ کو "شک" سے نجات پانا ہے۔ جو اسلام کی نظر میں "کفر" کے مساوی ہے۔ اور آپ کو نعمتِ "یقین" سے مالامال ہونا ہے۔ جو اسلام کے نزدیک عین "الایمان" ہے!

بالفاظِ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ "شک" ہی کا دوسرا نام ابلیس، فرعون، قارون، ہامان، شداد، نمرود، بولہب، بوجہل، چنگیز اور ہلاکو ہے اور پھر "یقین" ہی کا دوسرا نام محمدؐ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، یعقوبؑ، صدیقؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور حسینؓ ہے۔ اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ ان ہر دو جماعتوں میں سے کس جماعت

کے نقشِ قدم پر چلیں گے، اور یقین کا مسلک اختیار کریں گے یا شک و شبہ کا!

قرآنِ مجید نے تو بے شمار جگہ شکوک و اوہام اور تخمین و ظن کی مذمت فرمائی ہے لیکن یہاں بطورِ مثال :-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (پ ۲۶ : ۱۴ ع ۱)	اے مسلمانو! بہت سی بدگمانیوں اور شکوک و شبہات سے بچے رہو، کیونکہ بعض بدگمانیاں سراسر گناہ ہے۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (پ ۱۱ : ۹ ع)	اور ان (مشرکوں) میں سے اکثر لوگ محض ریب و گمان (شکوک و شبہات) پر کاربند ہوتے ہیں اور شک کہیں یقین کا کام بھی دے سکتا ہے؟

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ (پ ۲ : ۱ ع)	حق بات وہی ہے جو تیرا پروردگار فرمائے پس تو (حق و صداقت پر) شک کرنے والوں میں مت شریک ہو۔

یقین کی تاکید و فہمائش کلامِ اقبال میں

"یقین" کے محاسن و مفادات اور "شک" کے معائب و مضرات کا مطالعہ کر لینے کے بعد اب علامہ اقبالؒ کی تصنیفات سے چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں یقین کی عظمت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمان کو شک سے محترز رہنے کی تاکید کی گئی ہے :-

دمادم خویش را اندر کمیں باش — گریزاں از گماں سوئے یقیں باش
تو ہر وقت اپنی خودی کی تحقیق و حفاظت میں رہ — اور شک و شبہ کو چھوڑ کر یقین کی طرف بھاگ

تب و تابِ محبّت را فنا نیست — یقین و دید را نیز انتہا نیست
محبّت کا سوز و اضطراب غیر فانی ہے — اور اسی طرح یقین و مشاہدہ کی بھی کوئی حد نہیں

علمِ حاضر پیشِ آفل در سجود — شک بیفزود و یقیں از دل ربود
علمِ حاضر فانی چیزوں کے سامنے سجدہ ریز ہے — اس نے شک میں اضافہ کیا ہے اور یقین دل سے محو کر دیا ہے

بے یقیں را لذّتِ تحقیق نیست — بے یقیں را قوّتِ تخلیق نیست
بے یقین شخص میں ذوقِ تحقیق نہیں ہوا کرتا — اور بے یقین شخص میں کوئی چیز پیدا کرنے کی طاقت بھی نہیں ہوتی

بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است — نقشِ نو آوردن اورا مشکل است
بے یقین کے دل میں تذبذب و ارتعاش ہوتا ہے — اور کوئی نیا نقش پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہے

از خودی دور است و رنجور است و بس
وہ خودی سے دور ہے اور اس کی روح بیمار
رہبر او ذوقِ جمہور است و بس (زبورِ عجم)
بے یقین کا رہبر صرف عوامی ذوق ہوا کرتا ہے

ہمائے علم تا افتد بدامت
تا کہ علم کا ہما تیرے جال میں پھنس جائے
یقیں کم کن گرفتارِ شکے باش[1]
یقین کم کر اور گرفتارِ شک رہ

[1] حاشیہ بر صفحہ ۲۷۰

عمل خواہی؟ یقیں را پختہ ترکن

لیکن جب عمل چاہے تو یقیں کو نہایت پختہ کر

یکے جوئے و یکے بین و یکے باش (پیامِ مشرق)

ایک ہی نصب العین کی جستجو کر، اسی کو دیکھ اور اسی میں تلف ہوجا

خوشا روزے کہ خود را باز گیری

وہ دن کیا ہی مبارک ہوگا جب تو اپنی خودی کو دوبارہ حاصل کرے

ہمیں فقر است کو بخشد امیری

یہی وہ فقر ہے جو انسان کو امیر و کبیر بنا دیتا ہے

حیاتِ جاوداں اندر یقین است

ایک دائمی اور ابدی زندگی صرف یقین میں ہے

رہِ تخمین و ظن گیری، بمیری! (ارمغانِ حجاز)

اگر تو شک و شبہ کی راہ اختیار کرے گا تو مر جائے گا

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست

عشق کا صحیح مرتبہ صداقت اور یقین کے بغیر حاصل نہیں ہوتا

حاشیہ صفحہ ۲۶۹۔ مفہوم یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے پیمانے پر بھی تحصیلِ علم کرکے اس کے متعلق مکمل و تمام ہونے کا یقین نہ کر، کیونکہ یہ تصور علم کی مزید ترقی میں بہت حائل ہوگا۔ اور یوں بھی ایک مقولہ ہے کہ پیر شو علم بیاموز۔ یعنی بوڑھا ہو کر بھی علم حاصل کرتا رہ۔

یقیں بے صحبتِ روح الامینؑ نیست

اور یقین و ایمان جبریل امین کی صحبت کے بغیر محال ہے

گر از صدق و یقیں داری نصیبے

اگر تو صدق و یقین کا کچھ حصہ دل میں رکھتا ہے

قدم بیباک نہ، کس در کمیں نیست (ارمغانِ حجاز)

تو دنیا میں بیباکی سے قدم رکھ کیونکہ کوئی بھی تیری تاک میں نہیں ہے

بہ پیچ و تابِ خرد گرچہ لذتِ دگر است

اگرچہ عقل کے لئے پیچ مباحث میں کچھ اور ہی لطف ہے

یقینِ سادہ دلاں بہ ز نکتہ ہائے دقیق (زبورِ عجم)

تاہم مومن و سادہ دل لوگوں کا یقین علم و عقل کے دقیق نکتوں سے بہتر ہے

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی (بانگِ درا)

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا

تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا (بانگِ درا)

؎ روح الامیں سے مراد ہے: ذکر و فکرِ حق میں محو رہنے والا بزرگ۔ اولیاء اللہ۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں (بانگ درا)

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں (بانگ درا)

یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری (بالِ جبریل)

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُر سوز
نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک! (بالِ جبریل)

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز (بالِ جبریل)

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں (ضربِ کلیم)

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی، خود گزینی

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی (بالِ جبریل)

"یقین" کا معجز نما اثر خلیل اللہ کی آتش نشینی ہی تک محدود نہیں بلکہ دیگر انبیائے کرام کے تمام معجزات بھی قوتِ یقین ہی کا مظہر تھے۔ روحِ یقین ہی نے دوزخ نما آگ کو رشکِ گلستاں بنا دیا۔ روحِ یقین ہی نے رودِ نیل کی طوفانی امواج میں خشک راستے پیدا کر دیئے، روحِ یقین ہی نے ایک عصا کے مقابل تمام افواجِ فرعون کو تباہ و برباد کر دیا۔ روحِ یقین ہی نے حرفِ "قُم" سے مردوں کو زندہ کر دکھایا۔ روحِ یقین ہی نے مادرزاد اندھوں کو بینائی عطا کی۔ روحِ یقین ہی نے کوڑھیوں کو جن کے لیئے کوئی قطعی اور موثر دوا زمانۂ مسیح سے آج تک تقریباً دو ہزار سال گذر جانے پر بھی پیدا نہیں کی جا سکی، آناً فاناً صحتِ کاملہ بخشی۔ روحِ یقین ہی نے ایک اشارۂ انگشت سے چاند کے دو ٹکڑے کر دکھائے۔ روحِ یقین ہی نے فہمِ انسانی کے خود ساختہ تانِ زمان و مکان کو پاش پاش کر کے آنحضرتؐ کو چشم زدن میں ہفت آسمان کی سیر کرا دی، اور لامکان میں عرشِ الٰہی کے قریب "قابَ قوسین" کا جلوہ دکھایا، اور پھر کہاں تک بیان کیا جا سکتا ہے کہ قوتِ یقین دیگر اولیاء اللہ، شہداء اور صلحائے امت کے ذریعے کیسے کیسے محیر العقول اور تعمیری کارنامے منصۂ شہود پر لائی الغرض قوتِ یقین نے دنیا میں وہ سب کچھ کر دکھایا جو انسان کے لئے ناقابلِ یقین تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ سب کچھ بھی زیادہ سرعت و سہولت سے کر دکھایا جو انسان کے لئے ناقابلِ یقین تھا اور روحِ یقین کا یہ عمل مستقبل میں بھی بدستور جاری رہے گا۔ بالفاظِ دیگر "یقین" روحِ خدا ہے اور جس طرح خدا غیر فانی، ناقابلِ مقاومت اور غالب و فاتح ہے۔ اسی طرح

یقین بھی غیر فانی، ناقابلِ مقاومت اور غالب و فاتح ہے۔ فنا، بربادی، خوف و ہراس، تذبذب اور شکست و نامرادی جیسی چیزیں صرف شک و شبہ کے لئے مخصوص و مقدر ہو چکی ہیں۔ روحِ یقین کی پرواز ان پستیوں سے بہت بلند ہے — اتنی بلند کہ وہاں عالمِ تخمین و ظن اور کشمکش اوہام کی گرد بھی نہیں پہنچتی!

اقبالؒ اور سرمایہ و محنت

حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(اقبالؔ)

اقبال اور سرمایہ و محنت

ازالۂ غلط فہمی میں اس موضوع پر بالتفصیل بحث کرنے سے پیشتر ضروری سمجھتا ہوں کہ دورِ حاضر میں علامہ اقبال کے متعلق پیدا شدہ ایک نہایت گمراہ کن اور خطرناک غلط فہمی کا ازالہ کر دوں اور اس ذیل میں خود اپنے متعلق بھی قارئین کرام کے دل میں پیدا ہو سکنے والے اوہام و وساوس کا سدِ باب کروں۔ علامہ اقبال کے متعلق موجودہ معاشرہ میں یہ خیال گردش کر رہا ہے کہ وہ اقتصادیات کے موضوع پر عقیدتاً ایک اشتمالی (COMMUNIST) یا اشتراکی (SOCIALIST) واقع ہوئے تھے اور اس عنوان پر علامہ اقبال مرحوم کو بہت ہی رعایت دی جاتی ہے تو ان کے متعلق یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ "اقبال اگر خود کمیونسٹ نہیں تھا، تو کم از کم کمیونزم کا ایک سرگرم موید و حامی ضرور تھا اور اس نے اپنے کلام میں اس دستورِ معاشی کا پرچار بھی کیا ہے" اور جب پوچھئے کہ وہ کیونکر؟ تو بالعموم جواب ملے گا: "اجی حضرت! آپ بالِ جبریل میں "لینن" کے عنوان پوری نظم پڑھیئے۔ پھر بانگِ درا" میں

"سرمایہ و محنت" کے زیرِ عنوان تمام اشعار پر غور فرمائیے: "ساقی نامہ" میں "گیا دَورِ سرمایہ داری گیا۔ تماشا دکھا کر مداری گیا" کے انداز پر تمام اشعار کے مقصد و مدعا کو پیشِ نظر رکھیے اور پھر سب سے زیادہ واضح طور پر "بالِ جبریل" کے یہ اشعار دیکھیے کہ:-

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

اس قسم کے تخیلات و اعتراضات کے جواب میں صحیح و برمحل طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے توہمات اسلامی دستورِ معیشت اور اس موضوع پر قرآنی تعلیمات سے جہالت و بےخبری کا نتیجہ ہیں۔ اگر معترضِ سرمایہ و محنت کے عنوان پر احکامِ قرآنی سے واقف ہوں، اور دولت کی "اسلامی تقسیم" کا مکمل و مستند علم حاصل کریں تو اقبال کو "کمیونسٹ" یا "کمیونزم" کا حامی ہرگز تصور نہ کریں کیونکہ اسلام کا دستورِ معیشت "اشتمالیت" یا "اشتراکیت" سے اتنا زیادہ مکمل، منظم، وسیع، سیر حاصل اور جامع و مانع ہے کہ کمیونزم اس کی نہایت ناقص و نامکمل صورت اور کمیونسٹ اس کے خوشہ چین معلوم ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے تمام اشتمالی و اشتراکی اسلام کے مکتبِ معاشیات میں طفلِ نوآموز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کی افسوسناک و عبرت انگیز غفلت ہے کہ اقتصادیات پر تعلیماتِ قرآن سے جاہل ہونے کے باعث

وہ دیگر اقوام تک اس کے معنوی فیوض و برکات کو منتقل نہیں کر سکتے، ورنہ اگر وہ علم و بصیرت اور ذوقِ تبلیغ و اصلاح سے مملکتِ روس اور دنیا کے دیگر اشتراکی حلقوں تک اسلامی اقتصادیات کو ان کی صحیح و مستند صورت میں پہنچا دیتے تو بلاشبہ ہر کمیونسٹ اشتراکیت کو تین چھوڑ سو طلاقیں دے کر بھی فوراً حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا!

پس آغازِ مقالہ میں اقبال اور حامیانِ اقبال کے متعلق شکوک و شبہات رکھنے والے حضرات سے التماس ہے کہ وہ کسی اور مخلص مسلمان پر "کمیونسٹ" کا بے بنیاد الزام لگانے سے پیشتر اسلامی اقتصادیات کا بغور مطالعہ کریں اور آیاتِ قرآنی میں اس کی وسعت و ہمہ گیری کے حیات افروز جلوے دیکھیں۔ بعد ازاں نہ تو وہ علامہ اقبال پر کسی قسم کی اشتمالیت و اشتراکیت چسپاں کریں گے اور نہ ان کے عقیدت مندوں کے متعلق ایسی بدگمانی کر کے گنہگار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا	اے مسلمانو! اکثر بدگمانیوں سے بچے رہو، کیونکہ
مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ﴿پ ۲۶ ع ۱۴﴾	بعض بدگمانیاں تو سراسر گناہ ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا:-

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا	محض تخمین و ظن یا شک و شبہ تو یقین کا ذرہ برابر
(پ ۱۱ : ۹ ع)	فائدہ نہیں دے سکتا۔

پس موقع و محل کے تقاضے سے اسلامی دستورِ معیشت کا ایک مختصر سا اندازہ کرانے کے لئے مجھ پر لازم ہو گیا ہے کہ دنیا کی آخری اور سب سے زیادہ مستند آسمانی کتاب سے چند آیات پیش کرتے ہوئے آپ کی تسلی و تشفی کر دوں۔ اس دستورِ معیشت پر غور کرنے سے آپ اس حقیقت کے معترف ہو جائیں گے کہ ہمیں

"اشتمالیت" یا "اشتراکیت" کی ایک لمحے کے لئے بھی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے پاس اس سے بہت زیادہ توانا، ٹھوس، جامع، ہمہ گیر، قدرتی اور مستقل دستورِ معیشت موجود ہے۔ اور اقبال نے جو کچھ کہا ہے، خالصتہً اسلامی تصورِ معیشت کے زیرِ اثر کہا ہے:

معاشیات پر اسلامی اور قرآنی حقائق

اسلام نے مندرجہ ذیل اصول و اوامر کے ذریعہ نوعِ انسانی کی اقتصادی و معاشی فلاح و بہبود اور راحت و طمانیت کا وہ حیات افروز درس دیا ہے کہ کسی اور قوم کے دستورِ معیشت میں اس نظم و نسق کا عشرِ عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا:۔

(۱) ہر سال ایک "فرض" کی حیثیت میں "زکوٰۃ" کی باقاعدہ ادائیگی اور مستحقینِ قوم میں اس کی باضابطہ تقسیم!

(۲) فریضۂ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی "قُلِ العفو" کی رو سے تمام "زائد از ضرورت" مال کو فی سبیل اللہ خرچ کر دینے کی پے در پے تاکید!

(۳) "سُود" کی قطعی حرمت "قرضِ حسنہ" کے طور پر ایک دوسرے کی امداد اور اس طرح مصیبت زدہ انسانیت کے لئے ایک بے نظیر سہولت!

(۴) سٹہ بازی اور ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی کی مذمت و حرمت کیونکہ "ذخیرہ اندوزی" ہی سے کم استطاعت اور نچلے طبقوں کو بے حد تکلیف و پریشانی ہوتی ہے!

(۵) انفاق فی سبیل اللہ کی عام تاکید و تلقین، حتّٰی کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ - یعنی "تم نیکی کا درجہ پا ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ اپنے محبوب مال

دمتاع میں سے راہِ خدا نہ خرچ کرو" اور پھر اسی انفاق کے تحت مساکین، غربا، بیوگان یتامیٰ، اقربا، ہمسایہ اور مسافر کی امداد و اعانت کرنے کے موضوع پر پیہم و مسلسل تاکید!

کیا مال و دولت کے ایسے وسیع و بے نہایت انفاق اور ضرورت مند خلقِ خدا کی اس قدر فیاضانہ و فراخدلانہ امداد و اعانت کے بعد بھی ایک ملک کے سماج میں کوئی معاشی فتنہ وانتشار باقی رہ جاتا ہے؟

اسلام کے نظامِ معیشت پر کر عمل

دنیا میں امن وصلح کی بنیاد ہے یہی!

ترغیباتِ انفاق اسلام نے نہ صرف "زکوٰۃ" کا فرض عائد کر کے سود اور سٹہ بازی کو حرام قرار دے کر، اور پھر مال وزر اور اجناس کی ذخیرہ اندوزی سے منع کرتے ہوئے نوعِ انسانی کی غریب و نادار اکثریت پر احسانِ عظیم کیا ہے، بلکہ بے شمار جگہ "انفاق" یعنی راہِ خدا خرچ کرنے کی عام ترغیبات سے بھی سرمایہ داری کو ناممکن العمل بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر:-

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ	اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اسے موت
اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ	کی گھڑی آنے سے پہلے پہلے (راہِ خدا مستحق
فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى	لوگوں پر) خرچ کر ڈالو ورنہ (بوقتِ موت) کہنے
اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ	لگو گے اے پروردگار! اگر تو ہمیں تھوڑی سی
مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ	اور مہلت دیتا تو ہم صدقہ و خیرات کر کے (تیرے)
نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ	نیک بندوں میں شریک ہو جاتے۔ حالانکہ جس کا وقتِ
خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔	موت آپہنچے، اللہ اسے ہرگز کوئی مہلت نہیں دیتا

(پ ۱۰ : ۱۴ : ع) اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

(لوگو) جب تک ان چیزوں میں سے (راہِ خدا) خرچ نہ کرو جن سے تم کو محبت ہے، نیکی کا درجہ ہرگز نہ پا سکو گے، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو، اللہ کو اس کا علم ہے۔

(پ ۴ : ۱ ع)

پس جہاں "انفاق" کے محاسن و فضائل بیان فرمائے، وہاں ساتھ ہی "بخل" کی شدید مذمت بھی کی۔

لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۝

کنجوسوں کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ اللہ نے جو مال انہیں دے رکھا ہے، وہ ان کے لئے مفید ہے وہ تو ان کے لئے بہت مضر ہے، روزِ قیامت ان کی کنجوسی کا سارا حاصل طوقِ لعنت بنا کر ان کی گردنوں میں لٹکا دیا جائے گا۔

(پ ۴ : ۹ ع)

"انفاق" کی تاکید اور "بخل" کی تردید و مذمت کے علاوہ کلام اللہ میں اکثر جگہ "کنز" یعنی مال کو بطور "خزانہ" جمع کرنے پر عذاب و عقاب کی جو آیات وارد ہیں اور جس نفرت و حقارت سے اس طرزِ عمل کی مذمت کی گئی ہے، اس سے بھی سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی ہوتی ہے، مثلاً

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ

اور جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے

أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ
جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ
ظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ
لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ
تَكْنِزُونَ ۝ (پ۱۰ : ۱۱ع)

جس دن وہ سونا چاندی (دوزخ کی آگ میں
گرم کیا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں
پسلیاں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائیگا،
یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے (دنیا میں)
جمع کر کے رکھا تھا تو آج اس جمع شدہ مال کا مزہ چکھو

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ
الْمَقَابِرَ ۔ (پ۳۰ : ۲۱ع)

مال بڑھانے کی ہوس نے تمہیں غافل و بدمست
بنا رکھا ہے یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملو۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي
جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ
أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝

(پ۳۰ : ۲۹ع)

تباہی و بربادی ہے ہر اس طعن باز و عیب جین
کے لئے جو مال و زر جمع کرتا ہے اور پھر اسے گن
گن کر رکھا اور وہ سمجھتا یہ ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ
اس کے پاس رہے گی۔

"العفو" کی حکمت و ماہیت اور اصولِ کفاف کے اجتماعی فوائد

جب "کنز" (دولت کی ذخیرہ اندوزی) کے متعلق مذکورہ بالا نوعیت کی بہت سی قہر آلود اور پُر وعید آیات نازل ہوئیں تو مسلمانوں کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ فریضۂ زکوٰۃ کی معین مقدار صرف کرنے کے بعد ہم "نفلی" صورت میں کتنا کچھ خرچ کر سکتے اور پھر کیا کچھ اپنے پاس رکھنے کے مجاز ہیں؟ —— چنانچہ جب یہ سوال بارگاہِ رسولؐ میں پیش کیا گیا تو وحیِ الٰہی نے فوراً رہنمائی کی اور دنیا کی مغلوب و مقہور، نادار و خراب حال اور فاقہ کش آبادیوں

کے لئے وہ پیامِ رحمت و نعمت آیا کہ دنیا کے تمام معاشی دستور، ماہرِ اقتصادیات فلاسفر اور مدبر و مصنف اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہیں، چنانچہ مساکین کے سب سے بڑے مشفق و ہمدرد نے فرمایا:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ

(اے پیغمبر) یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں۔ کہئیے کہ (تمہاری اشد ضروریاتِ زندگی سے) جو کچھ بچ رہے (سب خرچ کردو)

(پ ۲ : ۱۱ع)

کیا ان الفاظ کی جامعیت و ہمہ گیری پر کارل مارکس کی ہزاروں تصانیف قربان نہیں کی جا سکتیں؟ کیا اشتمالیت یا اشتراکیت تقسیم دولت اور معاشی مساواتِ عامہ کے لئے صرف ایک ذو الفاظ ہیں ایسا منظم اور وسیع فارمولا پیش کرسکی ہے؟ کیا اصول "العفو" — سرمایہ داری اور جاگیرداری کی بیخ و بنیاد پر ایک کلہاڑے کا کام نہیں کر رہا؟ کیا اس اصولِ معیشت سے قصرِ ظلم و استبداد کی اینٹ سے اینٹ نہیں بج جاتی؟ کیا اپنی اشد ضروریاتِ زندگی کے علاوہ سب کچھ قوم و ملت کی فلاح و بہبود پر صرف کر دینے کے بعد بھی ایک شخص "سرمایہ دار" یا "جاگیردار" رہ سکتا ہے؟ اور کیا فالتو اور زائد از ضرورت دولت تقسیم کر دینے کے بعد بھی کوئی شخص اس قابل رہتا ہے کہ وہ عیش و عشرت، رندی و شاہد بازی اور دیگر اشغالِ فسق و فجور میں محو و مستغرق ہو کر وقت کے معاشرہ کو، قوم و ملت کو سرزمینِ وطن کو اپنے گناہوں سے ناپاک کرے؟ — الغرض کیا کہئیے اور کہاں تک اس چیز کی تشریح کیجئے کہ آیۂ "العفو" میں تمام نوعِ انسانی کے لئے معاشی، سماجی، اجتماعی اور اخلاقی حیثیت سے کس قدر خزائنِ راحت و ہدایت پنہاں ہیں!

علامہ اقبالؒ اسی تصور کے تحت فرماتے ہیں:۔

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ "قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (ضربِ کلیم)

اس تمام بحثِ "العفو" کا حاصل و خلاصہ وہ "اصولِ کفاف" ہے جسے اسلام غنا، طمانیتِ قلب، معاشی توازن اور اجتماعی خوش حالی کی بنا قرار دیتا ہے۔ "کفاف" کے معنی ہیں "بقدرِ ضرورت روزی" پر صبر و شکر سے قناعت کرنا تاکہ محض ہوسِ کثرتِ مال سے ہم جنسوں پر ناجائز ظلم و ستم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریمؐ نے اپنے بلیغ و حکیمانہ انداز میں ارشاد فرمایا:۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَکَانَ رِزْقُهٗ کِفَافًا۔ — اس شخص نے (دنیا و عقبیٰ میں) فلاح پائی جو اسلام پر کاربند ہوا اور بقدرِ ضرورت رزق پر گزر اوقات کی۔

اور پھر "رزقِ کفاف" ہی کے چند در چند روحانی، اجتماعی اور اقتصادی فوائد و مصالح پر نظر رکھتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنی اولاد کے لئے بھی حضورِ حق یہ دعا کی کہ:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ اٰلَ مُحَمَّدٍ كِفَافًا۔ — اے اللہ! آلِ محمدؐ کو بقدرِ ضرورت رزق عطا فرما۔

اسوۂ حسنہ اور سیرِ صحابہؓ سے اصولِ کفاف کے عملی نمونے

اسلام کا یہ اصولِ کفاف جس کی تاکید و تلقین قرآن و حدیث میں پے در پے موجود ہے، محض ایک "نظریہ" یا "تصور" کی حد تک ہی

محدود نہیں رہ گیا، بلکہ جن بندگانِ حق نے اس اصول کے اجتماعی، اقتصادی اور ملی فوائد و مصالح کو سمجھا اور اپنایا تھا، اُن کی زندگی میں اس کے حیرت انگیز عملی نمونے بھی ملتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ، خلفائے راشدین کا معمول، انصار اور دیگر صحابہؓ کرام کی سوانح عمریاں ایسی بے شمار زریں مثالوں سے معمور ہیں۔ وہ "روزی بقدرِ ضرورت" کے اس حد تک قائل تھے کہ مفہومِ "العفو" کے تحت ایک دو روز سے زیادہ خوراک اپنے گھر میں جمع رکھنا بھی دلیلِ غفلت و معصیت سمجھتے تھے۔ مال و دولت کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ دنیا کی پوری تاریخ میں ان کا ایثار، ان کا غناء، ان کی فیاضی، ان کی جود و سخا، ان کی خدا ترسی اور ان کی ہمدردیِ مساکین و فقراء عدیم المثال ہے اور تاقیامت رہے گی۔ وہ محض اپنی ذات کے لئے نہیں۔ بلکہ تمام نوعِ انسانی کی خوش حالی و فارغ البالی کے لئے سرگرم جد و جہد رہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے "اصولِ کفاف" پر عمل پیرا ہو کر تمدنی اور معاشی حیثیت سے کفار کو بھی اتنی ہی رعایتیں اور سہولتیں دیں جتنی کہ اپنے برادرانِ اسلام کو۔ وہ معاشرہ کی اجتماعی ضروریات کو اپنی انفرادی ضروریات پر ہمیشہ ترجیح دیتے رہے۔ عہدِ حاضر میں "جمہوریت" ایک ایسا کھوکھلا لفظ ہے جو دنیا کے کسی خطے میں شرمندۂ معنی نہیں۔ اگرچہ عوام کالانعام کو فریب دینے اور ان سے اپنی مقصد براری کرنے کے لئے دنیا کے ہر اسٹیج سے "جمہوریت" کے دھواں دھار نعرے اٹھتے ہیں، لیکن حقیقتاً اسے "معاشی عدل و انصاف" کا مہیب ترین دیو سمجھ کر اس کی روحِ انقلاب کو عمداً بیدار نہیں کیا جاتا۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ نبی الرحمت اور صحابہ کرام نے مفہومِ جمہوریت کو موزوں ترین صورت میں عملی جامہ پہناتے ہوئے پورے اخلاص و ایثار سے "اصولِ کفاف" کی پابندی کی، اپنی ہر فالتو چیز "بیت المال" میں داخل کر دی اور ہر دکھ درد میں مصیبت زدہ انسانیت کے

کام آئے۔ افلاس و ناداری اور فقر و فاقہ کا ابتدائی دور چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ اس میں تو حرصِ مال اور عیش و عشرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن جب مدینہ کے گلی کوچوں میں سیم وزر کے انبار لگ گئے، اور ڈھونڈنے سے کوئی زکوٰۃ لینے والا بھی نہیں ملتا تھا، اس حالت میں صاحب "الفقر فخری" اور حضورؐ کے تمام اصحاب اصولِ کفاف پر بدستور کاربند رہے۔ اور کسی شخص نے کسی نوع کی ذخیرہ اندوزی جائز نہیں سمجھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ جو عرب کے بہت بڑے تاجر اور "سرمایہ دار" تھے، قبولِ اسلام کے بعد زمانہ خلافت میں مسلمانوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے :۔

"برادرانِ اسلام! میں خود بتاتا ہوں کہ حکومت کے خزانے سے مجھے کس قدر لینا جائز ہے۔ سال میں دو جوڑے کپڑے، ایک جاڑے کے لئے اور ایک گرمی کے لئے، ایک سواری جس پر حج کے لئے جا سکوں اور ملک کے ایک معمولی آدمی کے لئے لائقِ بسر اوقات کا اتنا خرچ جس سے میری اور میرے اہل و عیال کی کفالت ہو سکے۔ میں ایک ادنیٰ مسلمان ہوں، جو تمہارا حال ہے، وہی میرا حال ہے۔"

چنانچہ سیرتِ فاروقؓ کا ہر ورق شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ عوام الناس کو وقتی طور پر مسرور و مطمئن کرنے کے لئے نہیں کہے تھے، بلکہ صدقِ نیت سے انہیں عملی جامہ پہنایا۔ ہمیشہ اصولِ کفاف کو پیشِ نظر رکھا اور اسراف سے قطعی طور پر محترز رہے، سادہ غذا سادہ رہائش اور جسم پر پیوند لگے ہوئے کپڑے!

تن پہ تھا فاروقِ اعظمؓ کے پھٹا کرتا مگر
قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملکِ جم (حالی)

تحفظِ حقوقِ محنت پر احادیثِ رسولؐ رسولِ کریمؐ چونکہ اپنی تعلیمات اور طریقِ عمل ہر دو لحاظ سے سرمایہ داری

ور غضب حقوقِ عامہ کے سخت خلاف تھے۔ لہٰذا آنحضرت نے احادیث میں اکثر جگہ مزدور اور ملازم وخادم کے حقوقِ زندگی کی حفاظت ونگہداشت کا بے مثل درس دیا ہے اور ان کے متعلق الفاظ میں بھی اسی محبت وہمدردی کا مظاہرہ کیا ہے جس پر وہ اپنی معاشرتی زندگی میں تادمِ واپسیں عمل پیرا رہے۔ اس نوع کی تمام احادیث تو یہاں پیش نہیں کی جا سکتیں تاہم ان کا خلاصہ ذیل کی تین چار احادیث میں موجود ہے۔

اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهٗ

مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے ادا کرو۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للملوک طعامہ وکسوتہ ولا یکلف من العمل ما لا یطیق۔

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا غلام (خادم) کے لئے خوراک اور لباس چاہئے اور اس پر ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جس کی وہ قوت نہ رکھتا ہو۔

ھم اخوانکم وخولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم من العمل ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم علیہ

تمہارے خادم تمہارے بھائی ہیں۔ انہیں اللہ نے تمہارے زیرِ نگیں کیا ہے پس جس کے ماتحت اس کے کسی بھائی کو کیا گیا ہو، اسے چاہئے کہ وہ جیسا کچھ خود کھاتا ہے، اسے بھی کھلائے اور جیسا کچھ خود پہنتا ہے، اسے بھی پہنائے اور ان پر زیادہ محنت کا کام نہ ڈالو۔ اگر مجبوراً ڈالو تو پھر ساتھ ہو کر خود بھی ان کی مدد کرو۔

من كان لنا عاملا فليكتسب زوجة فان لم يكن له خادم فليكتسب خادم وان لم يكن له مسكنا فليكتسب مسكنا من اتخذ غير ذلك فهو غال او سارق	جو ہمارا (حکومت کا) ملازم ہو اگر غیر شادی شدہ ہو تو شادی کرے۔ اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو تو خادم رکھ لے اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو مکان بنوا لے جو اس حد سے آگے بڑھے (زائد چیزیں مہیا کرے) تو وہ خائن ہے یا چور۔

امر رسول الله صلعم یوما بالصدقۃ فقال رجل یا رسول الله عندی دینار قال تصدق به علیٰ نفسك قال عندی اٰخر قال تصدق به علیٰ ولدك۔ قال عندی اٰخر قال تصدق به علیٰ زوجك۔ قال یا رسول الله عندی اٰخر۔ قال تصدق به علیٰ خادمك۔ قال عندی اٰخر۔ قال انت ابصر به۔	ایک دن رسولِ کریمؐ نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنی جان پر صدقہ کر۔ اس نے پھر کہا کہ ایک اور دینار بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنی بیوی پر صرف کر۔ اس نے کہا میرے پاس اور دینار بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے خادم پر خرچ کر اس نے کہا یا رسول اللہ! میں ایک اور دینار بھی رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق تو خود ہی فیصلہ کرے۔

اس روایت کا حاصل و مفاد یہ ہوا کہ انسان کو اپنی ذاتی ضروریات اور اخراجاتِ اہل و عیال کے بعد باقی ماندہ مال سے خادموں، ملازموں اور مزدوروں کے حقوق کما حقہٗ ادا کرنا چاہئیں اور ان کی تعمیل میں کسی قسم کا بخل نہ ہو۔

نظامِ فطرت کا عادلانہ فتویٰ

اس موضوع پر صبحِ ازل سے جاری شدہ نظامِ فطرت کا عادلانہ فیصلہ بھی یہی ہے کہ ہر خوشحال اور کھاتا پیتا انسان دیگر مفلس و نادار اور فاقہ کش لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہو، اُن کے مصائب و مشکلات کو رفع کرے اور پورے اخلاص و ہمدردی سے ایسے ذرائع اختیار کرے کہ انہیں بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو۔ جب یہ حقیقتِ مسلمہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک ہی باپ (آدمؑ) اور ایک ہی ماں (حوّا) کی اولاد ہے اور ازل سے اس کی زندگی کا نصب[1] العین اور مذہب و مشرب[2] بھی ایک ہی ہے۔ تو پھر تمدنی اقتصادی اور معاشی حیثیت سے بھی ان میں وہ باہمی امداد و تعاون، حسنِ سلوک اور مساوات کیوں نہ ہو، جو ایک ہی والدین کے بیٹوں اور بیٹیوں میں ہونا چاہیے۔ اپنے مورثِ اعلیٰ (آدمؑ) اور اپنی اصل و بنیاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کیا آج روئے زمین کے تمام مرد اور تمام عورتیں آپس میں بھائی بہن نہیں ہیں؟ — اور جب ہیں اور

---

[1] تمام نوعِ انسانی کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے طاعتِ احکامِ الٰہی، ذکر و عبادتِ حق اور خدمتِ خلق اللہ

[2] روزِ ازل ہی سے نوعِ انسانی کا حقیقی مذہب و مشرب ہے "اسلام" (یعنی خدا کی طاعتِ کاملہ) اور اسلام کا اصل مقصود و منشاء ہے خدائے واحد کی پرستش و عبادت (حفظِ توحید) شرک سے اجتناب، اچھے اور مفید و مستحسن اعمال و اخلاق کی پیروی، ناپاک و فحش اور تخریبی کاموں سے کنارہ کشی اور مصیبت زدہ انسانیت کی امداد و ہمدردی! ان اصول و مقاصد سے دنیا کے کسی شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے! — بہرکیف یہی ہے مفہوم و مقصدِ اسلام اور اس دستورِ حیات کے علاوہ جتنے بھی دیگر مذاہب و ادیان دکھائی دیتے ہیں، وہ خدا کے بھیجے ہوئے صحیح و مستند مذاہب نہیں بلکہ انسان کے اپنے تصورات و توہمات کا نتیجہ ہیں، خود غرض پیشواؤں کی تخلیق ہیں، تقلیدِ آباؤ اجداد کا ثمرہ ہیں اور پابندیِ رسم و رواج کا طلسمِ باطل!

یقیناً ہیں تو پھر فطرت کی عدالت آپ سے یہ استفسار کرتے میں حق بجانب ہے کہ آپ کی تمام آبادیوں اور معاشروں میں روزمرّہ ضروریاتِ زندگی کے متعلق باہمی امداد و اعانت اور "عملی ہمدردی" کیوں نہیں؟ خود "انسان" اپنے ظالمانہ اور غاصبانہ نظامِ معاشی سے درندوں کی طرح "نوعِ انسانی کا شکاری" کیوں بنا ہوا ہے؟ —

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

بہرکیف کلامِ الٰہی نے، جو نظامِ فطرت اور مقاصدِ فطرت کا بہترین آئینہ دار ہے، اس موضوع پر تمام نوعِ انسانی کے معنوی رشتۂ اخوت و مودّت کا بایں الفاظ اعلان کرتے ہوئے سب پر اتمامِ حجت کر دیا:۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ

(روزِ آفرینش) تم سب کا پیدا کیا جانا اور (بعدِ موت) تمہارا دوبارہ زندہ کرنا (گویا) ایک ہی جان کی طرح ہے: (پ ۲۱: ع ۳)

اس آیۂ شریفہ کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

ترجمہ: "ہمارا آب و نان ایک دسترخوان سے ہے، اور آدم کی تمام اولاد گویا فردِ واحد کی طرح ہے"۔

اور جب تمام نوعِ انسانی کی خلقت اور بعثت اپنی اصل و بنیاد کے لحاظ سے "نفسِ واحدہ" (ایک جان) کا حکم رکھتی ہے، تو پھر کیا آپ اس ملعون جانشینِ قارون کو "انسان" کہیں گے، جو اپنی تجوریوں کو سیم و زر سے بھرنے کے لئے جونک کی طرح شب و روز مزارعین اور مزدوروں کا خون چوستا رہتا ہے؟ — شیخ سعدی نے کیا خوب

کہا ہے :۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند	کہ در آفرینش زیک جوہر اند
آدم کے بیٹے ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں	کیونکہ وہ پیدائش میں ایک ہی جوہر سے نمایاں ہوئے
چو عضوے بدرد آورد روزگار	دگر عضوہا را نماند قرار
جب زمانہ ایک عضو میں درد پیدا کرتا ہے	تو دیگر اعضا بھی بے چین ہو جاتے ہیں

تو کز محنتِ دیگراں بے غمی

تو کہ دوسروں کی تکلیف سے بالکل بے غم ہے

نشاید کہ نامت نہند آدمی

تجھے "آدمی" کہہ کر پکارنا جائز ہی نہیں

عالمگیر امن و عافیت کا سنگِ بنیاد

آج دنیا میں ہر طرف یہی شکوہ و شکایت اور یہی ہنگامہ و غوغا ہے کہ "امن" نابود ہو گیا اور فتنہ و فساد نے انسانیت کو مبتلائے عذاب کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ عناصرِ امن و عافیت کو برباد کرنے اور فتنہ و فساد کو فروغ دینے کا اصل محرک و ذمہ دار ہے کون؟ — یہی حضرتِ "انسان" جن کی خود غرضی، ہوس پرستی، حرص و آز اور حبِّ زر نے فطری "توازنِ معاش" کو درہم برہم کر کے اپنے امن و اطمینان کی خود بیخ کنی کی۔ پھر یہ خود ساختہ بے اعتدالیاں اور حق تلفیاں اپنے فاعل کے لئے کیونکر وجہ سزا نہ بن جائیں؟ چنانچہ کلام اللہ نے نہایت واضح الفاظ میں اسی حقیقت کا اعلان کیا

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ

لوگوں کی گمراہی و بدعملی کی وجہ سے خشکی اور تری میں فتنہ و فساد برپا ہوا۔ یہ ہنگامہ و فساد اس لئے ہے کہ لوگوں کو، ان کے کچھ برے اعمال

يَرْجِعُوْنَ ○ کی سزا دی جائے تاکہ وہ رگناہ و سرکشی) سے باز آجائیں۔
(پ ۹: ع ۱)

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ (پ ۸: ۱۴ع) اور اللہ کی زمین میں امن و اصلاح کے بعد فساد و بدامنی مت پیدا کرو!

پس ظاہر ہے کہ "فساد" ہمیشہ حاصل و نتیجہ ہوا کرتا ہے "عدل و انصاف" کے فقدان کا۔ افراد اور اقوام میں آپس کے حقوقِ زندگی، حقوقِ معاش اور معاوضۂ محنت و مشقت میں جتنا زیادہ "انصاف" برتا جائے گا، عناصرِ امن و عافیت کو اتنا ہی فروغ ملے گا۔ اس کے برعکس انسانی آبادیوں میں ظلم، غصبِ حقوقِ زندگی اور ناجائز نفع اندوزی میں جتنا اضافہ ہوگا، لازماً فتنہ و فساد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور قیامِ امن کے امکانات فنا ہو جائیں گے۔ پس روایت و درایت ہر دو چیزیں یہی فیصلہ صادر کرتی ہیں کہ دنیا کو اپنے لئے بہشت یا دوزخ بنا لینا انسان کے اپنے طرزِ عمل پر موقوف ہے۔ انصاف کیجئے تو بہشت، اور ظلم کیجئے تو دوزخ۔ بہرکیف انسانیت کے فطری اور قدرتی حقوقِ زندگی کا اتلاف ایک ایسا جرم ہے جسے قدرت کسی قیمت پر معاف نہیں کرتی، اور جمہور میں ایک برقِ انتقام بھر کر "کنجشکِ فرومایہ" کو "شاہیں" سے بے دریغ لڑا دیتی ہے۔ کبھی ایک خوفناک زلزلہ بن کر "کاخِ امراء" کے در و دیوار کو ہلا دیتی ہے اور کبھی اس کھیت کے ہر "خوشۂ گندم" کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، جس سے کسان کو روٹی بھی میسر نہیں ہوتی۔ آپ ہی فرمائیے کہ انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس جیسے سنسنی خیز اور عبرت انگیز واقعات کس چیز کا نتیجہ تھے؟ اقتصادی اور معاشی ظلم و تعدی کا! خالقِ کائنات اپنے نظامِ عدل، صفتِ رزّاقی اور معاشی توازن کے

ساتھ اپنی مخلوق میں جو رزق تقسیم کرتا ہے، کسی بندۂ حرص و آز کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ رزق ان کی جھولی سے چھین کر اپنی تجوری میں بھرے؟ پس بنابریں اس حقیقتِ ابدی کو کبھی فراموش نہ کیجئے کہ "امن" کا حقیقی سرچشمہ بھی "پیٹ" ہے اور "فساد" کا اصل منبع بھی پیٹ۔ اگر خلقِ خدا کا وہ پیٹ بھرا رہنے دیا جائے گا، جسے رزاقِ مطلق پوری فیاضی سے از خود بھرنا چاہتا ہے تو امن یقیناً برقرار رہے گا، اور اگر اس پیٹ کو ہوسِ زر سے خالی رکھنے کی کوشش کی گئی، تو قدرت خود مسلح ہو کر ظالموں پر حملہ آور ہو گی۔ یہ نہ کارل مارکس کا نظریہ ہے، نہ لینن کا، نہ سٹالن کا اور نہ دنیا کے کسی اور شخص کا۔ یہ تو حسبِ قرآن اللہ تعالیٰ ہی کا وہ "قولِ فیصل" ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت کمزور و متغیر نہیں کر سکتی۔ وہ فقدانِ عدل یا "ظلم و فساد" کے خلاف ہمیشہ بذاتِ خود صف آرا رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ تاریخ کے بے شمار انقلابات اس حقیقت پر گواہ ہیں!

انفرادی اور اجتماعی ترقی کا راز

جس ملک یا معاشرہ میں اجتماعی یا معاشی توازن نہ ہو، وہاں نہ انفرادی ترقی ممکن ہے، نہ اجتماعی۔ جب معاشی ظلم و غصب اور اتلافِ حقوقِ زندگی سے بددلی، نفاق اور نفرت اس حد تک بڑھ جائے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے انس و ہمدردی ہی نہ رہے تو پھر بے چارے افراد کیا ترقی کریں گے؟ اور جب "افراد" نے زندگی کے کسی شعبے میں ذوق و شوق اور سرگرمی سے جدوجہد نہ کی تو پوری "قوم" از خود قعرِ مذلت و نکبت میں جا پڑی۔ سوال یہ ہے کہ "قوم" ہے کیا چیز؟ — افراد کے مجموعے ہی کا نام تو "قوم" ہے۔ اور جب معاشی انتشار و بدنظمی اور غصبِ حقوق سے افراد ہی میں باہمی امداد و تعاون کا جذبہ نہ رہا، تو قوم کی حیاتِ اجتماعی کیوں کر

زوال پذیر نہ ہو گی؟ — یہی وجہ ہے کہ معاشی توازن سے محروم ممالک میں داخلی فسادات اور ہنگامے اس کثرت سے رہتے ہیں کہ "قوم" کے لئے کوئی ٹھوس اور مستقل تعمیری کام ہو ہی نہیں سکتا۔ آج اس کارخانے میں ہڑتال ہو رہی ہے تو کل اس فیکٹری کو تالے لگ رہے ہیں۔ آج یہاں مزدوروں کی بھوک ہڑتال ہے تو کل وہاں "روٹی" کے جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکام اور رعایا میں باہمی اعتماد و تعاون نہ ہونے کی وجہ سے قوم کے بیشتر تعلیمی، تجارتی، صنعتی اور زرعی منصوبے وہیں کے وہیں دھرے رہ جاتے ہیں۔ تسلی بخش حقِ محنت نہ ملنے کی وجہ سے نہ افراد نے کسی کام میں پوری دلچسپی لی اور نہ اجتماعی "فلاح و بہبود کا کوئی لائحہ عمل پایہ تکمیل کو پہنچا، اور زیادہ سے زیادہ ہوا تو یہ ہوا کہ حکومت کے سرمایہ، وقت اور محنت کا بیشتر حصہ فضول ضائع ہو گیا اور "طبقاتی جنگ" جوں کی توں جاری رہی۔ ہر متنفس محرومِ امن و عافیت، حاکم اور محکوم ہر دو یکساں طور پر مضطرب پریشاں خیال اور ہدفِ شکایت و ملامت ہیں یہ ہے معاشی انتشار و بدنظمی کا ادنیٰ ثمرہ کہ ایک ملک میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گویا کچھ نہیں۔ اور سامانِ راحت مہیا کر سکنے کے باوجود انسانیت گرفتارِ فلاکت و اذیت ہے۔

"دستِ دولت آفریں" کی حق تلفی اور اس کے عبرت انگیز نتائج و عواقب

بہرکیف یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے کہ خواہ صنعتی ادارے ہوں خواہ مختلف مصنوعات کے کارخانے ہوں خواہ زمینوں میں کھیتی باڑی کا کام ہو، درحقیقت محنت کرنے والا، ہر چیز اور ہر مشین کے مصرف و مقصد کو پروان چڑھانے والا، بنجر زمینوں کو سرسبز و شاداب کرنے والا اور سرپھیر کر دنیا کی مختلف منڈیوں میں دولت کے انبار لگانے والا اصل ہاتھ "مزدور" اور

"کسان" کا ہاتھ ہے۔ نہ کہ سرمایہ دار کا۔ سرمایہ دار تو زیادہ سے زیادہ خزانے کا سانپ ہے، اور حسب آیۂ قرآنی "مال کو جمع کر کے شب و روز اسے گنتا رہتا ہے"۔ الغرض سرمایہ دار تو ہر وقت رہتا ہے "ننانوے کے پھیر میں" اور بیچارہ مزدور تیلی کے بیل کی طرح خون پسینہ ایک کر کے اس کے سامنے سیم و زر کے ڈھیر لگاتا چلا جاتا ہے۔ بایں ہمہ جس خیرہ چشمی اور ظلم و بے رحمی سے "دستِ دولت آفریں" کی حق تلفی کی جاتی ہے وہ کسی سے پنہاں نہیں اور اس ظلم عظیم سے دنیا کے بیشتر ممالک میں جو فتنہ و فساد اور تصادم و پیکار برپا ہے، وہ سب پر واضح ہے۔

بہرکیف اس موضوع پر کسی طویل بحث و تمحیص میں پڑے بغیر دو ٹوک بات یہ ہے کہ عہدِ حاضر میں عالمگیر امن و عافیت کے قیام کا انحصار سراسر اس طریق عمل پر ہے کہ مزدور و مزارع اور محنت کش طبقوں کے حقوقِ زندگی پوری دیانتداری اور فراخدلی سے ادا کئے جائیں، ان کے معیارِ زیست کو بلند تر کیا جائے اور انسانیت کی سطح پر ان سے بہمہ وجوہ انسانوں کا سا سلوک کیا جائے۔ اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو یہ چیز خالقِ کائنات کے نظامِ عدل کی صریح خلاف ورزی ہے، آئینِ فطرت کے خلاف بغاوت و سرکشی ہے، ناموسِ آدم کی توہین و تذلیل ہے، روحِ شرافت و نجابت پر شرمناک حملہ ہے، صدائے ضمیر سے بدترین فریب و دغا ہے اور اس لئے تمام ظالم و جابر طبقوں کو روحِ حق و دیانت کے خلاف اس قدر کفر و طغیان کا وہ خمیازہ بھگتنا ہو گا جو ایسے طریق عمل کے لئے ازل سے مقدر ہو چکا ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو!

کلامِ اقبالؔ میں سرمایہ و محنت پر عادلانہ نقد و نظر

میں نے آغازِ مضمون میں بھی عرض کیا تھا کہ علامہ اقبالؔ کسی خاص فرد یا قوم کے دستورِ معیشت یا آئینِ اقتصادیات سے بالکل بالا و بے تعلق رہتے ہوئے سرمایہ و محنت کی کش مکش اور ہر معاشی ظلم و بدنظمی کو صرف معیارِ فطرت اور اصولِ عدل و انصاف سے رفع کرنا چاہتے ہیں، اور چونکہ اسلام کا نظامِ معیشت معیارِ فطرت سے سو فی صد ہم آہنگ ہے اور اصولِ عدل و انصاف کا بہترین و مکمل ترین مظہر، لہٰذا وہ عہدِ حاضر کی تمام معاشی بے اعتدالیوں اور سرمایہ و محنت کے اختلافات و مناقشات کو قرآن و اسلام ہی سے حل کرنے کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ چنانچہ آئندہ مثالوں میں علامہ اقبالؔ جہاں ملّتِ روسیہ کو خطاب فرماتے ہیں، وہاں بھی قرآنی دستورِ معیشت ہی کو اپنانے کی پے در پے تاکید کی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اشتمالیت و اشتراکیت کو تکلّفِ محض قرار دیا ہے!

بہر کیف ذیل میں "سرمایہ و محنت" کے متعلق علامہ مرحوم کی وہ تمام منظومات درج کی جا رہی ہیں جن میں سرمایہ دار کی گوناگوں چیرہ دستیوں، حق تلفیوں اور فریب کاریوں کے خلاف احتجاج بھی ہے اور حقوقِ مزدور کی منصفانہ حمایت و ترجمانی بھی، جاگیرداری اور ہوسِ زمین کی شدید مذمت بھی ہے۔ حامیانِ مزدور کے ولولہ انگیز نعرے بھی ہیں، ہمدردانِ محنت و مشقت کی پُرخلوص درد مندصدائیں بھی ہیں، انسانیت کے خفتہ و پس ماندہ طبقوں کو اپنے جائز حقوقِ زندگی کی تحصیل و تسخیر کے لئے بیدار و مستعد ہونے کی تلقین بھی ہے اور اصلاحِ معاشیات کے لئے تعلیماتِ قرآن پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بھی! —

ارض ملکِ خُدا است

حاصل آئین و دستورِ ملوک؟ — دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک
بادشاہوں کے آئین و قانون کا حاصل کیا ہے؟ — گاؤں کے مالک موٹے تازے اور کسان چرخے کا تکلا

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب — بہرِ خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب
مشرق و مغرب میں اولاد آدم کی داستان مختصر یہ ہے — کہ زمین کے ایک ٹکڑے کیلئے جنگ کے فتنے برپا کر رکھے ہیں

یک عروس و شوہرِ او ما ہمہ — آں فسوں گر بے ہمہ، ہم با ہمہ
وہ زمین تو ایک دلہن ہے اور ہم سب اس کے شوہر — وہ جادوگرنی سب سے الگ بھی ہے اور سب کے ساتھ بھی

عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است — نے ازانِ تو نہ از آنِ من است
اس کے ناز و انداز سراپا مکر و فریب ہیں — وہ نہ تو تیری بن کر رہی ہے اور نہ میری

در نسازد با تو ایں سنگ و حجر — ایں ز اسبابِ حضر تو در سفر
دراصل زمین کا ساز و سامان تجھ سے موافقت ہی نہیں کرتا — یہ سب اسبابِ قیام ہیں اور تو سفر میں ہے

اختلاطِ خفتہ و بیدار چیست؟ — ثابتے را کار با سیّار چیست؟
پس سوئے ہوئے اور جاگتے کا باہمی رابطہ ہی کیا ہے؟ — اور ایک جگہ پڑے رہنے والے اور چلنے والے کا تعلق ہی کیا ہے؟

حق زمیں را جز متاع، ما نہ گفت[۱] — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
خدا نے تو زمین کو ہمارے لئے صرف "فائدہ" بتایا ہے — اس لحاظ سے یہ انمول چیز مفت ہی مفت ہے

دِہ خدایا! نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر!
اے گاؤں کے مالک! میرا یہ نکتہ یاد رکھ کہ — زمین سے روزی اور قطعہ قبر حاصل کر، خود اس پر قبضہ نہ جما

---

[۱] وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ "اور ایک مدت تک تمہیں (میری) زمین میں رہنا اور اس سے (عارضی) فائدہ اٹھانا ہے۔"

صحبتش تا کے تو بود و او نبود　　تو وجود و او نمودِ بے وجود

اس کی صحبت کب تک جبکہ تو غیر فانی ہے اور وہ فانی　　تیرا وجود مستقل ہے اور وہ وقتی و عارضی نمود

تو عقابی طائفِ افلاک شو　　بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

تو عقاب ہے لہٰذا آسمانوں کی سیر کر　　اپنے بال و پر کھول اور پستیِ خاک سے بلند تر ہو جا

باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ ظاہر است

"زمین خدا کی ہے" اس کا مفہوم و مقصد بالکل واضح ہے

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

جو بھی اس بیّن حقیقت کو نہ دیکھے وہ کافر ہے

من نگویم در گذر از کاخ و کوئے　　دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بوئے

میں یہ نہیں کہتا کہ مادی ساز و سامان سے کنارہ کش ہو جا　　ملکہ یہ جہانِ رنگ و بو تو تیری دولت ہے

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر　　صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

اس کی مٹی سے ایک ایک دانہ موتی کی طرح چن　　اور اس کے آسمان سے باز کی طرح اپنا شکار پکڑ

تیشۂ خود را بکہسارش بزن　　نورے از خود گیر و بر نارش بزن

اپنے تیشے کو اس کے پہاڑوں پر مار　　اور اپنا نورِ ایمان اس کی نارِ کفر پر بکھیر دے

از طریقِ آزری بیگانہ باش　　بر مرادِ خود جہانِ نو تراش

بت گری کے طریقے سے احتراز کر　　اور اپنے حسبِ منشا ایک نئی دنیا بنا

دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ　　دل حریم اوست جز با او مدہ

اپنا دل رنگ و بو اور کاخ و کو میں نہ پھنسا　　دل صرف خدا کا گھر ہے اور اس کے سوا یہ گھر کسی کو نہ دے

مردنِ بے برگ و بے گور و کفن　　گم شدن در نقرہ و فرزند و زن

ساز و سامان اور گور و کفن کے بغیر مر جانے کے کیا معنی ہیں؟　　یہی کہ انسان سونے چاندی اور زن و فرزند میں گم ہو جائے

ہر کہ حرفِ لَا اِلٰہ از بر کند — عالمے را گم بخویش اندر کند

جو شخص بھی حرفِ لا الٰہ کو خوب یاد کرتا ہے — وہ ایک دنیا کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست

فقر بھوک، رقص اور برہنگی کہاں ہے؟

فقر سلطانی است رہبانی کجاست (جاوید نامہ)

فقر تو بادشاہی ہے، رہبانیت کہاں ہے!

خطاب بہ ملّتِ رُوسیّہ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اے کہ تو دنیا کے لئے مستقل نظامِ ہستی چاہتا ہے — کیا تو نے اس کے لئے کوئی مضبوط بنیاد بھی تلاش کی؟

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از امّ الکتاب

تو نے پرانی داستانِ معیشت کو تو بالکل ختم کر دیا — اب اپنی فکر کو تعلیماتِ قرآن سے روشن کر

با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد؟ — مژدۂ "لا قیصر و کسرٰے" کہ داد؟

سیاہ فام لوگوں کو یدِ بیضا کس نے عطا کیا؟ — اور بربادیِ قیصر و کسرٰے کی خوشخبری کس نے سنائی

در گذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ — خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

سیاست میں رنگا رنگ کے جلووں سے کنارہ کش ہو — اور فرنگ سے محترز ہو کر اپنی عظمت و صلاحیت کو سمجھ

گر ز مکرِ غربیاں باشی خبیر — روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر

اگر تو اہلِ مغرب کے مکر و فریب سے باخبر ہو — تو لومڑی کی سی چالیں چھوڑ دے اور طریقِ شیری اختیار کر

چیست روباہی؟ تلاشِ ساز و برگ — شیرِ مولا جوید آزادی و مرگ

روباہی کیا ہے؟ فقط مادی ساز و سامان کی جستجو — لیکن جو شیرِ خدا ہے وہ تو آزادی و موت کا متلاشی ہوتا ہے

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بذکر

قرآنی فقر کیا ہے؟ ذکر و فکر کا ربطِ کامل — میں نے محض فکر کو ذکر کے بغیر ہرگز مکمل نہ پایا

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب — کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب

ذکر کیا ہے؟ ذوق و شوقِ حق کی تادیب ہے — یہ روح کا وظیفہ ہے، حلق اور ہونٹوں کا کام نہیں

خیزد از وے شعلہ ہائے سینہ سوز — با مزاجِ تو نمی سازد ہنوز

ذکر سے وہ سینہ سوز شعلے پیدا ہوتے ہیں — جو ابھی تیرے مزاج کو سازگار نہیں ہوں گے

اے شہیدِ شاہدِ رعنائے فکر

اے فکر کے معشوقِ حسین کے شہید

با تو گویم از تجلی ہائے فکر

میں تجھے فکر کی کچھ تجلیات دکھاتا ہوں

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

قرآن کیا ہے؟ ظالم آقا کے لئے پیغامِ موت ہے — وہ بے ساز و سامان غلام کا دستگیر ہے

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

سونا چاندی سمیٹنے والے شخص سے کسی بھلائی کی توقع نہ رکھ — اللہ تم نیکی کو پا ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ مال کو راہِ خدا خرچ نہ کرو

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! — کس نداند لذتِ قرضِ حسن

سود سے آخر پیدا کیا ہوتا ہے؟ فتنے! — اور کوئی شخص قرضِ حسنہ کے فوائد کو سمجھتا ہی نہیں

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ — آدمی درندہ بے دندان و چنگ

سود سے روح تاریک اور دل پتھر ہو جاتا ہے — اور آدمی دانتوں اور پنجوں بغیر درندہ بن جاتا ہے

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاع، بندہ و ملکِ خداست

زمین سے تو اپنا رزق ہی لینا جائز ہے — یہ بندے کے لئے عارضی فائدہ ہے اور خدا کی ملکیت

بندۂ مومن امیں حق مالک است ¹ غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

بندہ مومن تو صرف امانت دار ہے اور مالک خدا — خدا کے علاوہ ہر چیز فنا و برباد ہونے والی ہے

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں ² قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

حق کا جھنڈا بادشاہوں کے ظلم و ستم سے سرنگوں ہوا — اور بہت سی آبادیاں انکے داخلے سے تباہ و برباد ہو گئیں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ

لیکن ہمارا آب و نان تو ایک ہی دسترخوان سے ہے

دودۂ آدم ³ كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اور آدم کا تمام خاندان (اولاد) ایک ہی جان کی طرح ہے

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

جب سے قرآن کا نقش اس دنیا میں بیٹھا — کاہن اور پاپا کے نقوش بالکل مٹ گئے

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

جو کچھ میرے دل میں ہے میں اسے صاف صاف کہے دیتا ہوں — قرآن تو محض کتاب نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

جب وہ روح میں اترتا ہے تو اس کی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے — اور جب روح منقلب ہوئی تو تمام دنیا بدل گئی

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پایندہ و گویاست ایں

وہ خدا کی طرح پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی — وہ زندہ و پائندہ اور بولتی ہوئی کتاب ہے

---

¹ تلمیح بآیہ شریفہ :- كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

² " " " :- إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً الخ

³ " " " :- مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا الخ

اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

اس میں مشرق و مغرب کی تقدیر پنہاں ہے — اسے سمجھنے کے لئے اپنی فکر میں بجلی کی سی تیز رفتاری پیدا کر

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ[1]

اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ دے — اور تیرے پاس جو کچھ بھی زائد از ضرورت ہے راہِ خدا میں دے ڈال

آفریدی شرع و آئینے دگر — اندکے با نورِ قرآنش نگر

تو نے ایک نئی شریعت اور نیا دین وضع کیا ہے — اس کو ذرا نورِ قرآن کی روشنی میں بھی پرکھ

از بم و زیرِ حیات آگہ شوی

پھر تو زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو جائے گا

ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی (جاوید نامہ)

اور زندگی کی تقدیر و تدبیر سے بھی باخبر ہو گا۔

ہمچناں ایں باد و خاک و ابر و کشت — باغ و راغ و کاخ و کوے و سنگ و خشت

اسی طرح اس ہوا، مٹی، بادل اور کھیت کو دیکھو — باغ، جنگل، مکانات و محلات پر نظر کرو

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

اے کہ تو مدعی ہے کہ یہ سب سامان میرا ہے — ناداں! یہ تو سب کچھ خدا کی ملکیت ہے

ارضِ حق را ارضِ خود دانی، بگو — چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوْا؟[2]

اگر تو خدا کی زمین کو اپنی زمین سمجھتا ہے تو بتا — کہ آیۂ لا تفسدوا کا کیا مطلب ہے؟

ابنِ آدم دل با بلیسی نہاد — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

آدم کے بیٹے نے اپنا دل شیطانی نظام سے وابستہ کر لیا — اور میں نے اس نظام میں فتنہ و فساد کے سوا کچھ نہ دیکھا

---

[1] تلمیح با آیۂ شریفہ :- يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ

[2] وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا "اس کی اصلاح کے بعد زمین میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔"

کس امانت را بکارِ خود نبرد
اے خوش آں کو ملکِ حق باحق سپرد

کسی نے امانت کبھی اپنی ضرورت میں صرف نہیں کی
لہٰذا مبارک ہے وہ شخص جس نے خدا کی چیز خدا کے سپرد کی

بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست
داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست

تو نے اس چیز پر قبضہ جما رکھا ہے جو تیری نہیں
اور میں ایسے کام پر متاسف ہوں جو تیری شان کے لائق نہیں

گر تو باشی صاحبِ شے، می سزد
ور نباشی، خود بگو کے می سزد؟

جب تو ایک چیز کا مالک ہے تو تجھے اس کا قبضہ زیب بھی دیتا ہے
اور اگر تو مالک نہ ہو تو بتا کہ تجھے ملکیت زیب دیتی ہے

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ
تا زکارِ خویش بکشائی گرہ

پس خدا کی چیز (زمین وغیرہ) خدا کو واپس کر دے
تاکہ تو اپنی مشکلات کو بآسانی حل کر سکے

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست؟
آنچہ از مولاست، می گوئی زماست!

اتنا تو بتا کہ دنیا میں غربت و افلاس ہے کیوں
یہ اسلئے ہے کہ تو خدا کی مملوکہ چیزوں کو اپنی چیزیں بتاتا ہے

بندۂ کز آب و گل بیروں نجست
شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست

وہ بندہ جو ذاتی اغراض سے باہر نہ نکل سکا
اس نے گویا اپنا شیشہ اپنے ہی پتھر سے توڑ دیا

اے کہ منزل را نمی دانی ز رہ
قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ!

اے کہ تو منزل کو راستے سے ممیز ہی نہیں کر سکتا
ہر چیز کی قیمت اندازِ نگاہ سے پڑتی ہے

تا متاعِ تست، گوہر گوہر است
ورنہ سنگ است از پشیزے کمتر است

جب تک ہیرا تیری ملکیت میں ہے وہ ہیرا ہے
ورنہ وہ پتھر ہے اور ایک دمڑی سے بھی کم قیمت

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
پس جب تیرا اندازِ نظر بدلے تو دنیا بھی بدل جاتی ہے

ایں زمین و آسماں دیگر شود (جاوید نامہ)
اور یہ زمین و آسمان بھی یکسر بدل جاتے ہیں

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد — آبروئے دخترِ مزدور بُرد

سرمایہ دار نے بندۂ مزدور کی روٹی بھی کھا لی — حتّٰی کہ دخترِ مزدور کی عزت و آبرو بھی چھین لی

در حضورش بندہ می نالد چو نَے — بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے

اس کے سامنے اس کا غلام بانسری کی مانند آہ و فریاد کرتا ہے — اور اس کے ہونٹوں پر نالہ پر درد کا تانتا بندھا ہوا ہے

نے بجامش بادہ و نے در سبوست — کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

نہ تو مزدور کے جام میں کچھ شراب ہے اور نہ سبو میں — اس نے محلات بنا کر کھڑے کر دیئے اور خود کوچہ میں پڑا ہوا ہے

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست

مبارک ہے وہ دولت مند جس نے درویش کی سی زندگی بسر کی

در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

اور ایسے زمانے میں وہ خدا سے خائف بھی رہا

تا نہ دانی نکتۂ اکلِ حلال — بر جماعت زیستن گردد وبال

جب تک تو حلال روزی کا نکتہ نہ سمجھ لے — جماعت پر جینا بھی باعثِ وبال ہے

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست — چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست

افسوس کہ یورپ اس مقام سے آگاہ نہیں ہے — اور اس کی آنکھ کائنات کو اللہ کے نور سے نہیں دیکھتی

او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است و کارش ناتمام

وہ حلال و حرام کے فرق کو نہیں سمجھتا — اس کی حکمت خام ہے اور کام ناتمام

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد — دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

ایک قوم دوسری قوم کو کھا رہی ہے — یہ دانا بوتا ہے اور وہ اس کا حاصل کھا لیتا ہے

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

کمزوروں سے روٹی چھیننا ان کے نزدیک حکمت ہے — اور ان کے جسم سے جان اڑا لینا ان کی حکمت ہے!

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است | پردۂ آدم دری سوداگری است
نئی تہذیب کا طریقہ انسانوں کو پھاڑنا ہے | اور اس درندگی پر پردہ ڈالا گیا ہے تجارت کا

این بنوک این فکرِ چالاکِ یہود | نورِ حق از سینۂ آدم ربود
یہ بنّے بڑے بنک اور یہودیوں کی فکرِ چالاک | انسان کے سینہ سے نورِ حق چھین لے گئے

تا تہ و بالا نہ گردد این نظام
جب تک یہ ظالمانہ نظام تباہ و برباد نہ ہو
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام
عقل تہذیب اور پیرویِ مذہب بالکل ناممکن ہے

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم | تا کجا در حجرہ می باشی مقیم؟
اے کہ تو قرآنِ عظیم پر فخر کرتا پھرتا ہے | تو کب تک حجرے کے کونے میں مقیم رہے گا

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن | نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
دنیا میں دینِ حق کے اسرار کو ظاہر کر | اور شریعت کے نکات لوگوں میں بیان کر

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس | نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس
کوئی شخص دنیا میں کسی کا محتاج نہ ہو | شریعت کا اقتصادی نکتہ ہے تو بس یہ ہے۔

مکتب و ملا سخن ہا ساختند | مومناں این نکتہ را نشناختند
مدرسہ میں ملا نے ہزاروں باتیں بنائیں | مگر مسلمانوں نے یہ نکتۂ امن و عافیت نہ سمجھا

زندہ قومے بود از تاویل مرد
یہ ایک زندہ قوم تھی جو تاویلات سے مر گئی
آتشِ او در ضمیرِ او فسرد (پس چہ باید کرد)
اور اس کی آگ اس کے دل میں بجھ گئی۔

صُحبتِ رفتگاں

در عالمِ بالا

ٹالسٹائی[1]

بارکشِ اہرمن لشکریٔ شہریار

بادشاہ کا لشکری جو بالفاظِ دیگر ابلیس کا مزدور ہے

از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید

اور جس نے جو کی ایک روٹی کے لیے ظلم کی تلوار سونت رکھی ہے

زشت بہ چشمش نکوست، مغز نداند ز پوست

بدصورت اس کی نظر میں خوبصورت ہے اور وہ مغز کو چھلکے سے تمیز نہیں کر سکتا

مردکِ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید

ایسے مرد بیگانہ دوست نے اپنوں کا سینہ پھاڑا

داروئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن

دراصل تاج، کلیسا اور وطن ایک دوائے بیہوشی ہے

جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

اور سرمایہ دار نے ایک جامِ شراب کے عوض خداداد روح خرید لی

[1] روس کا مشہور مصلح جس نے روس کی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔

کارل مارکس[1]

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است
جزو و کل کا رازدان انسان اپنے آپ سے غافل و بےخبر ہو رہا ہے

آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است
اور انسان سرمایہ داری کی وجہ سے انسان کا قاتل ہو رہا ہے

ہیگل[2]

جلوہ دہد باغ و راغ معنیٔ مستور را
باغ اور جنگل قدرت کے پوشیدہ معانی کو آشکارا کر رہے ہیں

عینِ حقیقت نگر حنظل[3] و انگور را
لہٰذا تو اندرائن کے پھل اور انگور ہر دو کو حقیقت سے وابستہ سمجھ

---

[1] جرمنی کا مشہور اسرائیلی ماہرِ اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اس کی مشہور کتاب موسوم "سرمایہ" کو مذہبِ اشتراک کی بائیبل تصور کیا جاتا ہے [2] جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی جس کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام کائنات متضاد و متخالف چیزوں کے باہمی تصادم سے برقرار و پائدار ہے اور اسی فعل سے مختلف اجزائے کائنات کا ارتقا ہے اور پھر اضداد کا یہ مقابلہ و پیکار ایک مسلسل اور غیر متناہی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ خدا جانے اکبر الہ آبادی نے ہیگل کا یہ فلسفہ اپنے شعر میں عمداً منتقل کیا ہے یا یہ ایک اتفاقی چیز ہے بہرکیف ان کا یہ بلیغ و حیرت انگیز شعر ملاحظہ ہو۔

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

[3] اندرائن کا پھل جو نہایت کڑوا ہوتا ہے۔

فطرتِ اضداد خیز لذتِ پیکار داد
وہ فطرت جو مخالف و متضاد چیزیں پیدا کرتی ہے اس نے
خواجہ و مزدور را، آمر و مامور را
سرمایہ دار و مزدور اور حاکم و محکوم کو ذوقِ تصادم بخشا

ٹالسٹائی

عقلِ دو رُو آفرید فلسفۂ خود پرست
دو رنگی اور منافق عقل نے فلسفۂ خود پرستی و خود کامی ایجاد کیا
درسِ رضا می دہد بندۂ مزدور را
اور اس لئے وہ بندۂ مزدور کو تسلیم و رضا کا درس دیتی ہے

مزدک

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بر دمید
زار و قیصر کی کھیتی سے دانۂ ایران پیدا ہو گیا
مرگِ نوی رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
اور قصرِ سلطان و امیر میں ایک نئی موت رقص کر رہی ہے
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل
خلیل اللہ کو بھی ایک مدت آتشِ نمرود میں جلنا پڑتا ہے
تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر
تاکہ اس کی چار دیواری (کعبہ) پرانے خداؤں سے خالی ہو جائے

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز

دورِ پرویز ختم ہو چکا، لہٰذا اے کشتۂ پرویز اٹھ

نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

اپنے گم شدہ حقوق کو خسرو سے دوبارہ حاصل کر

کوہکن[1]

نگارِ من[2] کہ بسے سادہ و کم آمیز است

میرا معشوق جو بظاہر بہت ہی سادہ لوح اور کم آمیز ہے

ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است

درحقیقت جنگجو، ظالم و ستم شعار اور فتنہ انگیز ہے

برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم

اس کا ظاہر سراسر صلح ہے، لیکن باطن جنگ و پیکار

زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است

اس کی زبان تو مسیح کی ہے، مگر دل چنگیز کا

گسست عقل و جنوں تنگ بست و دیدہ گداخت

عقل شکست کھا گئی، عشق غالب آ گیا اور آنکھ پگھل گئی

درآ بجلوہ کہ جانم ز شوق لبریز است

اب جلوہ نما ہو کر میری روح شوقِ دید سے لبریز ہے

۱؎ کوہکن سے مراد ہے مزدور۔ ۲؎ یہاں نگار سے مراد ہے سرمایہ دار

اگرچہ تیشۂ من کوہ راز پا آورد
اگرچہ میرے تیشے نے پہاڑ سے جڑ سے اکھیڑ پھینکا
ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است
لیکن اب بھی آسمان کی گردش پرویز کی طرف وار ہے
زخاک تا بہ فلک ہرچہ ہست رہ پیماست
بہرکیف زمین سے آسمان تک سب کچھ محوِ سفر و وقفِ تغیر ہے
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است (پیامِ مشرق)
تو بھی تیزی سے قدم اٹھا کیونکہ قافلے کی رفتار بہت تیز ہے

محاورہ مابین اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور

کومٹ[1]

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"
آدم کی اولاد ایک دوسرے کے اعضائے جسم ہیں
ہماں نخل را شاخ و برگ و برِ اند
اور سب ایک ہی درخت کی شاخیں پتے اور پھل ہیں
دماغ ار خرد ورز است از فطرت است
اگر دماغ صاحبِ عقل و فہم ہے تو یہ بھی فطرت سے ہے
اگر پا زمیں سا است از فطرت است
اگر پاؤں زمین پر پھرتے ہیں تو یہ بھی فطرت سے ہے
یکے کار فرما، یکے کار ساز
پس اگر ایک شخص حکم دینے والا ہے تو دوسرا بجا لانے والا
نیاید ز محمود کارِ ایاز
اور ظاہر ہے کہ محمود سے کارِ ایاز نہیں ہو سکتا

[1] فرانس کا مشہور فلسفی۔

نہ بینی کہ از قسمتِ کارِ زیست
کیا تو نہیں دیکھتا کہ کارِ زندگی کی تقسیم سے
سراپا چمن می شود خارِ زیست
خارِ زندگی بھی سراپا چمن بن جاتا ہے

مردِ مزدور

فریبی بحکمت مرا اے حکیم
اے فلسفی تو مجھے اپنے اس فلسفہ سے دھوکا دے رہا ہے
کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
کہ بندہ و آقا کا پرانا جادو توڑا نہیں جا سکتا

مسِ خام را از زر اندودۂ؟
کیا تو نے کچے تانبے کو سونے کا پالش کیا ہے؟
مرا خوئے تسلیم فرمودۂ؟
اور مجھے خوئے تسلیم و رضا سکھا رہا ہے؟

کند بحر را آبنایم اسیر
میری جھیل سمندر کو اپنے اندر مقید کرتی ہے
ز خارا برد تیشہ ام جوئے شیر
اور میرا تیشہ پتھر سے دودھ کی نہر نکالتا ہے

حقِ کوہکن[1] دادی اے نکتہ سنج
اے نکتہ شناس فلسفی! تو نے فرہاد کا حق
بہ پرویز[2] پرکار و نابردہ رنج؟
عیار اور تن آسان پرویز کو دے دیا

خطا را بحکمت مگرداں صواب
تو دلیلِ فلسفہ سے گناہ کو نیکی ثابت نہ کر
خضر را نہ گیری بدامِ سراب
کیونکہ خضر کو سراب کے جال میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا

بدوشِ زمیں بارِ سرمایہ دار
سرمایہ دار تو زمین کے کاندھے کا فضول بوجھ ہے
ندارد گذشت از خور و خواب کار
اور اسے کھانے اور سونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں

[1] مراد مزدور۔ [2] مراد سرمایہ دار

جہاں راست بہروزی از دستِ مزد — ندانی کہ ایں ہیچ کار است دزد

دنیا کی حقیقی رونق و ترقی مزدور کے ہاتھ سے ہے — اور یہ نہ سمجھ کہ کوئی ڈاکو بھی یہ فرض ادا کر سکتا ہے

پئے جرم او پوزشش آوردہ؟

کیا تو سرمایہ دار کے جرمِ ظلم و تعدی پر عذر لے کر آیا ہے

بایں عقل و دانش فسوں خوردہ؟ (پیامِ مشرق)

اس عقل و فہم کے باوجود تجھ پر جھوٹ کا جادو چل گیا

قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور

غوغائے کارخانۂ[1] آہنگری ز من

کارخانۂ آہن سازی کا تمام شور و غوغا میرے لئے ہے

گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو!

اور کلیسا میں بجنے والے ساز کے حسین و دلپذیر نغمے تیرے لئے

نخلے کہ شہ خراج بروے می نہد ز من

وہ درخت جس پر بادشاہ نے ٹیکس لگا رکھا ہے بدقسمتی سے میرے حصے میں آیا ہے

باغِ بہشت و سدرہ و طوبا ازانِ تو!

تیرے نصیب میں شجرِ سدرہ و طوبا اور باغِ بہشت جیسی نعمتیں ہیں

تلخابۂ کہ دردِ سر آرد ازانِ من

وہ کڑوا پانی (شراب) جو دردِ سر پیدا کرتا ہے میرے حصے میں آیا ہے

---

[1] ترجمہ کے شروع میں یہ محذوف الفاظ پڑھ لیجئے کہ "سرمایہ دار نے مزدور سے کہا کہ کیا تو اس پر بھی مسرور و مطمئن نہیں کہ:

صہبائے پاکِ آدم و حوّا ازانِ تو!

اور بہشت میں آدم و حوا کی پاک شراب تجھے مرحمت فرمائی گئی

مرغابی و تدرو و کبوتر ازانِ من

مرغابی چکور اور کبوتر جیسے سفلی پرندے مجھے کھانے کو ملے

ظلِّ ہُما و شہپرِ عنقا ازانِ تو!

اور ہما اور عنقا جیسے بلند و مبارک پرندوں کا سایہ تجھے نصیب ہوا

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او ازانِ من

زمین کی یہ مٹی اور جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے سب مجھے سنبھالنا پڑا

وز خاک تا بہ عرشِ معلّا ازانِ تو! (پیامِ مشرق)

اور خاکِ زمین سے عرشِ معلّا تک سب کچھ تیری جاگیر

نوائے مزدور

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش

شکستہ محنت ہو جانے والے اور ٹاٹ پہننے والے مزدور کی سعی سے

نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

بے کار و تن آسان سرمایہ دار ریشم کا لباس پہنتا ہے

ز خوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی

میں جب پسینہ بہاتا ہوں تو اس سے آقا کی انگشتری کا لعل تیار ہوتا ہے

ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر

اور میرے بچے کے آنسوؤں سے امیر کے گھوڑے کی زین کا موتی بنتا ہے

۱؎ ستام: گھوڑے کو سجانے کا سامان، زین۔

زخونِ من چو زلو فربہی کلیسا را

کلیسا (مذہبی حلقہ) میرے خون سے جونک کی طرح موٹا ہوتا چلا جاتا ہے

بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

اور حکومت کا ہاتھ میری قوتِ بازو سے توانا اور ہمہ گیر ہے

خرابہ رشکِ گلستاں زگریۂ سحرم

میرے گریۂ سحری سے ویرانے بھی رشکِ گلستان بن جاتے ہیں

شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور لالہ و گل کا جوشِ شباب میری طراوتِ جگر سے ہے

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز

آ اور سن کہ تارِ ساز سے نئے نغمے برپا ہو رہے ہیں

مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

آ کہ اب ساغر میں وہ شراب ڈالیں جو شیشے کو پگھال دے

مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم

پیرِ مغاں اور میخانۂ مغاں کو تازہ نظامِ ہستی عطا کریں

بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم

اور کہنہ و فرسودہ میکدوں کو بنیاد سے اکھیڑ پھینکیں!

ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم

آ کہ چمن کے ڈاکوؤں سے خونِ لالہ کا انتقام لیں

بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

اور محفلِ غنچہ و گل کی بنیاد کسی نئے انداز پہ رکھیں

بہ طوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ہم پروانے کی طرح شمع کے طواف میں کب تک زندگی بسر کریں گے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے (پیامِ مشرق)
اور اپنی ذات سے غافل و بیگانہ رہ کر کب تک سانس شمار کریں گے

جہانِ تست در دستِ خسے چند
پروردگار! تیری دنیا چند ذلیل و خسیس لوگوں کے ہاتھ میں ہے
کسانِ او بہ بندِ ناکسے چند
اور اس کے معقول و برگزیدہ لوگ نااہلوں سے وابستہ ہو رہے ہیں
ہنرور درمیانِ کارگاہاں
کارخانوں میں ایک ماہر و ہنرمند مزدور
کُشد خود را بہ عیشِ کرگسے چند (پیامِ مشرق)
خود کو چند گدھوں کے عیش و عشرت کے لئے ہلاک کرتا ہے

شانِ دہقان

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو!
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے؟
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو!
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا؟
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو!

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو!
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو!
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا؟ کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو!
بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے (بانگِ درا)

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی ۱؎ نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

۱؎ آقائی۔ مراد سرمایہ داری

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک؟
نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک؟
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک؟
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک؟

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو (بانگِ درا)

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار

جویریہ

حکم حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی[1]
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں!
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں!
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے! (بانگِ درا)

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا (بانگِ درا)

---

[1] انسان کو صرف وہی کچھ ملے گا جس کے لئے وہ محنت و مشقت کرے۔

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!
یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لیئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیّت کی فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات!
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات! (بالِ جبریل)

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے[1]
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو (بالِ جبریل)

گدائی

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اُسے زریں قبا؟
اُس کے آبِ لالہ گوں[2] کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

---

[1] اس مصرعہ کے آخر میں یہ الفاظ محذوف ہیں "فریب می دہند" اور اب ترجمہ یہ ہوگا کہ شیخ و برہمن خدا کو سجدوں سے اور بتوں کو طواف سے دھوکا دے رہے ہیں۔ لہٰذا اس سے تو بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو۔

[2] مراد شراب

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا (بالِ جبریل)

الارض للہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری بھی نہیں! (بالِ جبریل)

فلک نے اُن کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے! (بالِ جبریل)

گیا دورِ سرمایہ داری گیا

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر، آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین[1]

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن[2] ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے

یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے (ارمغانِ حجاز)

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا

دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ (ارمغانِ حجاز)

---

[1] یہ نکتہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت کے تحت ہر مسلمان مال و دولت یا زمین کا "امین" تو ضرور ہے: "مالک" ہرگز نہیں۔

بندۂ مومن امیں حق مالک است　　　غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

[2] مومن ہونے کا مدعی ہونا اور پھر محرومِ یقین رہنا کس قدر متضاد اور حیرت انگیز صورتِ حال ہے۔ بہرکیف ابلیس کا یہ طنز بالکل بجا اور مبنی بر حقیقت ہے۔ اسی بنا پر ایک اور جگہ فرمایا:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام　　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ امت روایات میں کھو گئی

تمام مندرجہ بالا مثالوں میں آپ نے کوئی چیز حقیقت و صداقت کے خلاف بھی دیکھی؟ کیا کہیں مبالغہ اور غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہے؟ عہدِ حاضر میں سرمایہ و محنت کی پیدا شدہ صورتِ حال پر تنقید کرکے ہیں علامہ اقبال کہیں بد دیانت یا ناجائز طور پر جانبدار بھی ہوئے ہیں؟ — اسلامی تعلیمات، اصولِ معاشرت اور اخلاقِ عامہ کی رو سے دنیا کے مظلوم و مقہور اور نادار و خراب حال لوگوں کی قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر ہر اس شخص کا دل بے چین و دردمند ہوگا جو اپنے مزاج میں انسانیت کی ذرہ برابر رمق بھی رکھتا ہے۔[1] پس اقبال بھی ایک رفیق القلب ہمدردِ نوعِ انسانی ہونے کے لحاظ سے مظلوم اور نادار و بیکس لوگوں کا مخلص و بے ریا دوست تھا۔ جب اس نے سرمایہ دار طبقے کے گوناگوں مظالم اور مزدور و مزارع کی غیر متناہی حق تلفیاں دیکھیں تو اس کے سازِ دل سے بے اختیار کچھ دردناک اور پرسوز نغمے اٹھے جو اس نے منصفانہ نظر سے موزوں الفاظ میں قلبند کر دیئے۔ اور پھر موجودہ اقتصادی مصائب کو رفع کرنے کا ایک فطری اور قابلِ عمل دستور بھی ہمیں بتاتا چلا گیا۔

"سرمایہ و محنت" کے متعلق آپ نے علامہ مرحوم کا تمام مندرجہ بالا کلام ملاحظہ

---

[1] جو شخص مظلوم اور مصیبت زدہ انسانیت کے دکھ درد سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ اسے رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تو سراسر "صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ" (گونگا، بہرا اور اندھا) کا مصداق ہے۔ پتھر سے زیادہ بے حس ہے اور اسے "آدمی" کہنا بھی آدمیت کی بدترین توہین ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی (سعدیؒ)

فرما کر اسلامی نقطۂ نظر سے ہر قسم کے طبقاتی تصادم کو رفع کرنے اور معاشی توازن کو برقرار رکھنے کا بنیادی اور مرکزی نقطہ کیا سمجھا؟ وہ بہرحال یہ ہے کہ :-

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس

دنیا میں کوئی شخص کسی کا محتاج نہ ہو

نکتۂ شرعِ مُبیں این است و بس!

بس شریعت اسلامیہ کا معاشی نکتہ ہے تو یہ ہے

اور اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں انسان انسان کی محتاجی سے کب اور کس صورت میں بے نیاز ہو سکتا ہے؟ ــــ صرف اس صورت میں کہ مفہوم "العفو" کے تحت تمام لوگ "اصولِ کفاف" پر عمل پیرا ہوں، ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی اور ہوسِ زر سے دست بردار ہو جائیں اور اس چیز کو ہمیشہ کے لئے اپنا معاشرتی نصب العین بنالیں کہ ع

"ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ"

یعنی "تیرے پاس اشد ضروریاتِ زندگی کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ قوم کے مستحق لوگوں کو دے دے!"

آپ ہی فرمائیں کہ اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے بعد بھی قوم میں کوئی معاشی و اقتصادی کش مکش جاری رہ سکتی ہے؟ سرمایہ داروں اور مزدوروں میں تصادم و اختلاف رونما ہو سکتا ہے؟ ہڑتالیں اور فساد انگیز تحریکیں جاری رہ سکتی ہیں؟ اور معاشرہ کا سب سے زیادہ اہم اور قیمتی حق یعنی امن و اطمینان اس بری طرح سے برباد ہو سکتا ہے جس طرح آج چار دانگِ عالم میں برباد ہو رہا ہے؟

باقی رہا یہ سوال کہ "العفو" کی رو سے انسان کو "ضرورت" کس قدر مال کی ہے؟ اور پھر "ضرورت" کا صحیح و منصفانہ معیار کیا ہے؟ تاکہ یہ اندازہ کر لینے کے بعد زائد از ضرورت مال و زر خلقِ خدا کی فلاح و بہبود میں صرف کیا جا سکے۔ تو اس سوال کا سادہ و واضح جواب یہ ہے

کہ (۱) آپ پوری فراخدلی سے اعلیٰ اور مقوی غذا کھا سکتے ہیں لیکن اس میں ایک کی بجائے بہت سے مکلف کھانے نہ ہوں کیونکہ یہ "اسراف (فضول خرچی) کے تحت آجائیں گے (۲) آپ عمدہ لباس پہن سکتے ہیں۔ لیکن یہ لباس سادہ ہو۔ اس میں کوئی ریشمی کپڑا نہ ہو اور بیک وقت چار پانچ جوڑوں سے کسی صورت میں زیادہ نہ ہو۔ ورنہ یہ چیز بھی "اسراف" کی زد میں آجائے گی۔ (۳) آپ اچھی اور صاف ستھری رہائش بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور توفیق ہو تو ذاتی مکان بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ "مکان" یا "بنگلہ" ایسا نہ ہو جس پر "قصر شاہی" کا دھوکا ہو اور جس کا بیشتر حصہ اکثر خالی پڑا رہے، ورنہ یہ بھی بدترین اسراف ہوگا (۴) آپ اپنے بچوں کے سنِ بلوغ اور برسرِ روزگار ہونے تک ان کی تکمیل تعلیم، ہنر آموزی، اور شادی وغیرہ کے اخراجات کے لئے بھی روپیہ محفوظ کر سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ان اخراجات میں بھی پابندی رسم و رواج، نمود و نمائش اور فضول خرچی[1] کا کوئی شائبہ نہ ہو، ورنہ یہ بھی اسراف ہو جائے گا۔

قرآن و حدیث میں "اسراف" کی شدید مذمت آئی ہے حتیٰ کہ مسرف کو "شیطان کا بھائی" قرار دیا گیا ہے۔ پس جب زندگی کے مندرجہ بالا تقاضوں (خوراک، لباس، مکان،

---

[1] ایسی فضول خرچی کی مثال یہ ہے کہ دیگر ممالک میں لڑکوں کو تعلیم دلانے کے لئے ان پر لاکھوں روپے صرف کر دیئے اور مناسب ضروریات سے بہت زیادہ صرف کر دیئے، حالانکہ تمام عمر میں ان اخراجات کی واپسی (Return) بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ مزید فائدہ تو درکنار۔ اسی طرح پیروی رسم و رواج اور نمود و نمائش کے تحت شادیوں کی فضول خرچیاں تو ایک زمانہ جانتا ہے۔ بہرکیف، لڑکوں کی تعلیم ہو یا شادیاں، ان پر اقبال کا یہ شعر بجا طور پر صادق آتا ہے:

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں — جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں!

تعلیم و کتخدائیِ اولاد — اور ان کے علاوہ کوئی اور ضرورت ہے ہی نہیں) کو اس انداز میں بجالایا جائے کہ ان میں "اسراف" کی جھلک نہ ہو تو لبعد ازاں جو کچھ اور جتنا کچھ مال بچے گا وہ "العفو" (زائد از ضرورت) ہے اور اللہ تعالےٰ کا منشا یہ ہے کہ آپ اسے قوم کے مستحق لوگوں پر صرف کر دیں۔ جب بحیثیت انسان آپ بذاتِ خود اچھی خوراک، اچھے لباس، اچھے مکان اور عمدہ معیارِ زندگی کے مستحق ہیں، تو آپ ہی کا دوسرا بھائی (جو فرزندِ آدم و حوّا ہونے کے لحاظ سے یقیناً آپ کا بھائی ہے) معاشی سکون و اطمینان اور فارغ البالی کا کیوں مستحق نہیں؟ اور پھر خاص طور پر "مسلمان" اور ہم قوم و ہم مذہب ہونے کے لحاظ سے تو وہ آپ کی امداد و ہمدردی کا زیادہ مستحق ہے۔ کیونکہ یہاں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ[1] کا فطری اور ازلی رشتہ بھی موجود ہے!

پس جب "العفو" (ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ) پر دیانتداری سے عمل ہوگا تو آپ کا روپیہ نہ صرف قوم کے محتاج و پس ماندہ لوگوں کی ترقّی و خوش حالی کا باعث ہوگا بلکہ تعلیمی و صنعتی اداروں، رفاہِ عامہ کے کاموں اور حکومت کے بیت المال میں بھی پہنچے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی قومی استعدادِ علم و تجربہ، فنی مہارت، صنعت و حرفت اور قوّتِ دفاع کو بے حد تقویت پہنچے گی، اور یہی ہے ملّی اور اجتماعی ترقی کا بنیادی اُصول۔ جس قوم کے افراد اس اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور قومی مفاد کو اپنے انفرادی مفاد پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں، وہ مجموعی طور پر ایک ایسی توانا اور ناقابلِ تسخیر قوم پیدا کرتے ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت مضمحل نہیں کر سکتی۔ کیا آپ "العفو" پر عمل پیرا ہو کر ایسی قوم بننے کی کوشش کریں گے؟

---

[1] تمام مسلمان (روزِ ازل ہی سے) آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "العفو" پر عمل پیرا ہونا اور تمام "زائد از ضرورت" مال قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دینا طبیعت پر بہت شاق گذرتا ہے اور اکثر لوگوں کی ہمّت و جرأت اس بذل و سخا کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی تو غور فرمائیے کہ تمام قوم کی اجتماعی ترقّی و فارغ البالی اور قوّت و توانائی کے بغیر آپ بھی بحیثیتِ فرد بالکل صفر (کالعدم) ہو کر رہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں آپ کی ہستی کوئی ہستی ہی نہیں، اور آپ کے مقاصد کوئی مقاصد ہی نہیں۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں! (اقبال)

پس ذاتی ترقّی و خوشحالی اور حفظِ حقوقِ حیات کے لئے بھی آپ کو تمام قوم کے اقتصادی اور معاشی مصالح و مفادات میں پوری فراخدلی سے حصّہ لینا ہی ہوگا۔

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ (اقبال)

اور سوال یہ ہے کہ مال و زر کے بڑے سے بڑے ذخیرے دنیا سے رخصت ہوتے وقت کوئی اپنے ساتھ بھی باندھ کر لے گیا ہے؟ — اور اگر وہ مال مزدور و مزارع اور عوام النّاس کے حقوق کی ادائیگی میں بر وقت صرف نہ ہوا تو حسب آیۂ قرآنی آخری لمحات میں یہی فریاد کی جائے گی کہ کاش! مجھے کچھ اور مہلت مل جاتی تاکہ میں یہ دولت مستحقینِ قوم میں تقسیم کر کے کچھ توشۂ عقبیٰ جمع کر لیتا۔ لیکن اس وقت مہلت کون دیتا ہے؟ —

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ	اے مسلمانو! تمہارے مال و زر اور اولاد تمہیں
أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ	اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو لوگ ایسا

ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَ
اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ
رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ
قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ
مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ
اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ
وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(پ ۲۸ : ۱۴ع)

کریں گے (حبِ مال واولاد میں خدا کو بھول
جائیں گے) وہ سراسر نقصان اٹھائیں گے اور
جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے (راہ
خدا) خرچ کرو، پیشتر اس سے کہ تم پر موت آ
وارد ہو۔ اس وقت تم کہنے لگو گے کہ پروردگارا
اگر تو ہمیں تھوڑی سی اور مہلت دیتا تو ہم (اپنے
مال کا) صدقہ وخیرات کر کے تیرے نیک بندوں
میں شریک ہو جاتے۔ حالانکہ جب کسی کی ساعت
موت آن پہنچے تو اللہ اسے ہرگز مہلت نہیں
دیا کرتا اور اللہ کو تمہارے (سب) کاموں کا
علم ہے (کہ تم مہلت پا کر بھی کیا کچھ کیا کرتے
ہو)۔

اقبالؒ کا درسِ حُرّیت

بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

(اقبالؔ)

اقبالؒ کا درسِ حرّیت

چونکہ جذبۂ حرّیت مومن کے خمیر میں ہے اور اس کا فطری و پیدائشی حق بھی بالخصوص اسی کو مرحمت کیا گیا ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ مفہومِ حرّیت، عظمتِ حرّیت اور مفاداتِ حرّیت کی وضاحت میں وقف ہو رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو روزِ ازل سے جو عقائد و اصول اور جذبات و احساساتِ مقدسہ عطا کئے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر "آزادی" ان کا فطری حق ہے جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے۔ بالفاظِ دیگر "مسلمان" اور "غلامی" اجتماع الضدّین کا حکم رکھتے ہیں جو کسی طرح ممکن ہی نہیں جس طرح آگ اور پانی، نور اور ظلمت، رات اور دن، حق اور باطل، خیر اور شر، تقویٰ اور فسق، توحید اور شرک، سچ اور جھوٹ، عدل اور ظلم، نیکی اور بدی، اخلاص و نفاق، محبت اور نفرت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بعین اسی طرح "مومن" اور "غلامی" کا اجتماع بھی ایک امرِ محال ہے۔ ذرا غور و فکر کو کام میں لائیے تو "مومن" ہی کا دوسرا نام "انسان" ہے جو "انسان" نہیں اسے "مومن" کہنا انتہائی حماقت ہے۔ بالفاظِ دیگر انسانی نسل اور انسانی شکل و ہیئت میں پیدا ہو کر بھی "مومن" نہ ہونا مقامِ

انسانیت کی بدترین تذلیل و تحقیر ہے۔ پس صحیح انسانی صفات و اخلاق کا مجموعہ ہی "مومن" کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسب آیاتِ قرآنی اللہ تعالیٰ کا "خلیفہ" یا "نائب" اپنے ہم جنسوں یا اپنے سے بدتر لوگوں کی غلامی و محکومی میں زندگی بسر کیوں کرے؟ کیا "اشرف المخلوقات" کا مرتبہ و مقام یہی ہے کہ وہ بہائم کی مانند چند ظالم و مستبد لوگوں کے جوئے تلے اپنی گردن کو خمی کرتا رہے؟ کیا امانت دارِ دستورِ الٰہی ایک غلامِ ہوا و ہوس گروہ کے خود ساختہ چنگیزی قوانین کا پابند ہو؟ کیا وہ خلاصۂ کائنات ہستی جو صوری اور معنوی ہر دو لحاظ سے "احسنِ تقویم[1]" کا مقام بلند رکھتی ہے، ایک مجمعِ شیاطین کی قربان گاہِ اغراض پر خود کو بھینٹ چڑھا کر "اسفل سافلین" کے قعرِ ذلت میں جا پڑے؟ — نہیں نہیں بلکہ وہ "مومن" یا وہ "انسان کامل" جس نے کارزارِ حیات کے تمام خطرات و خدشات اور مصائب و حوادث سے بے نیاز و بے خوف رہ کر عین اس وقت امانتِ[2] الٰہی کو اٹھایا جبکہ کائنات کی دیگر اشیا تو درکنار آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں جیسی جسیم و مہیب چیزوں نے بھی اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی عملی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو گئی تھیں، مومن فطری اور روایتی طور پر یہ منصب و مقام رکھتا ہے کہ اپنے دستورِ زندگی اور حقوقِ زندگی کا مکمل

---

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝

"ہم نے انسان کو ظاہری و باطنی جسمانی و روحانی ہر دو لحاظ سے بہترین شکل و ہیئت میں پیدا کیا لیکن صحیح صفاتِ انسانی کھو دینے پر ہم اسے پست ترین گڑھوں میں گرا دیتے ہیں۔"

[2] تلمیح بآیہ شریفہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ الخ (پ ۲۲ ع ۶)

اس آیت میں امانت سے مراد ہے دستورِ شریعت، احکامِ الٰہی۔

طور پر مختار و مجاز ہو۔ تو انسانی کی وہ ناظم و مدبر ہستی جو آغازِ آفرینش ہی میں مسجودِ ملائکہ رہ چکی ہے اور جس کی خدمت و اطاعت کے لئے بر و بحر کی مخلوقات تو در کنار شمس و قمر تک مسخر کر دیئے گئے ہیں، کم از کم اتنا حق تو رکھتی ہے کہ وہ قدرت کے سمجھائے ہوئے سیدھے سادے قوانینِ حیات کے مطابق ایک آزاد و مختار زندگی بسر کرے اور کسی دوسرے ملک کے بری یا بحری ڈاکو اس کے سکون و اطمینان میں خلل انداز نہ ہوں!

مجھے "بحری ڈاکو" کی ترکیب سے معاً علامہ اقبال کی وہ نظم یاد آگئی جس کا عنوان "ایک بحری قزاق اور سکندر" واقع ہوا ہے، اور جو جبر و استبداد اور ہوسِ ملک گیری کی شدید مذمت کرتی ہے، ملاحظہ ہو:-

سکندر

حلقہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی!

قزاق

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی!

الغرض اس نوع کے تمام جابر و مستبد ڈاکو غیر اقوام کو تعلیم، تہذیب، تمدن اور اخلاقِ جدید سکھانے یا "تجارتی تعلقات" استوار کرنے کے بہانے سے ان کے حقوق

زندگی پر چھاپہ مارتے چلے آتے ہیں۔ نوعِ انسانی کے کسی بھی گروہ یا کسی بھی قوم پر "غلامی" کی لعنت مسلط ہی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی اور قوم "جوع الارض" یا "ہوسِ نو آبادیات" یا "فروغِ تجارت" کی آرزو سے بیتاب ہو کر اٹھتی ہے اور مختلف حیلہ سازیوں سے اولادِ آدم کے فطری حقِ آزادی کو غصب کر لیا ہے۔ الغرض دیگر ممالک و اقوام پر آمرانہ اور جابرانہ اقدام کرنے والوں نے اپنے چنگیزی طریقِ عمل کے لئے ہمیشہ "خدمتِ نوعِ انسانی" کا عذرِ حسین اختیار کیا ہے، مگر ان کی چشمِ حرص و آز کا حقیقی مطمحِ نظر حکومت و اقتدار، جلبِ زر اور اپنی قومی صنعت و تجارت کو فروغ دینا رہا ہے۔

رونقِ محفل کی خاطر آئے دل لے کر گئے
اُن کا مطلب حل ہوا، مجھ پر بھی احسان ہو گیا

پس یہی وہ آمر و جابر اور "شہنشاہ" لوگ ہیں جن کے مشترک کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً	جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، تو اسے تہس نہس اور زیر و زبر کر دیتے ہیں اور وہاں کے معزز باشندوں کو بھی ذلیل و خراب حال۔
(پ ۱۹ : ۱۸ ع)	

یہ "ملوک" بسے بسائے شہروں کی اینٹ سے اینٹ کیوں بجا دیا کرتے ہیں؟ اور وہاں کے باشندوں کو اپنے ظالمانہ و جابرانہ اقدامات سے ذلیل و خراب حال کیوں کرتے ہیں؟ — جواب نہایت سادہ و واضح ہے کہ وہ اپنی دنیوی اغراض کی تحصیل و تسخیر کے لئے نہ تو عالیشان عمارتوں کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، اور نہ کسی کی عزت و آبرو کو۔ ان کا حقیقی نصب العین یہ ہے کہ وہ غالب و فاتح کہلائیں، اپنے "نشۂ قوت" کی خاطر خواہ تسکین کریں اور تاریخ میں زیادہ سے زیادہ اوراق پائیں، خواہ ان اوراق کی سطور

معصوم و مظلوم انسانیت کے خونِ ناحق ہی سے کیوں نہ لکھی جائیں۔
علامہ اقبال اسی کردارِ ملوک کی تعیین و توضیح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلُوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے!
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

امی گفتار یہ اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

بہرکیف یہ مشاہدہ میں آئی ہوئی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام جابر و مستبد حکومتوں کا وقتی اقتدار ایک "جادوگری" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جو اپنی تھوڑی سی میعاد پوری کر کے متزلزل ہونے لگتا ہے اور جمہور کی ایک ہی ضربِ کاری سے منہدم ہو جاتا ہے۔
تاریخِ عالم میں فرعون اور آلِ فرعون سے زیادہ صاحبِ جاہ و حشم، جابر و مستبد اور محکم و توانا اور کون ہوگا؟ لیکن کیا "خونِ اسرائیل" کے جوش میں آجانے پر اس کا وہ خدائی نظام اپنی کھوکھلی بنیاد پر قائم رہ سکا جو "اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی" کا اعلان کیا کرتا تھا؟ کیا ان رومنوں کی عظمت و سطوت ایک فسانۂ عبرت نہیں بن چکی جو خونخوار شیروں کو بلیاں سمجھتے ہوئے ان سے بازیٔ طفلانہ کیا کرتے تھے؟ کیا انقلابِ فرانس غلامی کی بیخ کنی اور آزادیٔ جمہور کی روشن شہادت نہیں ہے؟ کیا انقلابِ روس شاہانہ جبر و تشدد اور آمرانہ طرزِ حکومت کی انتہائی تذلیل و تحقیر نہیں؟ کیا تاریخ میں جمہور نے ظلم و تشدد کے اس سے زیادہ خوفناک انتقام بھی لئے ہیں؟ الغرض کیا فطرتِ انسانی نے ہمیشہ جبر و استبداد کے خلاف کھلی بغاوت کرتے ہوئے راہ و رسمِ غلامی کی بیخ کنی نہیں کی؟

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اکثر جگہ شہنشاہیت، آمریت اور جبر و استبداد کی شدید مذمت کرتے ہوئے جمہور کو بار بار آزادی و حریت، حقوقِ خود اختیاری اور خود جہاد کی تلقین کی ہے اور سوال تو یہ ہے کہ اسلامی جہاد کی بھی حقیقی غرض و غایت کیا ہے؟ یہی کہ انسانیت کو ظلم و تشدد، جبر و استبداد اور لعنتِ آمریت سے نجات دلا

کہ اس کے غصب شدہ حقوق اسے دوبارہ دلائے جائیں۔ جہاد کا مقصدِ اعلیٰ یہ ہے کہ فرعون جیسے مخلوقِ خداوندوں کو پاش پاش کر کے مظلوم و گمراہ بندوں کو ربِّ واحد کے آستانۂ جلال پر جھکایا جائے، جہاں غلامی کی تمام زنجیریں آناً فاناً از خود کٹ کر پراگندہ ہو جاتی ہیں، جہاں کا نصب العین یہ ہے کہ مخلوق کی خود ساختہ اور معمودِ ہوا و ہوسِ حاکمیت کو یکسر فنا کر کے اس احکم الحاکمین کی حاکمیتِ مطلقہ وابدیہ کو محکم و استوار کیا جائے۔ جو اپنے کسی ایک بندے کے لئے بھی اس جیسے بندے کی غلامی و محکومی گوارا نہیں رکھتا۔ الغرض جہاد نوعِ انسانی کو "غلامی" کے خبائث و معائب سے بچا کر اسے "حرّیت" کا فطری و دوامی حق دوبارہ عطا کرتا ہے۔ بنا بریں "جہاد" اولادِ آدم پر عظیم ترین احسان ہے، اس کی مقدس ترین خدمت ہے!

چونکہ جہاد دنیا کے ہر خطے میں جبر و استبداد اور فتنہ و فساد کا بیباک اور کامیاب مقابلہ کرتا ہے، لہٰذا کلام اللہ میں بھی اس کی یہی توجیہہ کی گئی:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(پ ۲: ۱۷ ع)

"اور اگر اللہ بعض (موحد و صالح) بندوں کے ہاتھوں بعض (مشرک و مفسد اور جابر و مستبد) لوگوں کو (جہاد کے ذریعے) رفع و دفع نہ کرتا رہے تو اس کی زمین (غلامی کے) فتنہ و فساد سے ۔ ہو جائے۔ بلکہ اللہ تو (مفسد عناصر کو فنا کر کے) دنیا والوں پر رحم و کرم فرماتا رہتا ہے۔"

پس آپ خود ہی قیاس فرمائیں کہ اقبال کا وہ "مردِ مومن" جو فطرتاً مجاہد و غازی

واقع ہوا ہے، جو ربِ واحد کی حکومت وسیادت کے علاوہ کسی اور کی حکومت وسیادت کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، اور جو روزِ ازل ہی "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے جواب میں "بلیٰ" کہہ کر اپنے پیمانِ وفا کو تا قیامت پختہ کر چکا ہے، غیر اللہ کی غلامی و محکومی کو کیونکر برداشت کرے گا؛ لہٰذا آپ آغازِ مضمون کے ان الفاظ کو ایک مرتبہ پھر زیرِ غور لائیں کہ "مومن اور غلامی اجتماع الضدّین کا حکم رکھتے ہیں۔ جہاں ایمان ہے وہاں غلامی کی کوئی گنجائش نہیں اور جہاں غلامی موجود ہے، وہاں ایمان کو مفقود سمجھنا چاہئیے"

اس بحث و نظر سے نتیجہ یہ نکلا کہ مخلوق خداوندوں کی غلامی سے ایک بے باک اور بے دھڑک بغاوت کا دوسرا نام ہے "جہاد" اور اس لئے حسب شریعت ہر غلام خطہ مسلمان کے لئے "دار الحرب" ہے، جہاں خدا کی طرف سے اس پر یہ چیز فرض کر دی گئی کہ وہ ہر ممکن قربانی سے جابر و مستبد لوگوں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے مخلوق کی غلامی سے نجات پائے اور صرف خالقِ برحق کی غلامی اختیار کرتے ہوئے اپنی انفرادی و اجتماعی آزادی کے فطری حق کو دوبارہ حاصل کرے:-

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری! اقبالؔ

الغرض مخلوق کی غلامی ایک مصنوعی اور خود ساختہ "غلامی" ہے اور خالق کی غلامی ایک قدرتی، فطری اور غیر مصنوعی غلامی۔ مخلوق کی غلامی کا حاصل و نتیجہ یہ ہے کہ محکوموں سے نہ صرف ان کے تمدنی، اقتصادی اور معاشرتی حقوق چھین لئے جاتے ہیں، بلکہ ان کی آزادیٔ کردار[1] بالکل مقید و محدود، ان کی حریتِ گفتار زائل، ان کی جولانیٔ افکار تباہ، ان کی روح مردہ اور جذبات و احساسات افسردہ کر دیئے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے صرف خالق

---

[1] آزادیٔ کردار سے مراد ہے تحصیلِ آزادی کے لئے جد و جہد، دستورِ حق کے قیام و استحکام کی کوشش!

کائنات کی غلامی (طاعتِ کاملہ) کا حاصل وثمر یہ ہے کہ وہ ہر فرد و ملت کو زندگی کے مکمل حقوق عطا کرتی ہے اور مخلوقات کی ہر ممکن غلامی کو فنا کرکے آزادیٔ کامل کی مسرتِ جاوداں عطا کرتی ہے۔ یہ غلامی دل و دماغ کو ضعیف و تاریک نہیں کرتی بلکہ انہیں محکم و روشن کرکے گفتار و کردار میں بے باکی، قوت و توانائی، سوز و اثر اور روحِ اخلاص پیدا کرتی ہے اور اس طرح خدائے واحد کے غلام نہ صرف خود انسانوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، بلکہ دیگر غلام و پس ماندہ اقوام کو بھی اپنے فیوضِ گفتار و کردار سے انسانیت کے مقامِ اعلےٰ تک پہنچا دیتے ہیں۔
بطورِ مثال کیا صحابہ کرامؓ نے صرف غلامِ حق بن کر روم و شام و مصر و ایران وغیرہ کی غلام باطل مجبورِ آمریت و شہنشاہیت، اور مقہورِ جور و استبداد اقوام کو غلامی و محکومی کی لعنت سے نجات نہیں دلائی تھی؟ اور پھر انہیں فطری آزادی کی بے پایاں نعمتوں سے مالا مال نہیں کیا تھا؟ الغرض:۔

مردِ مومن ہے جہاں میں ربِّ واحد کا غلام
اِس غلامی سے وہ بن جاتا ہے دنیا کا امام!

درسِ حریت کلامِ اقبال میں

غور سے دیکھئے تو کلامِ اقبال کا بنیادی عنصر ہی حریتِ گفتار و کردار ہے اور ان چیزوں کی تعمیل ممکن ہی تا وقتیکہ ایک قوم کو آزادیٔ کامل نصیب نہ ہو، چنانچہ علامہ اقبال جہاں حریت (آزادی) کے محاسن و محامد کا تذکرہ فرماتے ہیں، وہاں ساتھ ہی ساتھ "مردِ حر" (آزاد شخص) کی روحانی و عملی ممکنات پر بھی روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ آزادی اور غلامی کا مقابلہ و موازنہ کرنے کے لئے "حُر" (آزاد) کے پہلو بہ پہلو "عبد" (غلام) کی اقتصادی اور عملی پستیوں کا اندازہ بھی کراتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ مندرجہ ذیل مثالوں میں ان چیزوں کے شواہد ملاحظہ ہوں:۔

امتیازِ عبد و حُر

نکتہ می گویمت روشن چو دُر — تا شناسی امتیازِ عبد و حُر

میں تجھے ایک موتی جیسا روشن نکتہ بتاتا ہوں — تا کہ تو آزاد اور غلام کے درمیان فرق سمجھ سکے

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار — در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار

غلام تو رات دن کے چکر میں بیکار ہو کر رہ جاتا ہے — مگر آزاد کی وسعتِ دل میں زمانہ خود نابود ہو جاتا ہے

عبد از ایام می بافد کفن — روز و شب را می تند بر خویشتن

غلام دنوں ہی سے اپنے لیے کفن بنتا رہتا ہے — اور رات دن کو مثلِ کفن خود پر تان لیتا ہے

مردِ حر خود را ز گل بر می کند — خویش را بر روزگاراں می تند

لیکن مردِ آزاد خود کو مٹی سے بلند تر اٹھاتا ہے — اور پھر اپنی قوتِ تسخیر سے زمانے پر چھا جاتا ہے

عبد چوں طائر بدامِ صبح و شام — لذتِ پرواز بر جانش حرام

غلام صبح و شام کے جال میں پرندے کی طرح ہے بند — اور اس کی روح پر لذتِ پرواز حرام ہے

سینۂ آزادۂ چابک نفس — طائرِ ایام را گردد قفس

اور مردِ آزاد کا تیز سانس والا سینہ — طائرِ ایام کو پنجرے کی طرح قید کر لیتا ہے

عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است — وارداتِ جانِ او بے ندرت است

غلام کے لیے فطرت ایک فضول و لاحاصل چیز ہے — اور اس کی کیفیاتِ روح جدت و ندرت سے خالی ہیں

از گراں خیزی مقامِ او ہماں — نالہ ہائے صبح و شامِ او ہماں

نہ اٹھ سکنے کی وجہ سے اس کی جگہ بدلتی ہی نہیں — اور صبح و شام اس کی آہ و فریاد بھی وہی رہتی ہے

دمبدم نو آفرینی کارِ حُر — نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر

لیکن آزاد ہر لمحہ نئی چیزیں بناتا رہتا ہے — اور آزاد کا ساز ہمیشہ نئے نغمے برپا کرتا ہے

فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست — جادۂ او حلقۂ پرکار نیست

اس کی فطرت دہرانے (نقالی) کی تکلیف گوارا نہیں کرتی — اس کا راستہ حلقۂ پرکار نہیں کہ وہیں کا وہیں رہے

عبد را ایّام زنجیر است و بس — بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس

غلام کے لئے دن ایک زنجیرِ قید بن جاتے ہیں — اور اس کے ہونٹوں پر فقط شکوۂ تقدیر رہتا ہے

ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر — حادثات از دستِ او صورت پذیر

لیکن آزاد کی ہمت تقدیر کو بھی مشورے دیتی ہے — اور اس کے ہاتھ سے بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں

رفتہ و آئندہ در موجودِ او

ماضی اور مستقبل اس کے آئینۂ حال میں عکس ریز ہیں

دیر ہا آسودہ اندر زودِ او! (اسرارِ خودی)

اور تاخیریں اس کی جلدی میں جلوہ آرا ہیں

شانِ حُریّت

عشق را آرامِ جاں حرّیت است — ناقہ اش را ساربان حرّیت است

عشق کے لئے آرامِ روح صرف آزادی ہے — اور اس کی اونٹنی کا ساربان صرف آزادی ہے

آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد — عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد

کیا تو نے سنا ہے کہ میدانِ کارزار میں — عشق نے عقلِ ہوس پرست سے کیا سلوک کیا؟

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ — سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ

وہ امامِ عشاق فاطمہؓ کا بیٹا حسینؓ — جو گلستانِ رسول کا سروِ آزاد تھا

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

سبحان اللہ بسم اللہ کی باتو والدِ محترم تھا۔ — لیکن بیٹا ذبحِ عظیم کی مجسّم تفسیر

بہرِ آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل[1]

دنیا کی بہترین امت کے اس شہزادہ کے لئے — آنحضرتؐ کا کندھا بہترین اونٹ رہا

سُرخ رو عشقِ غیور از خونِ او — شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او

عشقِ غیرت مند اس کے خون سے معزز و باوقار ہے — اور مصرعِ عشق کی شوخی اسی کے مضمون سے ہے

درمیانِ امت آں کیواں جناب — ہمچو حرفِ قُل ھُو اللہ در کتاب[2]

اس عالی جناب کی ہستی امت میں وہی شان رکھتی ہے — جو سورۂ اخلاص قرآن مجید میں رکھتی ہے

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید

موسےٰؑ اور فرعون، حسینؓ اور یزید — حق و باطل کی یہ دو قوتیں زندگی سے رونما ہوتی رہتی ہیں

زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است

مگر حق ہمیشہ قوتِ حسینیؓ سے زندہ ہے — اور باطل آخرکار داغِ حسرت لے کر مر جاتا ہے

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت

جب خلافت نے قرآن سے تعلق منقطع کر لیا — تو گویا روحِ آزادی کے منہ میں زہر ٹپکا دیا

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم

بہترین امت کا وہ بہترین و برگزیدہ فرد — قبلے سے اٹھنے والے بادل کی طرح چاروں طرف چھا گیا

---

[1] حضرت حسینؓ اور حضرت حسنؓ بچپن میں اکثر آنحضرتؐ کے دوشِ مبارک پر سوار ہو جایا کرتے تھے۔ میر انیس نے اسی واقعہ کے پیشِ نظر رسول اکرمؐ کی زبانی ایک جگہ کیا خوب کہا ہے:۔

جب روٹھتے ہیں آپ تو مشکل سے منتے ہیں
لیجئے سوار ہو جئے ہم اونٹ بنتے ہیں

[2] سورۂ اخلاص کو اپنے مفہوم توحید کے لحاظ سے ثلث قرآن کا درجہ دیا گیا ہے۔

بر زمینِ کربلا بارید و رفت … لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
اور پھر زمینِ کربلا پر خوب برسا اور چلا گیا … جنگل میں لالہ زار بو دیئے اور خود چلا گیا

تا قیامت قطعِ استبداد کرد … موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد
اس نے قیامت تک کیلئے جبر و استبداد کو فنا کر دیا … اس کے خون کی ایک موج نے گلستان پیدا کر دیئے

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است ۱؎ … پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
وہ صرف قیامِ استحکامِ حق کے لئے شہید ہوا ہے … اور اس لئے اس کی ہستی توحید کی بنیاد ہو گئی

مدعایش سلطنت بودے اگر … خود نکردے با چنیں ساماں سفر
اگر اس کا مقصد و مدعا حکومت ہوتی … تو وہ اس بے سروسامانی میں سفر اختیار نہ کرتا

دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد ۲؎ … دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد
دشمن تو ریگِ صحرا کی طرح بے شمار تھے … لیکن اس کے دوست لفظِ یزداں کے ہم عدد تھے

سرِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود … یعنی آں اجمال را تفصیل بود
وہ سیرتِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا راز تھا … یعنی وہ اس اجمال کی تفصیل واضح ہوا تھا

عزمِ او چوں کوہساراں استوار … پایدار و تند سیر و کامگار
اس کا ارادہ پہاڑوں کی طرح مضبوط تھا … محکم تھا، تیز رفتار تھا اور کامیاب تھا

تیغ بہرِ عزّتِ دیں است و بس … مقصدِ او حفظِ آئیں است و بس
ثابت ہوا کہ تلوار تو صرف حفظِ عزتِ دین کے لئے ہے … اور اس کا مقصد آئینِ اسلامی کی نگہداشت ہے

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست … پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
مسلمان غیر اللہ کا غلام ہرگز نہیں ہو سکتا … اور اس کا سر فرعونوں کے سامنے کبھی نہیں جھک سکتا

۱؎ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ (خواجہ معین الدین چشتیؒ) ۲؎ ابجد کے حساب سے لفظ "یزداں" کے عدد بہتر بنتے ہیں اور میدانِ کربلا میں یہی تعداد تھی رفقائے حسین علیہ السلام کی!

خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد　　ملّتِ خوابیدہ را بیدار کرد

خونِ حسینؓ نے اسی راز کی تفسیر و تشریح کی ہے　　اور ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا ہے

تیغِ لَا چوں از میاں بیروں کشید ملہ　　از رگِ اربابِ باطل خوں کشید

جب اس نے اپنے میان سے تیغِ لَا کھینچی　　تو اہلِ باطل کی رگ سے خونِ فاسد کھینچ لیا

نقشِ الّا اللہ بر صحرا نوشت　　سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

اس نے سینۂ صحرا پر توحید کا نقش ثبت کیا　　اور گویا ہماری بخشش و نجات کی سطر لکھ دی

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم　　ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

ہم نے مفہومِ قرآن حقیقتاً حسینؓ سے سمجھا ہے　　اور اسی کی آگ سے دل میں شعلۂ توحید مشتعل کیا ہے

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت　　سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت

شام اور بغداد کی شان و شوکت فنا ہو گئی　　اور غرناطہ کی عظمت و سطوت بھی فراموش ہو گئی

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

لیکن ہمارا تار اس کے مضراب سے آج بھی مرتعش ہے　　اور اس کی تکبیر سے ایمان اب بھی تر و تازہ ہے

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں

اے صبا! اے دور افتادہ لوگوں کی قاصد

اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں　　(رموزِ بیخودی)

میرے آنسو اس کی خاکِ پاک تک تو پہنچا دے

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ　　زندگی او را حرام از بیمِ مرگ

غلام تو ہر لمحہ خوفِ موت سے مرتا رہتا ہے　　اور اس کے لئے زندگی خوفِ موت سے حرام ہو جاتی ہے

بندۂ آزاد را شانے دگر   مرگ او را می دہد جانے دگر
لیکن مردِ آزاد کی شان و شوکت ہی اور ہے   موت اسے ایک روحِ تازہ عطا کرتی ہے

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست   مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست
وہ تو عرفانِ نفس میں محو ہو کر موت کا خدشہ ہی نہیں رکھتا   کیونکہ آزاد لوگوں کی موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوا کرتی

مردِ حُر محکم زورد لا تخف[ﻪ]   ما بمیداں سر بجیب او سر بکف
مردِ آزاد لاتخف کے ورد سے توانا ہے   ہم میدانِ جہاد میں سر بجیب ہیں اور وہ سر بکف

مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر   می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
مردِ آزاد توحید سے روشندل ہے   اور وہ بادشاہ یا امیر کا غلام ہرگز نہیں بنتا

مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد   مردِ حُر بارے برد خارے خورد
مردِ آزاد اونٹوں کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے   مردِ آزاد کانٹے کھا کر بھی بڑے بڑے بوجھ اٹھاتا ہے

پائے خود را آنچناں محکم نہد   نبضِ رہ از سوزِ او بر می جہد
وہ زمیں پر اس مضبوطی سے پاؤں رکھتا ہے   کہ راستے کی نبض اس کے سوز سے اچھلنے لگتی ہے

جانِ او پائندہ تر گردد ز موت   بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت
اس کی روح موت سے اور بھی پائیدار ہو جاتی ہے   اور اس کی آوازِ تکبیر لفظ و صدا سے بے نیاز ہے

ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج   گیرد آں درویش از سلطاں خراج
جو شخص بھی راستے کے پتھر کو شیشہ سمجھ کر توڑ دے   وہی درویش بادشاہوں سے خراج وصول کر سکتا ہے

گرمیٔ طبعِ تو از صہبائے اوست   جوشِ تو پروردۂ دریائے اوست
تیری طبیعت کی حرارت اسی کی شراب سے ہے   تیری لہر نے اسی کے دریا سے جنم لیا ہے

ﻪ لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی آیہ "اہلِ باطل سے خوف نہ کھا۔ فتح تیری ہی ہو گی"

"سر بجیب" سوچ بچار میں ہونا۔

پادشاہاں در قبا ہائے حریر
زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

وہ بادشاہ جو ریشم کے لباس پہنے ہوئے ہیں
اس برہنہ تن فقیر کے خوف سے زرد رو رہتے ہیں

سِرّ دیں ما را خبر او را نظر
او درونِ خانہ ، ما بیرونِ در

دین کا راز ہمارے لئے تو صرف خبر ہے اور اس کا مشاہدہ
وہ تو گھر کے اندر ہے اور ہم بیرونِ در بیٹھے ہیں

ما کلیسا دوست ، ما مسجد فروش
او ز دستِ مصطفٰےؐ پیمانہ نوش

ہم کبھی تو کلیسا کے مرید ہیں اور کبھی مسجد فروش
مگر وہ دستِ رسولؐ سے پیمانۂ توحید نوش کئے ہوئے ہے

نے مغاں را بندہ نے ساغر بدست
ما تہی پیمانہ او مستِ الست

وہ نہ تو پیرِ مغاں کا غلام ہے اور نہ ہاتھ میں ساغرِ شراب لئے ہے
ہمارا پیمانۂ دل خالی ہے اور وہ شرابِ الست سے مست

چہرۂ گل از نمِ او احمر است
ز آتشِ ما دودِ او روشن تر است

پھول کا چہرہ اس کی طراوت سے سرخ ہے
ہماری آگ سے اس کا دھواں زیادہ روشن ہے

دارد اندر سینہ تکبیرِ اُمم
در جبینِ اوست تقدیرِ اُمم

وہ اپنے سینے میں قوموں کی تکبیر پوشیدہ کئے ہوئے ہے
اور اس کے ماتھے میں امتوں کی تقدیر منقوش ہے

قبلۂ ما گہ کلیسا گاہ دیر
او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ہمارا قبلہ کبھی تو کلیسا ہے اور کبھی بت خانہ
لیکن وہ غیر اللہ سے رزق کا خواہاں نہیں ہوتا

ما ہمہ عبدِ فرنگ ، او عبدہٗ
او نہ گنجد در جہانِ رنگ و بو

ہم سب فرنگی کے غلام ہیں ، مگر وہ خدا کا غلام
وہ اس جہانِ رنگ و بو میں سما ہی نہیں سکتا

صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ
آخرِ ما چیست ؟ تلخیہائے مرگ

ہمارے صبح و شام دنیوی ساز و سامان کی فکر میں بسر ہوتے ہیں
اور ہمارا انجام کیا ہے ؟ موت کی تلخیاں !

در جہانِ بے ثبات او را ثبات
مرگ او را از مقاماتِ حیات

اس دنیائے فانی میں غیر فانی صرف مردِ حُر ہے
موت بھی اس کے مراتبِ زندگی میں سے ایک مرتبہ ہے

اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل
گل ز فیضِ صحبتش دارائے دل

اہل دل لوگ ہماری مجلس سے افسردہ خاطر ہوتے ہیں
لیکن اس کی مجلس سے مٹی بھی صاحبِ دل ہوجاتی ہے

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن
او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ہمارے کام شکوک و شبہات سے معمور رہتے ہیں
لیکن وہ سراپا عمل ہے اور بولتا بہت کم ہے

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست
فقرِ او از لا الہ تیغے بدست

ہم فقراء کوچہ گرد اور فاقہ مست ہیں
لیکن اس کا فقر تیغِ توحید ہاتھ میں لیے ہوئے ہے

ما پرِ کاہے اسیرِ گرد باد
ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد

ہم گھاس کا تنکا ہیں اور ایک بگولے میں قید
لیکن اس کی ایک ضرب نے پہاڑ سے نہر جاری کر دی

محرمِ او شو زما بیگانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

تو اسی مردِ آزاد کا راز دار ہو اور ہم سے کنارہ کر
خانہ غلامی برباد کر اور دنیائے آزادی میں صاحبِ خانہ ہو

شکوہ کم کن از سپہرِ گرد گرد
زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد

مثلِ گردِ پراگندہ آسمان کا شکوہ مت کر
بلکہ اس زندہ مرد کی مجلس سے زندہ ہو جا

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

علمِ کتابی سے صحبتِ صالح بہت زیادہ مفید ہے
اور مردانِ آزاد کی صحبت انسان کو انسان بنا دیتی ہے

مردِ حُر دریائے ژرف و بیکراں
آب گیر از بحر و نے از ناوداں

مردِ آزاد ایک نہایت گہرا اور بے کنارہ دریا ہے
وہ اپنا پانی سمندر سے لیتا ہے نہ کہ پرنالوں سے

سینہ ایں مرد می جوشد چو دیگ
پیشِ او کوہِ گراں یک تودہ ریگ

اس مردِ آزاد کا سینہ دیگ کی طرح جوش کھاتا ہے
اس کے سامنے کوہِ گراں بھی ریت کا تودہ ہے

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن
ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن

روزِ امن وہ مجلس کی رونق و روح
ایسے ہے جیسے چمن میں بادِ بہار

روزِ کیں آں محرمِ تقدیرِ خویش — گورِ خود می کند از شمشیرِ خویش

لیکن روزِ جنگ وہ اپنی تقدیر کا راز دار — اپنی قبر اپنی ہی تلوار سے کھودتا ہے

اے بسرت گردم گریز از ما چو تیر — دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر

میں تیرے قربان، ہم سے تیر کی طرح بھاگ — اور اس کا دامن پکڑ اور بے تابی سے پکڑ

می نہ روید تخمِ دل از آب و گل — بے نگاہے از خداوندانِ دل

اس جسمِ آب و گل سے تخمِ دل ہرگز پیدا نہیں ہوتا — تاوقتیکہ اس پر صاحبِ دل لوگوں کی نظر نہ پڑے

اندریں عالم نیرزی با خسے

تو اس دنیا میں ایک تنکے کی قیمت بھی نہیں رکھتا

تا نہ بے ویزی بدامانِ کسے (پس چہ باید کرد)

جب تک کسی مردِ حر کے دامن کو نہ پکڑے

خبائث و مضراتِ غلامی

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بارِ تن

غلامی سے دل جسم میں مر جاتا ہے — اور غلامی سے روح تن کے لئے بوجھ ہو جاتی ہے

از غلامی ضعفِ پیری در شباب — از غلامی شیرِ غاب افگندہ ناب

غلامی سے جوانی میں بڑھاپے کا ضعف طاری ہو جاتا ہے — غلامی سے شیرِ جنگل کے بھی دانت جھڑ جاتے ہیں

از غلامی بزمِ ملت فرد فرد — این و آں با این و آں اندر نبرد

غلامی سے بزمِ ملت پراگندہ ہو جاتی ہے — اور سب ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں

آں یکے اندر سجود ایں در قیام — کاروبارش چوں صلوٰۃِ بے امام

کوئی تو سجدے میں دکھائی دیتا ہے اور کوئی کھڑا ہوا — اور قوم کی حالت ایک نمازِ بے امام کی سی ہوتی ہے

در فتد ہر فرد با فردے دگر — ہر زماں ہر فرد را دردے دگر
ہر فرد دوسرے فرد سے الجھا رہتا ہے — اور ہر فرد ہر لحظہ کسی نہ کسی دکھ میں مبتلا

از غلامی مردِ حق زنّار بند — از غلامی گوہرش ناارجمند
غلامی سے مردِ موحد بھی مشرک و کافر ہو جاتا ہے — اور غلامی سے اس کا ہیرا ایک جھوٹا ہیرا ثابت ہوتا ہے

شاخِ او بے مہرگاں عریاں ز برگ — نیست اندر جانِ او جز بیمِ مرگ
اس کی شاخ خزاں کے بغیر ہی پتوں سے برہنہ ہوتی ہے — اور اس کی روح میں خوفِ موت کے سوا کچھ نہیں

کور ذوق و نیش را دانستہ نوش — مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش
وہ کور ذوق ہو جاتا ہے اور زہر کو شہد سمجھتا ہے — وہ موت سے پہلے ہی مردہ ہے اور اپنی نعش کو کندھے پر لیے پھرتا ہے

آبروئے زندگی در باختہ — چوں خراں با کاہ و جو در ساختہ
وہ زندگی کی عزت و آبرو کھو دیتا ہے — اور گدھوں کی طرح گھاس پھوس پر قناعت کرتا ہے

ممکنش بنگر محالِ او نگر — رفت و بودِ ماہ و سالِ او نگر
تو اس کے ممکن کو دیکھ اور محال کو بھی — اور اس کے ماہ و سال کی آمد و رفت پر بھی نظر کر

روز ہا در ماتمِ یک دیگر اند
اس کے تمام دن ایک دوسرے کا ماتم کیا کرتے ہیں
در خرام از ریگِ ساعت کمتر اند
اور رفتار میں ریگ شیشۂ ساعت سے بھی سست ہیں

در غلامی تن ز جاں گردد تہی — از تنِ بے جاں چہ امیدِ بہی
غلامی میں جسم روح سے خالی ہو جاتا ہے — اور پھر جسمِ بے جان سے فائدے کی کیا توقع؟

ذوقِ ایجاد و نمود از دل رود — آدمی از خویشتن غافل رود
ایجاد و اظہار کا ذوق دل سے محو ہو جاتا ہے — اور انسان خود سے بھی غافل و جاہل رہتا ہے

جبرئیلے را اگر سازی غلام
اگر تو جبرئیل کو بھی غلام بنا دے
بر فتد از گنبدِ آئینہ فام
تو وہ فوراً آسمان سے زمین پر آگرے گا

کیشِ او تقلید، کارش آزری ست
غلام کا مذہب تقلید ہے اور مشغلہ بت سازی
ندرت اندر مذہبِ او کافری ست
جدت و ندرت اس کے مذہب میں کفر ہے

تازگیہا وہم و شک افزایدش
علم و فن کی تازگی اس کے شک میں اضافہ کرتی ہے
کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش
اور اسے کہنہ و بوسیدہ چیزیں ہی خوشگوار معلوم ہوتی ہیں

چشمِ او بر رفتہ، از آئندہ کور
اس کی آنکھ ہمیشہ ماضی پر رہتی ہے اور مستقبل سے اندھی
چوں مجاور رزقِ او از خاکِ گور
ایک مجاور کی طرح وہ اپنا رزق بھی خاکِ گور سے حاصل کرتا ہے

گر ہنر این است مرگِ آرزوست
اگر فن اس تقلید کا نام ہے تو وہ مرگِ آرزو ہے
اندرونش زشت و بیرونش نکوست
اس کا ظاہر خوبصورت ہے مگر باطن بے حد مکروہ

طائرِ دانا نمی گردد اسیر
ایک دانا پرندہ تو کبھی اسیر نہیں ہوتا
گرچہ باشد دامے از تارِ حریر
اگرچہ جال ریشم کے تاروں سے بنا ہوا ہو

شورہ بوم از نیشِ کژدم خار خار
ایک ایسا ویرانہ جو بچھوؤں کے ڈنک سے خار زار بن رہا ہو
مورِ او اژدر گزد عقرب شکار
اس کی چیونٹیاں اژدہا کو کاٹنے والی اور بچھو کو شکار کرنے والی ہوں

صرصرِ او آتشِ دوزخ نژاد
اس کی ہوا سے آتشِ دوزخ کے شعلے اٹھتے ہوں
زورقِ ابلیس را بادِ مراد
اور وہ ابلیس کی کشتی کے لئے سازگار ہوا ہو

آتشے اندر ہوا غلطیدۂ
وہ ایسی آگ ہو جس نے تمام فضا کو لپیٹ لیا ہو
شعلۂ در شعلۂ پیچیدۂ
اور اس کے شعلے دیگر شعلوں میں پیچیدہ ہوں

آتشے از دودِ پیچاں تلخ پوش | آتشے تندر نمود دریا خروش
وہ آگ جو پیچ کھاتے ہوئے دھوؤں سے تلخ پوش ہو | وہ آگ جو بجلی کی طرح کڑکے اور دریا کا شور پیدا کرے
در کنارش مارہا اندر ستیز | مارہا با کفچہ ہائے زہر ریز
وہ آگ جس کی آغوش میں سانپ ایک دوسرے سے لڑیں | وہ سانپ جو اپنے پھن سے زہر ٹپکائیں
شعلہ اش گیرندہ چوں کلب عقور | ہولناک و زندہ سوز و مردہ نور
وہ آگ جس کے شعلے باؤلے کتے کی طرح کاٹیں | وہ خوفناک ہوں زندوں کو جلائیں اور خود بے نور ہوں

در چنیں دشتِ بلا صد روزگار
یاد رکھو کہ ایسے دشتِ مصائب میں سینکڑوں زمانے
خوشتر از محکومیٔ یک دم شمار (زبورِ عجم)
محکومی و غلامی کے ایک سانس سے بدرجہا بہتر ہیں

مذہبِ غلاماں

در غلامی عشق و مذہب را فراق | انگبینِ زندگانی بد مذاق
غلامی میں عشق و مذہب کے درمیان جدائی ہوجاتی ہے | اور زندگی کا شہد بدمزہ معلوم ہوتا ہے
عاشقی ؟ توحید را بر دل زدن | وانگہے خود را بہر مشکل زدن
عاشقی کیا ہے ؟ توحید کو دل میں پیوست کرنا | اور پھر خود کو ہر مشکل مہم پر دے مارنا
در غلامی عشق جز گفتار نیست | کارِ ما گفتارِ ما را یار نیست
مگر غلامی میں عشق یاوہ گوئی کے سوا کچھ نہیں | اور ہمارا کردار ہماری گفتار سے ہم آہنگ نہیں رہتا
کاروانِ شوق بے ذوقِ رحیل | بے یقیں و بے سبیل و بے دلیل[1]
عشق کے قافلے میں ذوقِ سفر نابود ہوجاتا ہے | اور وہ بے یقین بے راہ اور بے رہنما ہوجاتا ہے

---

[1] دلیل بمعنی رہنما۔

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
غلام اپنے مذہب و عقل کو بہت سستا بیچتا ہے

تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
اور اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لیے جان سے دستبردار ہوتا ہے

گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست
اگرچہ اس کے ہونٹوں پر خدا کا نام ہے

قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست
لیکن اس کا قبلہ قوتِ فرمانروا ہے

طاقتے نامش دروغ با فروغ
وہ قوت جس کا نام بڑھتا ہوا جھوٹ ہے

از بطونِ او نزاید جز دروغ
اور جس کے پیٹ سے جھوٹ کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست
ملوکیت کے اس بت کو جبتک تو سجدہ کرتا رہے وہ خدا ہے

چوں یکے اندر قیام آئی فناست
لیکن جونہی تو قیام میں آئے وہ از خود فنا ہو جاتا ہے

آں خدا نانے دہد جانے دہد
وہ سچا خدا تو جان بھی دیتا ہے اور نان بھی

ایں خدا جانے برد نانے دہد
مگر یہ جھوٹا خدا نان دے کر جان چھین لیتا ہے

آں خدا یکتاست ایں صد پارہ ایست
وہ سچا خدا یکتا ہے اور اس کے سو ٹکڑے ہیں

آں ہمہ را چارہ ایں بیچارہ ایست
وہ سب کا چارہ ساز ہے اور یہ ہر طرح بیچارہ ہے

آں خدا درمانِ آزارِ فراق
وہ خدا دردِ فراق کی بہترین دوا ہے

ایں خدا اندر کلامِ او نفاق
اور اس خدا کی باتوں میں بھی نفاق بھرا ہوا ہے

بندہ را با خویشتن خوگر کند
یہ خدا اپنے بندے کو اپنی عادات کا خوگر بناتا ہے

چشم و گوش و ہوش را کافر کند
اور تمام حواس و حسیات کو کافر بنا دیتا ہے

چوں بجانِ عبدِ خود راکب شود
جب یہ خدا اپنے بندے کی روح پر سوار ہوتا ہے

جاں بہ تن لیکن ز تن غائب شود
تو روح جسم میں ہوتے ہوئے بھی جسم سے غائب ہو جاتی ہے

زندہ او بیجاں چہ راز است ایں نگر!
ایک انسان زندہ ہو کر بھی بے جان! یہ کیا راز ہے

با تو گویم معنیٔ رنگیں، نگر.
میں تجھ سے ایک معنیِ رنگین بیان کرتا ہوں غور کر

مردن و ہم زیستن اے نکتہ رس
ایں ہمہ از اعتبارات است و بس

اے نکتہ شناس! ہم جو "مرنا" اور "جینا" کہتے ہیں
تو یہ سب اعتباری اور فرضی چیزیں ہیں

ماہیاں را کوہ و صحرا بے وجود
بہر مرغاں قعرِ دریا بے وجود

مچھلیوں کے لئے کوہ و صحرا بے وجود چیزیں ہیں
اور پرندوں کے لئے دریا کی گہرائی بے معنی ہے

مردِ کر سوزِ نوا را مردۂ
لذّتِ صوت و صدا را مردۂ

ایک بہرا شخص سوزِ نغمہ کے حق میں بالکل مردہ ہے
اور لذّتِ نغمہ و آواز اس کے لئے بے معنی ہے

پیشِ چنگے مست و مسرور است کور
پیشِ رنگے زندہ در گور است کور

لیکن ایک اندھا شخص ساز کے سامنے مست و بیخود ہے
اور وہی اندھا رنگوں کے لئے زندہ در گور ہے

روح با حق زندہ و پایندہ ایست
ورنہ ایں را مردہ آں را زندہ ایست

روح تو صرف حق سے وابستہ ہو کر زندہ و پایندہ ہے
ورنہ اس جھوٹے خدا کے ساتھ مردہ اور اس کے ساتھ زندہ ہے

آنکہ حیٌّ لایموت آمد حق است
زیستن با حق حیاتِ مطلق است

جو ہمیشہ زندہ اور غیر فانی ہے وہ صرف خدا ہے
اور خدا کی معیت میں زندہ رہنا ہی مکمل زندگی ہے

ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتمِ او زار نیست

جو بھی حق سے علیحدہ زندہ رہا وہ مردار ہے
اگرچہ کوئی شخص اس کے ماتم میں غمزدہ نہیں

از نگاہش دیدنی ہا در حجاب
قلبِ او بے ذوق و شوقِ انقلاب

دکھائی دینے والی چیزیں بھی اس کی نگاہ سے اوجھل ہیں
اور اس کے دل میں کوئی ذوق و شوقِ انقلاب پیدا نہیں ہوتا

سوزِ مشتاقی بکردارش کجا
نورِ آفاقی بگفتارش کجا؟

اس کے کردار میں سوزِ مشتاقی نایاب ہے
اور اس کی گفتار میں نورِ آفاقی ناپید

مذہبِ او تنگ چوں آفاقِ او
از عشا تاریک تر اشراقِ او

اس کی دنیا کی طرح اس کا مذہب بھی تنگ ہے
اور اس کی صبح اس کی عشاء سے بھی تاریک ہے

زندگی بارِ گراں بر دوشِ او — مرگِ او پروردۂ آغوشِ او

زندگی اس کے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ ہے — اور اس کی موت اس کی آغوش میں پروردہ ہے

عشق را از صحبتش آزارہا — از دمش افسردہ گردد نارہا

عشق کو اس کی مجلس سے بہت بیماریاں لگتی ہیں — اور اس کے دم سے کئی آگیں بجھ جاتی ہیں

نزدِ آں کرمے کہ از گِل بر نخاست — مہر و ماہ و گنبدِ گرداں کجاست

وہ کیڑا جو مٹی سے کبھی باہر ہی نہیں نکلا — اس کے لئے سورج چاند اور آسمان کہاں ہیں

از غلامے ذوقِ دیدارے مجوئے — از غلامے جانِ بیدارے مجوے

غلام سے ذوقِ دیدار کی توقع نہ رکھ — اور جسمِ غلام میں روحِ بیدار کی جستجو نہ کر

دیدۂ او محنتِ دیدن نبرد — در جہاں خورد و گراں خوابیدہ مرد

اس کی آنکھ نے مشاہدۂ کائنات کی محنت کبھی گوارا نہیں کی — وہ تو دنیا میں صرف کھاتا اور سوتا رہا اور پھر مرگیا

حکمراں بکشایدش بندے اگر — می نہد بر جانِ او بندے دگر

اگر حکمراں اس کے جسم سے ایک بند کھولتا ہے — تو اس کی روح پر ایک اور بند باندھ دیتا ہے

سازد آئینے گرہ اندر گرہ — گویدش می پوش ازیں آئیں زرہ

وہ ایک نہایت پیچیدہ سا آئین بناتا ہے — اور اسے کہتا ہے کہ اس آئین کی زرہ پہن لے

ریزہ پیزِ قہر و کیں بنمایدش — بیمِ مرگِ ناگہاں افزایدش

وہ اس پر غضب و کینہ کے تاثرات نمایاں کرتا ہے — اور مرگِ ناگہاں کا خوف اس میں بڑھاتا ہے

تا غلام از خویش گردد ناامید — آرزو از سینہ گردد ناپدید

تاکہ غلام اپنے آپ سے ناامید ہو جائے — اور آرزو اس کے سینے سے محو ہو جائے

گاہ او را خلعتِ زیبا دہد — ہم زکامِ کار در دستش نہد

کبھی وہ اسے خوبصورت لباس دیتا ہے — اور کبھی اسے صاحبِ منصب بنا دیتا ہے

مہرہ را شاطر ز کف بیروں جہاند | بیذقِ خود را بفرزینی رساند

شاطر نے اپنا مہرہ ہاتھ سے باہر پھینکا | اور اپنے پیادے کو وزیر کی جگہ پہنچا دیا

نعمتِ امروز را شیدائش کرد | تا بمعنی منکرِ فردائش کرد

اس نے غلام کو آج کے انعام کا متوالا کیا | اور اس طرح درحقیقت اسے کل کا منکر کر دیا

تن ستبر از مستیِ مہرِ ملوک | جانِ پاک از لاغری مانندِ دوک

بادشاہوں کی مہربانی سے جسم تو موٹے ہو جاتے ہیں | لیکن روحِ پاک لاغری سے گویا چرخے کا تکلہ بن جاتی ہے

گر دو ار زار و زبوں یک جانِ پاک | بہ کہ گردد قریۂ تن ہا ہلاک

اگر ایک جانِ پاک بھی کمزور و ناتواں ہو | تو اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ جسموں کی پوری آبادی ہلاک ہو جائے

بند بر پا نیست بر جان و دل است | مشکل اندر مشکل اندر مشکل است

مگر یہاں تو زنجیر پاؤں میں نہیں بلکہ جان و دل پر ہے | اور اس طرح غلاموں کیلئے مشکل در مشکل پیدا ہو رہی ہے

از غلامے لذتِ ایماں مجو

الغرض غلام سے لذتِ ایمان کی توقع نہ رکھ

گرچہ باشد حافظِ قرآں، مجو

اگرچہ وہ حافظِ قرآں ہو، پھر بھی اس میں ایمان کی تلاش نہ کر

غُلامی

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد

انسان نے بے بصیرتی کی وجہ سے انسان کی غلامی اختیار کی

گوہرے داشت و لے نذرِ قباد و جم کرد

اس کے پاس (آزادی کا) ایک ہیرا تھا جو اس نے شاہوں کی نذر کر دیا

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تراست

یعنی وہ عادتِ غلامی کی وجہ سے کتوں سے بھی بدتر ہو رہا ہے

من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد (پیامِ مشرق)

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایک کتے نے دوسرے کتے کے سامنے سر جھکایا ہو

بگوشم آمد از خاکِ مزارے

ایک مزار سے میرے کان میں یہ آواز آئی کہ

کہ در زیرِ زمیں ہم می تواں زیست

زیرِ زمین بھی ہمیشہ زندہ رہا جا سکتا ہے

نفس دارد ولیکن جاں ندارد

وہ شخص سانس تو رکھتا ہے مگر روح نہیں رکھتا

کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست (پیامِ مشرق)

جو دوسروں کی منشا و مراد کے مطابق زندہ رہا

چہ گویمت کہ چہ بودی چہ کردۂ چہ شدی

میں تجھے کیا بتاؤں کہ تو کیا تھا، تو نے کیا کیا اور کیا ہو گیا

کہ خوں کند جگرم را ایازیِ محمود (زبورِ عجم)

کیونکہ میرے جگر کو تو حاکم کی محکومی اور آقا کی غلامی خون کئے دیتی

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
غلامی سے اپنی فطرتِ آزاد کو بدنام نہ کر
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری (بانگِ درا)
جب تک تو آقاؤں کے بت بناتا رہے گا، برہمن سے کافر تر ہوگا

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی (بانگِ درا)

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا (بالِ جبریل)

بندۂ حُر

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیّاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری (ضربِ کلیم)

آزاد و محکوم

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوموں کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات (ضربِ کلیم)

غلاموں کی نماز

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام؟

وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملّت کی زندگی کا پیام (ضربِ کلیم)

جس کے پرتو سے منوّر رہی تیری شبِ دوش
پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغِ روشن
مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حُر کے لئے نشترِ تقدیر ہے نوش
نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش (ضربِ کلیم)

عالمِ برزخ

مُردہ اپنی قبر سے

کیا شے ہے؟ کس امروز کا فردا ہے قیامت؟
اے میرے شبستانِ کہن! کیا ہے قیامت؟

قبر

اے مُردۂ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم؟
ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت!

مُردہ

جس موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت
اس موت کے پھندے میں گرفتار نہیں میں!
ہر چند کہ ہوں مُردۂ صد سالہ و لیکن
ظلمت کدۂ خاک سے بیزار نہیں میں!
ہو روح پھر اک بار سوارِ بدنِ زار
ایسی ہے قیامت تو خریدار نہیں میں!

صدائے غیب

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد

بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اُٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

قبر

(اپنے مردہ سے)

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر، محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک!

مرگِ غلامی

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام
شرعِ ملوکانہ میں جدّتِ احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام
اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی[1] کا مقام

[1] صفحہ ۳۶۲ پر ملاحظہ ہو

آزاد قومیں

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی!
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

---

[1] حاشیہ صفحہ ۳۶ ۔یعنی بحیثیت "انسان" اپنا منصب و مرتبہ سمجھ کہ تو زمین پر خدا کا "خلیفہ" (نائب) ہو کر خدا کے سوا دوسروں کا غلام کیوں ہے؟

[2] عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں — عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں (اقبال)
آزاد قوموں کی عید ملک و مذہب کی شان و شوکت ہے — لیکن غلاموں کی عید فقط "اجتماعِ مومنین"

موازنۂ آزاد و محکوم

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک[1]
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ[2] افلاک ہے یہ خواجۂ[3] افلاک (ارمغانِ حجاز)

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بیکرانہ (ارمغانِ حجاز)

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب محکومِ سلطان و امیر (ارمغانِ حجاز)

---

[1] انگور کی بیل۔ [2] بندہ۔ غلام [3] آقا۔ حاکم و مختار

بعض وقت اقوام کسی بیرونی حکمران اور خارجی حکومت کے جبر و اقتدار سے رسمی و رواجی طور پر آزاد ہو بھی جاتی ہیں، لیکن ان کے دل و دماغ آزادی کے بعد بھی غلامانہ عقائد و تصورات اور عواطف و رجحانات سے معمور رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ رسمی طور پر آزاد ہو جانے والی اور آزادی کے شادیانے بجا لینے والی قوم ذہنی اور عملی طور پر پہلے سے بھی بدتر غلامی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ "آزاد" قوم کی ایسی عبرت انگیز غلامی کا تجزیہ تین عنوانات میں کیا جا سکتا ہے، جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جس قوم کے جبر و اقتدار سے آزادی حاصل کی، اس کے "تہذیب و تمدن" اور "طریق بود و باش" کی غلامی!

(۲) "نفسِ امارہ" کی غلامی یعنی نفس جن خواہشات و ضروریات کا تقاضا کرے شریعت کے احکام کو بالائے طاق رکھ کر بھی ان کی پیروی کرنا۔

(۳) انفرادی اغراض و مفادات کی غلامی یعنی ایک "آزاد" قوم کا "آزاد" فرد ہو کر بھی محض ذاتی اغراض و مفادات کی خاطر قوم و ملت کے اجتماعی مفادات کو انتہائی غفلت و غیر ذمہ داری سے تباہ و برباد کر دینا۔

پس ہر صاحبِ نظر، فراخ دل اور منصف مزاج شخص فوراً تسلیم کرے گا کہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی پاکستان کی اکثریت میں یہ تینوں قسم کی غلامیاں بڑی شدت سے جاری و ساری ہیں۔ یہ ایک واضح اور بیّن حقیقت ہے جو اپنی تصدیق و تائید کے لئے کسی طویل بحث کی محتاج نہیں، تاہم آپ مختصر طور پر یہ غور فرمائیں کہ:۔

(۱) کیا ہم نے "آزاد" ہو کر سابقہ حکمران قوم کے تمدن اور طریق بود و باش سے

کنارہ کش ہوتے ہوئے اپنے "اسلامی" تمدّن کو اپنایا، روزمرّہ زندگی میں آزادی اور اختیارِ کاملہ کا کوئی تمدّنی اور معاشرتی فائدہ اٹھایا؟ — بلکہ حالت تو یہ ہے کہ باشندگانِ پاکستان بالعموم اور ہمارے سرمایہ دار، خوشحال اور "تعلیم یافتہ" مرد و زن بالخصوص اسلامی تہذیب و تمدّن سے نجات دکنارہ کشی اور فرنگی تہذیب و تمدّن کی تقلید میں دورِ غلامی سے کہیں زیادہ سرگرمی کے ساتھ محو و مستغرق ہیں۔ کیا آزاد دل و دماغ کی قومیں یہی کچھ کیا کرتی ہیں؟ علامہ اقبال کا ارشاد ہے:۔

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ

اگرچہ فرنگ رنگارنگ کے اطوارِ تہذیب و تمدن رکھتا ہے

من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

لیکن میں تو تہذیبِ فرنگ سے عبرت کے سوا کچھ اخذ نہیں کرتا

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو

اے کہ تو اس کی تقلید میں گرفتار ہے آزاد ہو جا

دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

قرآن کا دامن پکڑ اور ہر دوسری وابستگی سے آزاد ہو جا

(۲) نفسِ امّارہ" کی غلامی کا یہ عالم ہے کہ ہم شرکِ خفی میں مبتلا اور اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ[1] کے مصداق ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہم خدا کے اوامر و نواہی کی تعمیل نہیں کریں گے اور حلال کو حلال، اور حرام کو حرام نہیں سمجھیں گے، خود روحِ آزادی اور مقاصدِ آزادی کو تقویت کیونکر پہنچے گی؟ اور خصوصاً

---

[1] کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی ہوا و ہوس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔"

مسلمان کو تو روزِ ازل ہی سے یہ تلقین کی گئی ہے اور آج تعلیماتِ قرآن اس پر شاہد بھی ہیں کہ حریت (آزادی) کا قیام و استقلال اور استحکام و پائداری سراسر احکامِ الٰہی کی طاعت میں مضمر ہے اور نفسِ امّارہ کی پیروی آزادی کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ افرادِ ملت کی یہ عام عادت ہے کہ وہ ارکانِ حکومت کی غیر معمولی بدعنوانیوں اور خلافِ شریعت کاموں پر تو بڑی شدّت سے تنقید و نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن یہ سوچنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے کہ ہم خود کس بری طرح سے نفسِ امارہ کے غلام اور فسق و فجور کے پتلے ہو رہے ہیں کہ نیکی اور بدی کا امتیاز تک نہیں۔ اور سوال تو یہ ہے کہ جو شخص خود گمراہ و غلط کار ہے اسے دوسروں پر لعنت و ملامت کرنے کا حق کیا ہے؟

تجھے کیا فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے (اقبال)

بہر کیف حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ جب تک پاکستان کا ہر مسلمان دوسروں کو برا بھلا کہنے کی بجائے انصاف و دیانتداری سے اپنے قول و فعل کی اصلاح نہیں کرتا اور نفسِ امارہ کی غلامی سے آزاد ہو کر احکامِ الٰہی کا سچا غلام نہیں بنتا ہماری رسمی رسمی طور پر حاصل کردہ "آزادی" محض ایک خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا اور جس کے حقیقی اغراض و مقاصد ہمیشہ ایک جلوۂ سراب بنے رہیں گے!

(۳) انفرادی اغراض و مفادات کی غلامی۔ عہدِ خلفائے راشدین اور قرنِ اوّل کے بعد سے یہ غلامی مسلمانوں میں بہت عام رہی ہے اور یہی خصلتِ ملعونہ ان کے زوال و انحطاط کا باعث ہوئی۔ زندہ و آزاد قوموں کی سب سے پہلی اور بلند صفت یہ رہی ہے۔ کہ اس کے افراد قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں؛

یا بالفاظِ دیگر وہ قومی و اجتماعی مفاد کو اپنے انفرادی مفاد پر کسی حالت میں کسی قیمت پر قربان نہیں کرتے۔ چونکہ مسلمان "غلامِ حق" رہنے کی بجائے روز بروز "غلامِ ہوا و ہوس" ہونے لگے۔ لہٰذا ان میں ایسے منافق بہ تعداد کثیر پیدا ہو گئے جو ذاتی اغراض و مفادات کے مقابل قومی و اجتماعی مفادات کو پسِ پشت پھینک دیتے ہیں۔ بہرکیف جو قوم ایسے افراد پر مشتمل ہو اسے نہ تو "آزاد" کہہ سکتے ہیں اور نہ وہ آزادی کے تقاضوں کو عملاً بجا لا سکتی ہے۔ بالخصوص مسلمان کو فطرتاً اور مذہباً یہ درس دیا گیا ہے کہ قومی مفاد و منفعت کے سامنے انفرادی مفاد و منفعت کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں۔ اور اس ایثار و اتحاد کی بنا رکھی گئی اس عالمگیر اصولِ اخوت پر جو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ[1] کے ازلی رشتے سے محکم و پائندہ ہے۔ یہ اصول سراپا محبت و مودت اور ایثار و ہمدردی ہے جس کا حاصل ہے مستقل آزادی۔ بخلاف اس کے انفرادی اغراض کی پرستش اور بحثِ "ما و تو" ایک دائمی اور غیر منتہا ہی غلامی ہے!

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا (اقبال)

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے (اقبال)

---

[1] تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

پس آزادی اور قیام و استقلالِ آزادی کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ قومی و اجتماعی ضروریات و مفادات کو ہمیشہ ذاتی اغراض و مفادات پر مقدم رکھیں اور اس ضمن میں اپنے معاشرہ سے، اپنی قیادت سے اور اپنی حکومت سے مکمل طور پر تعاون کریں۔ کیونکہ حیاتِ اجتماعی سے کنارہ کش رہ کر انفرادی آزادی و خوش حالی بالکل بے معنی چیز ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں! (اقبال)

اقبالؒ کی حکمتِ آرزو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اقبالؔ

اقبالؒ کی حکمتِ آرزو

یورپ اور ایشیا میں اکثر فلاسفہ، شعراء اور ادباء ایسے بھی ہوگذرے ہیں جو زندگی اور زندگی کی بے شمار نعمتوں سے بیزار و متنفر تھے، انسانی معاشرہ اور اس کے فرائض سے گریزاں تھے، گویا چمگادڑ کی طرح مستقل طور پر خلوت پسند تھے اور تاریکی کو روشنی پر، مایوسی کو امید پر، غم کو مسرت پر، گریہ کو خندہ پر، تعطّل و بیکاری کو جہد و عمل پر، شکوک و اوہام کو یقین و اذعان پر، حتّیٰ کہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ اگر آپ ان سب کے عقائد و تصورات کا "خلاصہ" معلوم کرنا چاہیں تو اس کے لئے غالب کے یہ چند اشعار ہی بالکل کافی ثابت ہوں گے:۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
اگر کہے نہ وہ دن رات کو، تو کیونکر ہو!

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلےٰ کرے کوئی

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ کشتہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر کیا ہے تو اے نہیں ہے!

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک!

اور بیچارے غالبؔ ہی پر کیا موقوف ہے۔ فارسی اور ذخائرِ شعر و ادب کا بیشتر حصّہ ایسے ہی عناصرِ قنوطیّت سے معمور دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس نوع کی چیزیں جب علامہ اقبال جیسے مردِ حق آگاہ کے مطالعہ میں آئیں تو وہ فطرتِ صالحہ کے خلاف اس بغاوتِ خرد کو دیکھ کر نہایت مضطرب ہوئے اور "اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ" کے عنوان سے فرمایا:۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات

افسوس اس قوم پر جو موت سے سامانِ زندگی اخذ کرتی ہے
اور اس کا شاعر زندگی کے ذوق و شوق سے محروم ہے

خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

ایسے شاعر کا آئینہ بدصورت کو بھی خوبصورت کر دکھاتا ہے
اور اس کے شہد سے نوعِ انسانی کے جگر میں سینکڑوں نشتر ہیں

بوسۂ او تازگی از گُل بُرد
ذوقِ پرواز از دلِ بلبل بُرد

اس کا بوسہ پھول سے تازگی اڑا لے جاتا ہے
وہ دلِ بلبل سے ذوقِ پرواز چھین لیتا ہے

سستِ اعصاب تو از افیونِ او
زندگانی قیمتِ مضمونِ او

اس کی افیون سے تیرے پٹھے سست ہو رہے ہیں
اور اس کے یاس انگیز مضمون کی قیمت زندگانی ہے

می رباید ذوقِ رعنائی ز سرو
جرّہ شاہیں از دمِ سردش تذرو

وہ سرو سے ذوقِ حسن چھین لیتا ہے
اور اس کے ٹھنڈے سانس سے شاہیں بھی چکوری بن جاتا ہے

نغمہ ہایش از دلت گیرد ثبات — مرگ را از سحرِ او دانی حیات

اس کے نغمے تیرے دل سے پائداری چھین لیتے ہیں — اور اس کے جادو سے تو موت کو بھی زندگی سمجھنے لگتا ہے

دایۂ ہستی ز جانِ تو برد — لعلِ عنابی ز کانِ تو برد

وہ تیری روح سے زندگی کی خواہش زائل کر دیتا ہے — اور تیری کان سے سرخ لعل اڑا لے جاتا ہے

چوں زیاں پیرایہ بندد سود را — می کند مذموم ہر محمود را

وہ ہر فائدے کو نقصان ثابت کر دکھاتا ہے — اور ہر قابلِ تعریف چیز کو قابلِ مذمت ظاہر کرتا ہے

در یمِ اندیشہ اندازد ترا — از عمل بیگانہ می سازد ترا

وہ تجھے تفکرات کے سمندر میں لا پھینکتا ہے — اور تجھے عمل سے فارغ و بیگانہ کر دیتا ہے

خستہ و ما از کلامش خستہ تر — انجمن از دورِ جامش خستہ تر

وہ خستہ ہے اور ہم اس کے کلام سے خستہ تر ہو رہے ہیں — اور محفل اس کے دورِ جام سے مضمحل ہو رہی ہے

جوئے برقے نیست در نیسانِ او — یک سرابِ رنگ و بو بستانِ او

اس کے ابرِ نیسانی میں کسی بجلی کی نہر نہیں ہے — اور اس کا باغ محض ایک سرابِ رنگ و بو ہے

حسنِ او را با صداقت کار نیست — در یمش جز گوہرِ تف دار نیست

اس کے حسن کو سچائی اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں — اور اس کے سمندر میں عیب دار موتیوں کے سوا کچھ نہیں

خواب را خوشتر ز بیداری شمرد — آتشِ ما از نفسہایش فسرد

اس نے نیند کو بیداری سے بہتر سمجھا — اور ہماری آگ اس کے سانسوں سے بجھ گئی

قلب مسموم از سرودِ بلبلش — خفتہ مارے زیرِ انبارِ گلش

اس کی بلبل کے نغمات سے دل زہر آلود ہو گئے — اور اس کے پھولوں کے ڈھیر میں سانپ سو رہے ہیں

از خم و مینا و جامش الحذر — از مۓ آئینہ فامش الحذر

اے مسلمان! اس کے مٹکے، صراحی اور پیالے سے دور رہ — اور اس کی مئےِ آئینہ روشن شراب سے کنارہ کش رہ

اے ز پا افتادۂ صہبائے او ‏ ‏ صبح تو از مشرقِ مینائے او
اے وہ شخص جو اس کے نشۂ شراب سے زمین پر گر رہا ہے ‏ ‏ اور تیری صبح اس کی مینا کے مشرق سے نمودار ہوتی ہے

اے دلت از نغمہ ہایش سرد جوش ‏ ‏ زہرِ قاتل خوردہ از راہِ گوش
اے کہ تیرا دل اس کے نغموں سے سرد و خاموش ہو رہا ہے ‏ ‏ تو نے کانوں کے راستے زہرِ قاتل کھا لیا ہے

اے دلیلِ انحطاط اندازِ تو ‏ ‏ از نوا افتاد تارِ سازِ تو
اے کہ تیرا اندازِ زندگی وجہِ ذلت و پستی ہے ‏ ‏ اور تیرے ساز کے تار نغمے پیدا کرنے سے قاصر رہے

آں چناں زار از تن آسانی شدی ‏ ‏ در جہاں ننگِ مسلمانی شدی
تو تن آسانی سے اس قدر کمزور و ناتواں ہو گیا ‏ ‏ کہ دنیا میں اسلام و مسلمانی کے لئے باعثِ ذلت بن گیا

از رگِ گُل می تواں بستن ترا ‏ ‏ از نسیمے می تواں خستن ترا
تجھے تو پھول کی رگوں سے بھی باندھا جا سکتا ہے ‏ ‏ اور ہوا کے ایک جھونکے سے تجھے زخمی کیا جا سکتا ہے

عشق رسوا گشتہ از فریادِ تو ‏ ‏ زشت رو تمثالش از بہزادِ تو
تیری آہ و فریاد سے عشق بدنام ہو گیا ‏ ‏ اور تیرے بہزاد کی مصوری سے اس کی تصویر بدنما ہو گئی

زرد از آزارِ تو رخسارِ او ‏ ‏ سردیٔ تو بردہ سوز از نارِ او
تیرے دکھ درد سے عشق کا رخسار بھی زرد ہو گیا ‏ ‏ اور تیری سردیٔ مزاج نے آتشِ عشق کی حرارت کھو دی

خستہ جاں از خستہ جانیہائے تو ‏ ‏ ناتواں از ناتوانیہائے تو
تیری خستہ جانی سے عشق بھی خستہ جان ہو گیا ‏ ‏ اور تیری کمزوری و ناتوانی سے وہ بھی ناتواں ہو گیا

گریۂ طفلانہ در پیمانہ اش ‏ ‏ کلفتِ آہے متاعِ خانہ اش
چنانچہ اب پیمانۂ عشق میں گریۂ طفلانہ کے سوا کچھ نہیں ‏ ‏ اور اس کے گھر میں کوئی ساز و سامان ہے تو آہ و فریاد

سرخوش از دریوزۂ میخانہ ہا ‏ ‏ جلوہ دزدِ روزنِ کاشانہ ہا
وہ میخانوں کی شراب مانگ کر مست و بیخود ہے ‏ ‏ اور گھروں کے روزن سے جلوۂ حسن دیکھ رہا ہے

ناخوشے افسردۂ آزردۂ
از لکد کوبِ نگہباں مردۂ

وہ بیمار و ناخوش ہے، بجھا ہوا اور نڈھال ہے
اور دربانِ معشوق کے لتیاؤ سے مردہ ہے

از غماں مانندِ نے کاہیدۂ
وز فلک صد شکوہ بر لب چیدۂ

وہ رنج و غم سے بانسری کی طرح لاغر ہو رہا ہے
اور آسمان کے خلاف سینکڑوں شکوے اس کی زبان پر ہیں

لابہ و کیں جوہرِ آئینہ اش
ناتوانی ہمدمِ دیرینہ اش

مکر و فریب اور کینہ اس کے آئینہ کے جوہر ہیں
اور کمزوری اس کی پرانی ہمدم ہے

پست بخت و زیردست و دوں نہاد
ناسزا و ناامید و نامراد

وہ بدنصیب محکوم و مجبور اور بدنہاد ہے
وہ نااہل ہے اور ناامید و نامراد

شیونش از جانِ تو سرمایہ برد
لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ برد

اُس کی آہ و فریاد نے تیری روح کا جوہر چھین لیا
اور پڑوسیوں کی آنکھ سے نیند کا لطف بھی

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد
افسوس اس عشق پر جس کی آتشِ اخلاص بجھ گئی

در حرم زائید و در بت خانہ مُرد
وہ بیت اللہ میں پیدا ہوا اور بت خانہ میں جا مرا

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی او را بزن

اے کہ تیرے جیب میں شعر کی نقدی ہے
تو اسے زندگی کی کسوٹی پر پرکھ

فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است
چوں درخشِ برق پیش از تندر است

چیزوں کو روشن صورت میں دیکھنے والی فکر عمل کی رہبر ہے
اور وہ کڑک سے پہلے تجلی برق کی حیثیت رکھتی ہے

فکرِ صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت

تجھے شعر و ادب میں فکرِ صالح چاہیئے
اور راہ و رسمِ عجم کو چھوڑ کر عرب کی طرف رجوع چاہیئے

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد [1] تا دمد صبحِ حجاز از شامِ کرد

اب تو دل سلمائے عرب کے سپرد کرنا چاہیے تاکہ شامِ کرد سے صبحِ حجاز پیدا ہو

از چمن زارِ عجم گُل چیدۂ نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ

تو نے اب تک چمنِ عرب سے پھول چنے ہیں اور ہند اور ایران کی بہاریں دیکھی ہیں

اندکے از گرمیٔ صحرا بخور بادۂ دیرینہ از خُرما بخور

اب کچھ نہ کچھ گرمیٔ صحرا بھی برداشت کر اور کھجوروں کی پرانی شراب بھی پی

سر یکے اندر برِ گرمش بدہ تن دمے با صرصرِ گرمش بدہ

ایک مرتبہ اپنا سر عرب کے سینۂ گرم میں بھی رکھ اور اپنا جسم اس کی ہوائے گرم کے سامنے کھول دے

مدتے غلطیدۂ اندر حریر خُو بہ کرپاسِ درشتے ہم بگیر

تو ایک مدت ریشم ہی میں ملبوس رہا اب ذرا سخت ٹاٹ کا بھی عادی ہو

قرنہا بر لالہ پا کوبیدۂ عارض از شبنم چو گل شوئیدۂ

صدیوں تک تو لالہ زار پر رقص کرتا رہا ہے اور پھول کی طرح شبنم سے اپنا رخسار دھویا ہے

خویش را بر ریگِ سوزاں ہم بزن غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

اب خود کو تپتی ہوئی ریت پر بھی بٹھا اور وہاں کے چشمۂ زمزم میں بھی غوطہ لگا

مثلِ بلبل ذوقِ شیون تا کجا؟ در چمن زاراں نشیمن تا کجا؟

تو بلبل کی طرح کب تک وقفِ نالہ و فریاد رہیگا اور اپنا گھونسلا چمن ہی کب تک جمائے رکھیگا

اے ہُما از یمنِ دامت ارجمند آشیانے ساز بر کوہِ بلند

اے کہ تیرے جال کی برکت سے ہما بھی بلند اقبال ہے اب کسی کوہِ بلند پہ اپنا آشیانہ بنا

---

[1] سلمیٰ: ادبیاتِ عرب میں معشوقہ کا نام۔

آشیانے برق و تندر در برے — از کنامِ جُرّہ بازاں برترے

وہ آشیانہ جو اپنی آغوش میں بجلی اور کڑک لئے ہو — اور جو بازوں کے گھونسلے سے بھی بلند تر ہو

تا شوی در خوردِ پیکارِ حیات

تاکہ تو زندگی کی جنگ لڑنے کے قابل ہو سکے

جسم و جانت سوزد از نارِ حیات (اسرارِ خودی)

اور تیرے جسم و جان زندگی کی آگ سے گرم و سوزاں رہیں

علاوہ ازیں چونکہ افلاطونِ یونانی نے بھی "مسلکِ گوسفندی" اختیار کرتے ہوئے امید و آرزو کی شدید مذمت اور یاس و مرگ کی تعریف و توصیف کی تھی، لہٰذا علامہ مرحوم مسلمانوں کو اس کی تعلیمات سے محترز رہنے کی تلقین فرماتے ہیں:-

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم

وہ پرانا راہب افلاطون فلسفی — جو قدیمی بھیڑوں کے گروہ میں سے ہے

گفت سرِّ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است

اس نے کہا کہ رازِ زندگی مرنے میں ہے — اور شمع کی روشنی بجھنے ہی سے بڑھتی ہے

بر تخیل ہائے ما فرماں رواست — جامِ او خواب آور و گیتی رُباست

وہ ہمارے عقائد و تخیلات پر حاوی ہو رہا ہے — مگر اس کا جام نیند لاتا ہے اور دنیا کو ہم سے گم کر دیتا ہے

گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

وہ آدمی کے لباس میں ایک بھیڑ ہے — اور اس کا حکم صوفی کی روح پر سوار ہو رہا ہے

عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند — عالمِ اسباب را افسانہ خواند

اس نے اپنی عقل کو آسمان پر پہنچا دیا — اور اس عالمِ اسباب کو ایک افسانہ کہا

کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات　　قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات
اس کا کام ہے اجزائے زندگی کو فنا کرنا　　اور زندگی کے خوبصورت سرو کی شاخوں کو کاٹنا

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت　　حکمتِ او بود را نابود گفت
فکرِ افلاطون نے نقصان کو فائدہ کہا　　اور اس کے فلسفہ نے ہستی کو عدم بتایا

فطرتش خوابید و خوابے آفرید　　چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید
اس کی فطرت سو گئی اور اس نے ایک خواب پیدا کیا　　اور اس کی چشمِ ہوش نے ایک سراب نمایاں کیا

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود　　جانِ او وارفتۂ معدوم بود
وہ ذوقِ عمل سے بالکل محروم تھا　　اور اس کی روح موجود کی بجائے معدوم کی عاشق تھی

ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش　　از طپیدن بے خبر پروانہ اش
اس کا دانہ اگنے کا ذوق ہی نہیں رکھتا　　اور اس کا پروانہ لطفِ اضطراب سے بے خبر ہے

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت　　طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت
یہ راہب دنیا سے گریز کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رکھتا تھا　　اور اس میں اس دنیا کے شور و شغب کی طاقت ہی نہ تھی

در خمِ گردوں خیالِ او گم است　　من ندانم دُرد یا خشتِ خُم است
اس کا خیال آسمان کے مٹکے میں گم ہو رہا ہے　　میں نہیں جانتا کہ وہ تلچھٹ ہے یا خم کے نیچے رکھنے کی اینٹ

قومہا از سکرِ او مسموم گشت
ہر کیف قومیں اس کے نشے سے زہر آلود ہو گئیں

خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت　(اسرارِ خودی)
وہ سو گئیں اور ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں

اسی طرح جب جرمن فلسفی شوپنہار کی تصنیفات میں بھی ایسے ہی قاطعِ حیات اور مرگ آفریں تاثرات دکھائی دیئے تو علامہ اقبال نے اسے ایک "مرغِ چمن" سے استعارہ

کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تنقید فرمائی ہے:۔

شوپن ہار و نیٹشا

مرغے[2] ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید
ایک پرندہ اپنے گھونسلے سے سیرِ چمن کے لئے اڑا

خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید
اور شاخِ گل سے ایک کانٹا اس کے جسم میں چبھ گیا

بد گفت فطرتِ چمنِ روزگار را
تنگ ہو کر اس نے باغِ زمانہ کی فطرت و طینت کو برا بھلا کہا

از دردِ خویش و ہم زغمِ دیگراں تپید
وہ اپنے درد اور دوسروں کے رنج و غم سے بھی تڑپا کیا

داغے ز خونِ بیگنہے لالہ را شمرد
اس نے گلِ لالہ کو کسی بے گناہ کے خون کا داغ سمجھا

اندر طلسمِ غنچہ فریبِ بہار دید
اور غنچے کے جادو میں بہار کے مکر و فریب دیکھے

---

[1] شوپن ہار ایک جرمن فلسفی ہے اور اس کا فلسفہ سراپا یاس و قنوطیت چنانچہ نیٹشے کا فلسفہ اسی کا ردِ عمل ہے اور اس نے یقین و رجائیت اور فتح و تسخیر کا وہ آتشیں درس دیا ہے کہ علامہ اقبال سے پیشتر دنیا کے تمام لٹریچر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

[2] مراد شوپن ہار

گفت اندریں سرا کہ بنائش نہادہ کج

اس نے کہا کہ اس سرائے دنیا میں جس کی بنا ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے

صبحے کجا کہ چرخ در و شامہا نہ چید

وہ کوئی صبح ہے جس میں آسمان نے بہت سی شامیں نہ چن دی ہیں

نالید تا بجوصلۂ آں نوا طراز

چنانچہ وہ نغمہ سرا اس حد تک نالہ و فریاد کرتا رہا

خوں گشت نغمہ وز چشمش فرو چکید

کہ اس کا نغمہ خون بن کر اس کی دو آنکھوں سے ٹپک پڑا

سوزِ فغانِ او بدلِ ہدہدے[1] گرفت

اس کی آہ و فغاں کا سوز آخر ایک ہدہد کے دل پر اثر انداز ہوا

با نوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید

اور اس نے اپنی چونچ سے کانٹا اس کے جسم میں سے نکال لیا

گفتش کہ سودِ خویش ز جیبِ زیاں برآر

اور پھر اس سے کہا "اپنا فائدہ اپنے نقصان کے جیب سے پیدا کر

گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید

(دیکھتا نہیں کہ) پھول نے اپنے شگافِ سینہ سے خالص سونا پیدا کیا

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی

اگر تیرا جسم خستہ و زخمی ہو تو اس کی دوا درد سے بنا

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی (پیام مشرق)

خود کو کانٹوں کا عادی بنا تاکہ تو سراپا چمن ہو جائے

---

[1] مراد نٹشے

اس نظم سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ دنیا کے کسی فلسفی یا مصنّف کو محض ذاتی ناکامیوں تلخ کامیوں، مایوسیوں، بے اعتدالیوں، غلط کاریوں اور غیر منظم تجربوں سے متاثر ہو کر اپنے انفرادی حالات وجذبات کا زہر تمام نوعِ انسانی پر نہیں چھڑکنا چاہیئے، وہاں یہ حیات افروز درس بھی پایا گیا کہ حالات و واقعات کے ناساعد ہونے پر بھی "درد" سے "درماں" اور "خار" سے "گل" پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ گویا:-

تمنّا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے! اقبالؔ

پس چونکہ علامہ اقبالؔ ایک مومنِ صادق اور شاعرِ ربانی کی حیثیت سے قنوطیت کی نفی کرتے ہوئے ایک یکتائے روزگار معلّمِ رجائیت واقع ہوئے ہیں، لہذا وہ اکثر جگہ مسلمان کو "تخلیقِ مقاصد" اور "حفظِ آرزو" کی تاکید فرماتے ہیں۔ اس موضوع کا نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ تخلیقِ مقاصد کے بغیر کسی کے دل میں "آرزو" پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ شاہراہِ زندگی میں آپ پہلے ایک مقصد یا نصب العین معیّن کریں گے جبھی تو اس کی تحصیل و تسخیر کے لئے "آرزو" کا جذبہ پیدا ہوگا اور جب کوئی مقصد ہی نہ ہو تو "آرزو" کے کیا معنی؟ اسی طرح جب تک آپ کسی خاص "منزل" کا تعیّن نہ کریں اس کی جانب اقدامِ سفر کیونکر ہوگا؟[1] اور پھر ہر انسان کا فرض ہے کہ ایک مقصد یا ایک نصب العین معیّن کر لینے کے بعد پوری سنجیدگی، دل جمعی، انصاف اور دور اندیشی سے سوچے کہ وہ مقصد

---

[1] یہی وجہ ہے کہ ماہرینِ علم النفس نے انسان کی دنیائے عمل میں اوّل درجہ مقصد (OBJECT) کو دیا ہے اور دوسرا درجہ ذرائع (MEANS) کو۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک زندگی میں ایک "مقصد" معیّن نہ کیا جائے اس کی تحصیل کے ذرائع اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ پس نفسیاتی لحاظ سے بھی پہلے کوئی نہ کوئی مقصد و مدّعا

و مدّعا احکامِ الٰہی اور سنّتِ رسول ؐ کے خلاف تو نہیں۔ یہاں "احکامِ الٰہی" اور "سنّتِ رسول ؐ" کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا کہ یہ ہر دو چیزیں سراپا رحمت و خیر ہیں اور ان کی خلاف ورزی سراسر زحمت و شر۔

پس حاصلِ بحث یہ ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں ایک ایسا صالح اور صحت مند "مقصد" معیّن کرنا چاہیئے جو نہ صرف اس کی اپنی ذات کے لئے بلکہ عمومی حیثیت سے نوعِ انسانی کے لئے بھی مفید و ترقی بخش ہو۔ پھر تعیینِ مقصد کے ساتھ ہی ساتھ "آرزو" میں از خود بیداری و توانائی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور انسان منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں ہوگا۔ چنانچہ یہ شانِ بلاغت ملاحظہ ہو کہ علّامہ اقبالؒ نے ذیل کی مثنوی میں "تخلیقِ مقاصد[1]"۔ "نوعیتِ مقاصد[2]" اور پھر حفظ و بقائے آرزو[3] کا یکے بعد دیگرے مفصّل تذکرہ فرما دیا ہے:-

زندگانی را بقا از مدّعاست — کاروانش را درا از مدّعاست
زندگی کی بقا کسی نہ کسی مدّعا سے ہے — اور اس کے قافلے کے لئے بانگِ جرس مدّعا ہی ہے
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
مستقل قوتِ زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے — اور اس کی بنیاد آرزو پر رکھی گئی ہے

(بقیہ صفحہ ۳۸۸) معیّن کیا جائے گا اور بعد میں اس کی تحصیل و تسخیر کے لئے جد و جہد ہو گی۔ مقصد کے بغیر جذبات و احساسات میں کوئی تموّج و ہیجان پیدا ہی نہیں ہو سکتا اور نہ عزم و اقدام میں روحِ استقلال جلوہ نما ہوتی ہے۔

[1] مقاصد پیدا کرنا [2] مقاصد کیسے ہونا چاہئیں
[3] آرزو کی سلامتی۔

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار

آرزو کو اپنے دل میں زندہ و بیدار رکھ
تاکہ تیری مشتِ خاک مزار نہ بن جائے

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست
فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

جہانِ رنگ و بو کی روح آرزو ہے
اور ہر چیز کی فطرت آرزو کی امانتدار ہے

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا
سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

سینوں میں دل تمنا ہی سے رقص کرتے ہیں
اور تمنا کی روشنی سے سینے مثلِ آئینہ مجلّی ہیں

طاقتِ پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسیِٰ ادراک را

تمنا خاک کو بھی طاقتِ پرواز عطا کرتی ہے
اور وہ کلیمِ عقل کے لئے مانندِ خضر رہنمائی کرتی ہے

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات
غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات

دل سوزِ آرزو ہی سے زندگی حاصل کرتا ہے
جب آرزو دل میں زندہ ہوتی ہے تو غیر اللہ فنا ہو جاتا

چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند
شہپرش بشکست و از پرواز ماند

جب دل تخلیقِ مقاصد سے محروم ہو جاتے
تو سمجھو کہ اسکا شہپر ٹوٹ گیا اور وہ محرومِ پرواز ہو گیا

آرزو ہنگامہ آرائے خودی
موجِ بیتابے ز دریائے خودی

آرزو ہی خودی کو عمل کے لئے ہنگامہ آرا کرتی ہے
اور وہ دریائے خودی کی ایک بے چین موج ہے

آرزو صیدِ مقاصد را کمند
دفترِ افعال را شیرازہ بند

آرزو شکارِ مقصد کے لئے گویا کمند ہے
اور دفترِ اعمال کا پشتہ باندھ دیتی ہے

زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد
شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

فقدانِ آرزو نے زندوں کو بھی مردہ کر دیا
اور شعلے کو سوز کی کمی نے بجھا دیا

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما؟
بست صورت لذتِ دیدارِ ما

ہماری چشمِ بیدار کی اصل و بنیاد کیا ہے؟
پس ہماری لذتِ دیدار نے ایک مشہود صورت اختیار کر لی

کبک پا از شوخیِ رفتار یافت
بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

چکور نے شوخیِ رفتار ہی سے پاؤں پا لئے
اور بلبل نے ذوقِ نغمہ سرائی سے چونچ حاصل کی

نے بروں از نیستاں آباد شد
نغمہ از زندانِ او آزاد شد

جب نَے (بانسری) نیستان سے کٹ کر باہر آئی
تو نغمہ اس کی قید و بندش سے آزاد ہو گیا

عقلِ ندرت کوش و گردوں تاز چیست
ہیچ می دانی کہ ایں اعجاز چیست؟

نادر اشیا پیدا کرنے والی اور فلک سیر عقل کیا ہے!
تو سمجھتا بھی ہے کہ آخر یہ معجزہ کیا ہے!

زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

زندگی بذاتِ خود آرزو کی سرمایہ دار ہے
اور عقل نے اسی کے پیٹ سے جنم لیا ہے

چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم
چیست رازِ تازگیہائے علوم

قوم کی تنظیم اور زندگی کے آئین و رسوم کیا ہیں؟
اور علوم و فنون کی تازگی و ترقی کا راز کیا ہے؟!

آرزوئے کو بزورِ خود شکست
سر ز دل بیروں زد و صورت ببست

وہ ایک آرزو ہے جو ایک باطنی قوت سے پھوٹ نکلی
اس نے اپنا سر دل سے باہر نکالا اور موجودہ صورت اختیار کر لی

دست و دندان و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش

ہاتھ، دانت، دماغ، آنکھیں اور کان
فکر، تخیل، فہم و شعور، یاد و ہوش

زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت
بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت

زندگی نے جب میدانِ جنگ میں اپنا گھوڑا دوڑا لیا
تو اپنی حفاظت کے لئے یہ چند آلات بنا لئے

آگہی از علم و فن مقصود نیست
غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

علم و فن کا مقصد صرف معلومات ہی نہیں
اور اس چمن کا حاصل فقط غنچہ و گل ہی نہیں

علم از سامانِ حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

علم دراصل حفظِ زندگی کا سامان فراہم کرتا ہے
اور خودی کی جنتری کو علم ہی آراستہ و پیراستہ کرتا ہے

علم و فن از پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

علم و فن تو زندگی ہی کے لونڈی غلام ہیں
اور علم و فن نے زندگی ہی کے گھر سے جنم لیا ہے

اے ز رازِ زندگی بیگانہ، خیز!
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز!

اے کہ رازِ زندگی سے بے خبر ہے ہمت سے اٹھ
اور کسی مقصد کی شراب سے مستانہ ہو کر اٹھ

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ
ماسوا را آتشِ سوزندۂ

ایسا مقصد جو نورِ سحر کی مانند روشن ہو
اور غیر اللہ کو آگ کی طرح جلا کر راکھ کر دے

مقصدے از آسماں بالاترے
دلربائے دلستانے دلبرے

ایسا مقصد جو آسمان سے بھی بلند تر ہو
وہ دلربا بھی ہو، دلستاں بھی اور دلکش بھی

باطلِ دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبے سراپا محشرے

وہ مقصد جو پرانے نظامِ باطل کو برباد کرنے والا ہو
اس کی جیب میں فتنے ہوں اور وہ خود سراپا محشر

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
ہم تو صرف تخلیقِ مقاصد ہی سے زندہ ہیں
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم (اسرارِ خودی)
اور ہمیشہ آرزو کی شعاع ہی سے روشن ہیں

گرم خونِ انساں ز داغِ آرزو
آتش ایں خاک از چراغِ آرزو

انسان کا خون داغِ آرزو ہی سے گرم رہتا ہے
اور یہ خاک چراغِ آرزو ہی سے آگ بن جاتی ہے

ز تمنا مے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات

تمنا ہی نے زندگی کے جام میں شراب ڈالی
اور زندگی آمادہ و مستعد اور تیز رفتار ہو گئی

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس

زندگی تو سراسر مضمونِ تسخیر ہی ہے
اور آرزو تسخیر ہی کا ایک جادو ہے

زندگی صید افگن و دامِ آرزو

زندگی شکار مارنے والی ہے اور اس کا جال ہے آرزو

حسن را از عشق پیغامِ آرزو

اور عشق کی طرف سے حسن کو بھی آرزو ہی کا پیغام ملتا ہے

از چہ رو خیزد تمنّا دم بدم؟

آخر ہمارے دل میں ہر لمحہ آرزو کیوں پیدا ہوتی ہے؟

ایں نوائے زندگی را زیر و بم

اور نغمۂ زندگی کے یہ اتار چڑھاؤ کیسا ہیں؟

ہر چہ باشد خوب و زیبا و جمیل

دنیا میں جو کچھ بھی حسین و خوبرو اور دلکش ہے

در بیابانِ طلب مارا دلیل

وہ جستجو کے بیابان میں ہمارا رہنما بن جاتا ہے

نقشِ او محکم نشیند در دلت

اس حسین چیز کا نقش تیرے دل پر خوب جم جاتا ہے

آرزو ہا آفریند در دلت

اور پھر تیرے دل میں آرزوئیں پیدا کرتا رہتا ہے

حُسن خلّاقِ بہارِ آرزوست

پس بہارِ آرزو کا اصلی خالق حُسن ہی ہے

جلوہ اش پروردگارِ آرزوست

اور اس کا جلوہ آرزو کا پروردگا ہے

جاں ز امّید است چوں جوئے رواں

ہماری روح ولولۂ امید ہی سے ایک جوئے رواں ہے

ترکِ امّید است مرگِ جاوداں (اسرارِ خودی)

اور امید سے دستبردار ہونا ایک دائمی موت ہے

شکوہ کم کُن از سپہرِ لاجورد

لاجوردی آسمان کا شکوہ و شکایت مت کر

جز بگردِ آفتابے خود مگرد

اور اپنے آفتاب کے علاوہ کسی اور چیز کے گرد نہ گھوم

از مقامِ ذوق و شوق آگاہ شو

تو مرتبۂ ذوق و شوق سے باخبر ہو

ذرّہ؟ صیّادِ مہر و ماہ شو

اگر تو ذرّہ ہے تو سورج اور چاند کو شکار کر

عالمِ موجود را اندازہ کُن

اس عالمِ موجود و مشہود کا صحیح اندازہ کر

در جہاں خود را بلند آوازہ کُن

اور دنیا میں خود کو بلند آوازہ کر

برگ و سازِ کائنات از وحدت است — اندریں عالم حیات از وحدت است

کائنات کا تمام ساز و سامان اصولِ وحدت سے ہے
اور اس دنیا میں بقائے حیات وحدت سے ہے

درگذر از رنگ و بوہائے کہن — پاک شو از آرزو ہائے کہن

پرانے رنگ و بو سے اب کنارہ کش ہو جا۔
اور کہنہ و فرسودہ آرزوؤں سے پاک ہو

ایں کہن ساماں نیرزد با دو جو — نقشبندِ آرزوئے تازہ شو

یہ پرانا سامان تو دو اڑ جو کے عوض بھی مہنگا ہے
لہٰذا کسی نئی آرزو کا نقش پیدا کر دکھا

زندگی بر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس

زندگی جذبۂ آرزو ہی پر مبنی ہے
لہٰذا تو خود کو اپنی آرزو سے پہچان

چشم و گوش و ہوش تیز از آرزو — مشتِ خاکے لالہ خیز از آرزو

آنکھ، کان اور عقل آرزو ہی سے تیز ہیں
اور ایک مشتِ خاک آرزو ہی سے لالہ زار پیدا کرتی ہے

ہر کہ تخمِ آرزو در دل نہ کشت — پائمالِ دیگراں چوں سنگ و خشت

جس شخص نے دل کی کھیتی میں آرزو کا بیج نہ بویا
اسے دیگر لوگ سنگ و خشت کی طرح پامال کر دیتے ہیں

آرزو سرمایۂ سلطان و میر — آرزو جامِ جہاں بینِ فقیر

آرزو شاہ و امیر کا حقیقی سرمایہ ہے
اور آرزو فقیرِ حق کے لئے جامِ جہاں نما ہے

آب و گل را آرزو آدم کند — آرزو ما را ز خود محرم کند

آرزو خاک و آب کو بھی انسان بنا دیتی ہے
اور آرزو ہمیں اپنی ذات کا راز دار بنا دیتی ہے

چوں شرر از خاکِ ما بر می جہد — ذرہ را پہنائے گردوں می دہد

آرزو ایک شرر کی طرح ہماری خاک سے اچھلتی ہے
اور ایک ذرے کو آسمان کی وسعت عطا کرتی ہے

امتے کز آرزو نیشے نہ خورد — نقشِ او را فطرت از گیتی سترد

جس قوم نے آرزو کا کوئی ڈنگ نہ کھایا
فطرت نے اس کا نقش دنیا سے مٹا دیا۔

پورِ آزر کعبہ را تعمیر کرد — از نگاہے خاک را اکسیر کرد

پسرِ آزر (ابراہیم) نے کعبہ تعمیر کیا۔ — اور ایک نگاہ سے خاک کو اکسیر بنا دیا

تو خودی اندر بدن تعمیر کن

تو اپنے جسم میں خودی کی تعمیر کر!

مشتِ خاکِ خویش را اکسیر کن (اسرارِ خودی)

اور اپنی مشتِ خاک کو اکسیر بنا دے

جہاں یک نغمہ زارِ آرزوئے — بم و زیرش ز تارِ آرزوئے

یہ دنیا آرزو ہی کا ایک نغمہ زار ہے — اور اس نغمہ کے اتار چڑھاؤ تارِ آرزو سے ہیں۔

بچشمم ہرچہ ہست و بود و باشد — دمے از روزگارِ آرزوئے

میری آنکھ کے سامنے جو کچھ بھی ہے، تھا یا ہوگا — وہ سب زمانۂ آرزو کا ایک سانس ہے

دلِ من بے قرارِ آرزوئے

میرا دل آرزو سے بے قرار رہتا ہے

درونِ سینۂ من ہائے و ہوئے

اور اس سے میرے سینہ میں ہائے و ہو کا شور بپا رہتا ہے

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی!

اے ہم نشین! مجھ سے باتوں کا کیا تقاضا کرتا ہے

کہ من با خویش دارم گفتگوئے (پیامِ مشرق)

کہ میں تو اپنے آپ سے مصروفِ گفتگو رہتا ہوں

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم

میں دنیا کے باغ میں بو کی طرح پریشان رہتا ہوں

نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم

اور میں نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور مجھے کس چیز کی جستجو ہے

برآید آرزو یا برنیاید

بہرکیف میری آرزو پوری ہو یا نہ ہو۔

شہیدِ سوز و سازِ آرزویم (پیامِ مشرق)

میں آرزو کے سوز و ساز کا متوالا ہوں

اگر کردی نگہ بر پارۂ سنگ

اگر تو نے پتھر کے ٹکڑے پر ایک نظر ڈالی

زفیضِ آرزوئے تو گہر شد

تو وہ تیری آرزو کے فیض سے موتی بن گیا۔

بزر خود را مسنج اے بندۂ زر

اے بندۂ زر خود کو سونے کے ساتھ نہ تول

کہ زر از گوشۂ چشمِ تو زر شد (پیامِ مشرق)

کیونکہ سونا تو تیری نگاہِ التفات سے سونا بنا ہے۔

اگر ز رمزِ حیات آگہی، مجوے ومگیر

اگر تو زندگی کے راز سے باخبر ہے تو ایسا دل نہ تو

دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است (پیامِ مشرق)
ڈھونڈھ اور دل ہے جو خارِ آرزو کی خلش سے محروم ہے

منہ از کف چراغ آرزو را
اپنے ہاتھ سے آرزو کا چراغ نہ رکھ
بدست آور مقامِ ہا و ہو را
اور عشق کا مقامِ مستی و شوق حاصل کر
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم
اس دنیا کے چار سو (تقسیمِ مکانی) میں گم نہ ہو
بخود باز آ و بشکن چار سو را (پیامِ مشرق)
بلکہ اپنی طرف واپس لوٹ آ اور طلسمِ چار سو کو توڑ دے

چو قومے در گذشت از گفتگو ہا
جب کوئی قوم زبانی بحث و گفتگو سے آزاد ہو جائے
زخاکِ او بروید آرزو ہا
تو اس کی خاک سے آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں
خودی از آرزو شمشیر گردد
خودی آرزو ہی سے ایک تیز تلوار بنتی ہے
دمِ او رنگ ہا بُرّد زبُو ہا (ارمغانِ حجاز)
اور اس کی دھار خوشبوؤں سے بھی رنگ اخذ کرتی ہے

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجاست!
ہمارے سینے میں سوزِ آرزو کہاں سے آ گیا
سبو ز ماست، ولے بادہ در سبو ز کجاست؟ (زبورِ عجم)
پیالہ تو بیشک ہمارا ہے مگر پیالے میں شراب کہاں سے آئی

نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
نہ تو کسی جبریل، کسی فردوس، کسی حور اور کسی خدا میں وہ تڑپ ہے
کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزومندے (جاوید نامہ)
جو انسان کی اس کفِ خاک میں ہے جو ایک آرزومند کے سینے میں مضطرب ہے

گمان مبر کہ نصیبِ تو نیست جلوۂ دوست
یہ خیال نہ کر کہ تیری قسمت میں محبوب کا دیدار ہی نہیں
درونِ سینہ ہنوز آرزوئے تو خام است[1] (زبورِ عجم)
بلکہ یوں سمجھ کہ تیرے سینے میں آرزو ہی ابھی کچی ہے

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
تو مسلمان ہے اس لئے سینے کو ہمیشہ آرزو سے آباد رکھ
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار
اور ہر گھڑی اپنے پیشِ نظر یہ فرمان رکھ کہ خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (بانگِ درا)

---

[1] اسی مفہوم میں علامہ اقبال کا ایک اردو شعر ہے:۔
نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا (بانگ درا)

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (بالِ جبریل)

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

مندرجہ بالا کلامِ اقبال میں آپ نے "مقصد" یا "نصب العین" کے تقدس اور عظمت و سطوت کا تذکرہ ملاحظہ فرما لیا اور اس کا حاصل و مدعا یہ ہے کہ مقصد انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نہایت مفید ہو، تعمیری ہو، تغیر خیز ہو، مبنی بر توحید و شریعت ہو، غارتگرِ باطل ہو اور فروغِ حق کے لئے سراپا محشر ہو۔

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ ماسوا را آتشِ سوزندۂ
ایک ایسا مقصد جو صبح کی مانند روشن ہو اور غیر اللہ کو آگ کی طرح جلا کر راکھ کر دے

مقصدے از آسماں بالاترے دلربائے دلستانے دلبرے
ایک ایسا مقصد جو آسمان سے بھی بلند تر ہو وہ دلربا ہو، دلستان ہو اور دلبر ہو

باطلِ دیرینہ را غارت گرے فتنہ در جیبے سراپا محشرے
ایسا مقصد جو پرانے نظامِ باطل کو تباہ کر دے اس کے جیب میں فتنے ہوں اور وہ خود سراپا حشر

ظاہر ہے کہ بالخصوص ایک مردِ مومن، مردِ موحد اور مردِ حق پرست کا مقصد ایسا ہی شاندار اور بلند و ذی وقار ہوگا اور اگرچہ یہ مقصد لفظاً ہر دینی نہیں بلکہ "دنیوی" ہی

کیوں نہ ہو، لیکن مومن اپنے اخلاص اور حسنِ نیت سے اس کو بھی دینی سعادتوں سے مالامال کر لیتا ہے۔ بلکہ بالفاظِ دیگر یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ مومن کا ہر عزم، ہر عمل اور ہر مقصد ہمیشہ آئینِ شریعت از تعلیماتِ دینِ حق ہی پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردِ خود آگاہ جب نظامِ باطل اور پیروانِ باطل سے بھی متصادم ہوتا ہے تو اس سامانِ ضرر میں سے بھی بے نہایت منفعت کی راہ پیدا کر لیتا ہے۔

بندۂ کز خویشتن دارد خبر | آفریند منفعت را از ضرر
وہ شخص جو اپنی ذات سے باخبر ہے | وہ نقصان میں سے بھی فائدے کی صورت پیدا کرتا ہے
بزم با دیو است آدم را وبال | رزم با دیو است آدم را جمال
ابلیس کے ساتھ ربط (مجلس آرائی) انسان کیلئے تباہ کن ہے | لیکن اس کے ساتھ جنگ و تصادم انسان کیلئے وجہ ترقی ہے
خویش را بر اہرمن باید زدن | تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن
لہٰذا خود کو شیطان پر دے مارنا چاہیئے | تُو سراپا تیغ ہے اور وہ سراپا سنگِ فسن
تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت | ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت
تو تیز تر ہو جا تا کہ تیری چوٹ بھی سخت پڑے | ورنہ تو دونوں جہان میں محروم و بدبخت ہوگا

ضرورتِ جستجو پھر مندرجہ منظومات میں تخلیقِ مقاصد کے ساتھ ہی ساتھ "آرزو" کے جو عملی، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی فوائد بیان کئے گئے ان پر بھی خاص توجہ سے غور فرمائیے۔ مفاداتِ آرزو کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ وہ آپ کو سراپا ایمان و یقین، امید و عزم، ہمت و جرأت اور پیکرِ تسخیر و عمل بنا دیتی ہے بخلاف اس کے مایوسی (جو آرزو کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے) آپ کے دل و دماغ پر شکوک و شبہات، خوف و ہیبت، تذبذب اور خدشۂ شکست و نامرادی کے پہاڑ لا پھینکتی ہے۔

اس موضوع کے تحت علامہ اقبال کے فہمِ ربانی اور عقلِ یزدانی کا ایک خاص معجزہ یہ ہے کہ وہ اس آرزو کو "آرزو" ہی تسلیم نہیں کرتے جو "جستجو" سے بیگانہ و محروم رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر اچھی اور صحت مند آرزو کو جلد از جلد پوری قوت سے عمل میں آنا چاہیئے ورنہ وہ نتیجہ کار ایک خواب یا واہمہ بن کر رہ جائے گی اور اپنے عامل کے لئے کسی لحاظ سے مفید و کار آمد ہونے کی بجائے ایک روحانی اور ذہنی بیماری ثابت ہوگی۔ ان کے نزدیک جو آرزو ثمر مندِ جستجو نہ ہو۔ یا اپنے مقصود و مدعا کی طرف ہمت و شجاعت اور سخت کوشی سے پرواز نہ کرے وہ ایسی ہے جیسے کوئی شخص موجِ سراب میں کشتی چلانے کی ٹھان لے، یا جیسے بجلی کڑکے اور چمکے تو سہی مگر بادلوں کے پسِ پردہ جہاں اس کی تجلی کسی آنکھ نے نہ دیکھی ہو۔

ترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر

مجھے خدشہ ہے کہ تو اپنی کشتی سراب میں چلا رہا ہے

زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر

اور کہ تو پیدا بھی زیر پردہ ہوا اور مرے گا بھی زیر پردہ

بر کشت و خیابان پیچ بر کوہ و بیابان پیچ

تو کھیتوں اور باغوں پر پیچ کھا اور پہاڑوں اور جنگلوں پر پیچ کھا

برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر (زبورِ عجم)

کیونکہ جو بجلی اپنے آپ میں پیچ کھاتی رہتی ہے وہ بادلوں کے پیچھے ہی مرجاتی ہے"

زندہ و بیدار افراد و اقوام کا خاصہ تو یہ ہے کہ وہ زندگی کا جو مقصد متعین کرتے ہیں اور جس شئے کے لئے محوِ آرزو ہوتے ہیں، بذریعہ "جستجو" ہر قیمت پر اسے حاصل و مسخر کر کے رہتے ہیں۔ اور سوال تو یہ ہے کہ جس "آرزو" کو عزم و ہمت سے "جستجو" میں منتقل نہ کیا جائے، اسے دل میں پیدا ہی کیوں کیا جائے؟ محض افسوس و افسردگی کے لئے؟ ذہنی کوفت اور انتشارِ طبع کے لئے؟

ـــ یہ تو دیدہ و دانستہ اپنی جان پر ناقابلِ عفو ظلم کرنا ہے اور فطرت کے ساتھ ایک ذلیل مکر و فریب! جس کی سزا صاحبِ آرزو کو بری طرح بھگتنی ہوگی۔

بہرکیف "آرزو" کے عنوان پر کلامِ اقبال مطالعہ کر لینے کے بعد اب "جستجو" کے موضوع پر بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ اس بحث کا حقیقی مفاد یہ ہے کہ آرزو اور جستجو عملاً اور علماً لازم و ملزوم اور ناقابلِ تقسیم چیزیں ہیں۔ آپ انہیں زندگی کے کسی قدم پر ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کی "آرزو" بھی معطل و لاحاصل رہے گی، اور "جستجو" تو آرزو کے بغیر کوئی مفہوم و وجود ہی نہیں رکھتی۔

علم و حکمت کشفِ اسرار است و بس ‎ ‎ حکمتِ بے جستجو خوار است و بس

علم و حکمت کا مقصد حقیقی اسرارِ ہستی کا انکشاف ہے ‎ ‎ اور وہ حکمت جو بے جستجو رہ جائے خوار و نامراد ہے

زندگی ہر جا کہ باشد جستجو است ‎ ‎ حل نہ شد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

زندگی جہاں کہیں بھی ہو وہ سراپا جستجو ہے ‎ ‎ اور یہ نکتہ حل نہ ہوا کہ شکار میں ہوں یا وہ ہے

اے مسافر جاں بمیرد از مقام ‎ ‎ زندہ تر گردد ز پروازِ مدام

اے مسافر! ایک جگہ قیام سے روح مر جاتی ہے ‎ ‎ اور وہ دائمی پرواز ہی سے زندہ تر ہوتی ہے

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب

صاحبِ قرآن ہو کر بھی تو ذوقِ جستجو سے محروم ہے؟

العجب ثم العجب ثم العجب! (جاوید نامہ)

تعجب ہے، پھر تعجب ہے اور پھر تعجب ہے

نہ من انجام و نے آغاز جویم

میں نہ تو دنیا کا انجام ڈھونڈتا ہوں اور نہ آغاز

ہمہ رازم جہانِ راز جویم
میں تو سراپا راز ہوں، اس لئے دنیائے راز کا متلاشی ہوں
گر از روئے حقیقت پردہ گیرند
اگر قدرت حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا بھی دے
ہماں بوک و مگر را باز جویم (پیامِ مشرق)
تو میں عالم مجاز کے وہی شکوک و شبہات تلاش کروں گا

ہمہ سوزِ ناتمامم ، ہمہ دردِ آرزویم
میں سرتا پا سوزِ ناتمام اور دردِ آرزو ہوں
بگماں دہم یقیں را کہ شہیدِ جستجویم (پیامِ مشرق)
مجھے شک اور یقین کی یہی قسم کہ میں شہیدِ جستجو ہوں

گرد رہیم ولے ذوقِ طلب جوہرِ ماست
اگرچہ ہم گردِ راہ ہیں لیکن ذوقِ جستجو ہمارا جوہرِ زندگی ہے
بندگی باہمہ جبروتِ خدائی مفروش (پیامِ مشرق)
لہذا اپنے سوز و اضطرابِ بندگی کو شانِ خدائی کے عوض بھی مت بیچ
منم کہ طوفِ حرم کردہ ام بتے بہ کنار
میں ہی ہوں جس نے بت آغوش میں لے کر طوافِ کعبہ کیا ہے
منم کہ پیشِ بتاں نعرہ ہائے ہو زدہ ام
اور میں ہی ہوں جس نے ان بتوں کے سامنے نعرۂ توحید لگایا ہے

دلم ہنوز تقاضائے جستجو دارد
باایں ہمہ میرا دل اب بھی جستجو کا تقاضا کر رہا ہے
قدم بہ جادۂ باریک تر ز موزدہ ام (پیامِ مشرق)
میں نے بال سے بھی باریک تر راستے پر اپنا قدم رکھا ہے

نداند جبرئیل ایں ہائے و ہو را
پروردگارا جبرئیل تو ہمارے سوزِ درد و فراق کا رازدار نہیں
کہ نشناسد مقامِ جستجو را
کیونکہ وہ تلاش و جستجو کا مقام پہچانتا ہی نہیں
بپرس از بندۂ بیچارۂ خویش
یہ مرتبہ تو اپنے بندۂ عاجز و بیچارہ سے پوچھ
کہ داند نیش و نوشِ آرزو را (پیامِ مشرق)
کیونکہ وہی آرزو کے کڑوے میٹھے کا اندازہ رکھتا ہے

خنک آں ملّتے بر خود رسیدہ
مبارک ہے وہ قوم جس نے اپنا مقام پہچان لیا
ز دردِ جستجو نا آرمیدہ
اور جو دردِ تحقیق و جستجو سے بے چین رہتی ہے
درخشِ او بنرِ ایں نیلگوں چرخ
اس نیلے آسمان کے نیچے اس قوم کی چمک دمک ایسی ہے

چو تیغے از میاں بیروں کشیدہ (ارمغان حجاز)

جیسے نیام سے نکلی تلوار باہر کھینچ لی جائے

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ماکفِ خاکیم

میں نے یہ مانا کہ دنیا خاک ہے اور ہم ایک کف خاک

بہ ذرّہ ذرّۂ ما دردِ جستجو ز کجاست؟

لیکن ہمارے ذرے ذرے میں دردِ جستجو کہاں سے آیا؟

نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد

ہماری متلاشی نگاہ جو کہکشاں کے گریبان پر پڑتی ہے

جنونِ ما ز کجا، شورِ ہائے و ہو ز کجاست؟

تو ہمارا یہ جنون کہاں سے آیا اور شورِ ہائے و ہو کہاں سے ہے؟

سوز و گدازِ زندگی لذّتِ جستجوئے تو

اے محبوبِ حقیقی! زندگی کا سوز و گداز صرف تیری جستجو ہے

راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو

اگر میں تیری طرف نہ چلوں تو راستہ بھی مجھے سانپ کی طرح ڈستا ہے

اقبالؒ کا فلسفۂ ہجر

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذّتِ طلب!

اقبالؔ

اقبالؒ کا فلسفۂ ہجر

علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں اکثر جگہ "ہجر" یا "فراق" کی پے در پے تعریف کی ہے اور وصل کی مذمت۔ مفصل اور سیر حاصل مثالیں تو میں بعد میں پیش کروں گا۔ لیکن فی الحال تشریحِ مفہوم و مقصد کے لئے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:۔

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذّتِ طلب
گرمیِ آمدہ فراق، شورشِ ہائے و ہُو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

بہر کیف ثابت یہ ہوا کہ اپنے نصب العین یا مقصود و مطلوب سے جدا رہنے میں "لذّتِ طلب" یا "ذوقِ جستجو" برقرار رہتا ہے، انسان وقفِ جد وجہد رہتا ہے اور اس کے حواس پر کسی قسم کا سکون و جمود یا تعطّل طاری نہیں ہوتا:۔ انسانی طبیعت پر ہجر و فراق کا اثر تو اس قدر حیات افروز اور ولولہ انگیز ہے، لیکن بخلاف اس کے وصل "مرگِ آرزو" اور افسردگیِ جذبات و احساسات کا باعث ہے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔

کہ مطلوب کو پاتے ہی جذبۂ طلب از خود فنا ہو جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے مخصوص بلیغ و نفسیاتی انداز میں جذباتِ انسانی کے اسی لطیف نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں!

موجِ محیطِ آب میں اس بنا پر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے (یعنی مضطرب اور رواں و دواں ہے) کہ وہ ہنوز آغوشِ طوفان میں ہے اور سکون و جمودِ ساحل سے دور۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ساحل سے "واصل" ہو جائے تو اس کا اضطراب فنا اور اس کی دوڑ دھوپ ختم ہو جائے اور بقولِ غالبؔ اس سے زیادہ عبرت انگیز "زوالِ شوق" اور کیا ہوگا؟ —— آغوشِ ساحل میں تو آسودگی ہی آسودگی ہے اور ایسی آسودگی کا دوسرا نام ہے موت:۔

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست
ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نہ گیریم

اسی مفہوم کے پیشِ نظر علامہ اقبالؔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
گرے پڑے ساحل نے کہا کہ اگرچہ میں کافی عرصہ زندہ رہا۔
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
مگر آہ! مجھے اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ میں کیا ہوں
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
اس پر ایک مستِ رفتار موج تیزی سے چلی اور کہا
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم (پیامِ مشرق)
اگر میں چلتی رہوں تو موجود ہوں، اور نہ چلوں تو معدوم

الغرض یہی موج ہے کہ جب تک آبشاروں، پہاڑی ندیوں، نالوں، دریاؤں اور طوفان خیز سمندروں کے تلاطم میں آزادانہ کھیلتی ہے، تب تک زندہ ہے، موجود و مشہود ہے، رواں دواں ہے، افتاں وخیزاں ہے، سینہ سپر ہے، نغمہ خواں ہے، غرّاں ہے، کف بدہن ہے، خوفناک ہے، غالب وقاہر ہے، لیکن جونہی وہ کہیں آسودہ وساکن ہوتی ہے، وہ نہ صرف معدوم و نامشہود ہو کر رہ جاتی ہے، بلکہ اپنے گل میں مدغم ہو کر (۱) اس کا رنگ بگڑ جاتا ہے (۲) ذائقہ خراب ہو جاتا ہے اور (۳) اس سے بدبو آنے لگتی ہے۔ الغرض اس کا پانی پینے یا کسی اور صحت مند استعمال کے لئے بھی موزوں نہیں رہتا۔ یہ سب کچھ کس شئے کا وبال ہے؟ — آسودگیِ وصل کا!

اسی طرح ایک راہگیر جب تک منزل سے دور ہے، راستے کے مصائب و خطرات، شکستگی اور کوفت کے باوجود گرتا پڑتا منزل کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جونہی منزل کا "فراق" ختم ہوا اور اس سے "وصل کی نوبت آئی" تمام سلسلہ جد و جہد اور جذبۂ عزم و استقلال از خود فنا ہو گیا۔

زجوئے کہکشاں بگذر، زنیلِ آسماں بگذر
بمیرد دل زمنزل، اگرچہ باشد منزلِ ماہے! (زبورِ عجم)

ترجمہ:۔ کہکشاں کی ندی کو بھی عبور کر جا اور آسمان کے دریائے نیل سے بھی پار گذر جا، دل کسی منزل پر قرار پکڑنے سے مر جاتا ہے۔ اگرچہ وہ چاند کی منزل ہی کیوں نہ ہو۔"

اسی قیاس پر جب تک عاشق اپنے معشوق سے دور و مہجور رہے، آہ و نالہ بھی ہے، گریہ وزاری بھی ہے، اضطراب و بے قراری بھی ہے، شب بیداری بھی ہے، شکوۂ ہجراں بھی ہے، درد بھرے نغمے بھی ہیں، سوزِ آرزو بھی ہے، ذوقِ جستجو بھی ہے، اور لذّتِ طلب بھی، لیکن جونہی وہ محبوب سے واصل ہوا، تمام مذکورہ تاثراتِ ہجر و فراق فی الفور

محو و نابود ہو گئے اور ان کی جگہ سکون و جمود طاری ہو گیا۔ جذبات و احساسات افسردہ ہو گئے اور سوز و سازِ اضطراب یکسر فنا ہو گیا۔ یہی وہ عبرت انگیز کیفیت ہے جس پہ شاعر بے اختیار چلا اٹھا۔

وصل سے ہو گیا تھا افسردہ — دل کو پھر بے قرار کرنے دے
پھر بپا کر جگر میں دردِ فراق — پھر مجھے انتظار کرنے دے
آ، تصور کی بزم پر چھا جا! — پھر نظر کو بہار کرنے دے

رنگِ ہجراں سے پھر بنا وہ نقش!
وقت کو یادگار کرنے دے

جب "معشوقِ مجازی" کے متعلق عاشق کا دردِ فراق اپنے اندر اس قدر گونا گوں ہنگامہ پرور اور لذت افزا کیفیات رکھتا ہے۔ تو اس "معشوقِ حقیقی" (ذاتِ باری تعالیٰ) کے حقوق میں اس کی روحانی و باطنی کیفیات کس قدر ولولہ انگیز، پُر اضطراب، محرکِ عمل اور حیات افروز ہوں گی جو روزِ ازل سے "عشق" کا منبع و مخزن واقع ہوا ہے؟ — سوز و دردِ ہجراں کا یہ بلند و ممتاز مقام تو صرف آدمِ خاکی کو نصیب ہوا ہے، اور اس کی لذتِ اضطراب کو دیکھ کر "نوریانِ آسماں پرواز" بھی جذبۂ رشک سے بے چین ہو جاتے ہیں۔ پس انسان کے احساسِ ہجر و فراق کا یہ وہ بلند ترین اور مقدس ترین مرکز و مرجع ہے جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؔ نے بجا طور پر جبریل کو یہ فخریہ پیغام بھیجا:۔

بگو جبریل را از من پیامے
مرا آں پیکرِ نوری ندادند
ولے تاب و تبِ ما خاکیاں بیں
بنوری ذوقِ مہجوری ندادند! (پیامِ مشرق)

ترجمہ: "میری طرف سے جبریل کو یہ پیغام پہنچا دے۔ کہ اگرچہ مجھے خدا نے تجھ جیسا پیکرِ نوری نہیں دیا، تاہم ان خاکیوں کا سوز و اضطراب تو دیکھ بھلا نوری کو یہ دردِ مہجوری کہاں نصیب ہے۔"

اور اسی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک اور جگہ فرمایا:۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

"سوز و دردِ آرزو مندی" جبھی تو برقرار رہے گا کہ اس کی تہ میں "غمِ فراق" کارفرما ہو۔ ٹیگور اسی "دردِ فراق" کے متعلق اپنے مخصوص ادبی، وجدانی اور پُر ترنم انداز بیان میں کہتا ہے:۔

"یہ دردِ فراق ہی ہے جو تمام عالم میں بسیط ہے اور جس سے بے شمار شکلیں غیر محدود آسمان میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی غمِ جدائی ہے، جو تمام رات ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک خاموشی سے تکا کرتا ہے اور جولائی کی بارانِ تاریکی میں سرسرانے والی پتیوں کے درمیان ترنم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی پھیلا ہوا درد ہے جو عمیق ہو کر محبتوں اور آرزوؤں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسانی مسکن میں تکلیف و مسرت بن جاتا ہے اور یہی درد ہے۔ جو شاعر کے دل سے نکل کر گدازِ لحن و رقت نغمہ بن جاتا ہے"[1]

"جب آفرینش نئی نئی تھی اور ستارے اپنی پہلی روشنی میں تھے۔ رشیوں نے

---

[1] گیتان جلی۔

آسمان پر جلسہ کیا اور سب نے مل کر گایا کہ " واہ ری تصویرِ کمال! واہ ری تسکینِ وصل! اور واہ ری مسرّتِ غیر ناقص!" لیکن ان میں سے ایک دفعتہً پکار اٹھا " معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زنجیرِ ضیا میں کہیں شکست ہے، اور ان تاروں میں سے کوئی تارا کھو گیا ہے!"

اتنے میں بربط کا زرّیں تار اتر گیا، گانا بند ہو گیا اور وہ سب کے سب چلا اٹھے کہ " ہاں، ہاں ضائع شدہ تارا سب سے اچھا تھا، اور وہی تمام آسمانوں کی رونق تھا!" اس دن سے اس کی تلاش جاری ہے اور اک شور یہاں سے وہاں تک بلند ہے کہ " دنیا نے اس تارے میں اپنی ایک مسرّت کھو دی!"

صرف رات کی گہری خاموشی میں ستارے مسکراتے ہیں اور باہم سرگوشیاں کرتے ہیں کہ " یہ جستجو بیکار ہے۔ ورنہ فراق اور غیر منقطع تکمیل تو کائنات میں ہر جگہ ہے اور اگر غمِ جدائی نہ ہو تو خدا کی مخلوق " لطفِ خرام " کہاں سے پائے؟[۱]

شوپن ہار اسی فلسفۂ ہجر و فراق کو قدرے نفسیاتی انداز میں یوں بیان کرتا ہے:-

" ہم جو کچھ کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ وہ جلد ختم ہو جائے۔ ہم کام کر کے مسرّت و راحت حاصل کرنے کے لئے بے صبر ہوتے ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری تمثیلِ کردار کا یہ آخری منظر جتنا دور ہو سکے، اتنا ہی اچھا ہے اور پردۂ اختتامی جتنی زیادہ دیر میں گر سکے، بہتر ہے۔"

کلامِ اقبال ذیل میں ہجر و فراق کے عنوان پر کلامِ اقبال پیش کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ بحث کی روشنی میں آپ اس کے

---

[۱] گیتان جلی۔

حقیقی مفہوم و مقصد پر خود غور فرمائیں:۔

این دلِ مجبورِ ما مجبور نیست | ناوکِ ما از نگاہِ حور نیست
ہمارا دل مجبور ہونے کے باوجود مجبور نہیں ہے | اور نگاہ حور ہمارے لئے تیر نہیں بن سکتی

آتشِ ما را بیفزاید فراق | جانِ ما را سازگار آید فراق
ہماری آتش عشق کو فراق تیز تر کر دیتا ہے | اور فراق ہماری قوت روح کو بہت سازگا ہے

بے خلش ہا زیستن نا زیستن | باید آتش در تہ پا زیستن
خلش ہجر کے بغیر جینا تو جینا ہی نہیں ہے | بلکہ اضطراب فراق ہی ہیں جینا چاہیئے۔

زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است | از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است
اس انداز کی زندگی ہی تقدیر خودی ہے | اور اسی تقدیر سے خودی کی تعمیر ہے

ذرّہ از شوقِ بے حد رشکِ مہر | گنجد اندر سینۂ او نہ سپہر
ایک ذرہ شوق بے حد سے رشک آفتاب بن جاتا ہے | اور اس کے سینے میں نو آسمان سما جاتے ہیں

شوق چوں بر عالمے شبخوں زند
جب عشق کسی دنیا پر حملہ آور ہوتا ہے۔
آنیاں را جاودانی می کند (جاوید نامہ)
تو وہ فانی چیزوں کو جاودانی کر دیتا ہے

جدائی خاک را بخشد نگا ہے | دہد سرمایۂ کوہے بکا ہے
جدائی خاک کو بھی نگاہ روشنی عطا کرتی ہے | اور گھاس کے تنکے کو بھی پہاڑ کا ہم وزن کر دیتی ہے

جدائی عشق را آئینہ دار است | جدائی عاشقاں را سازگار است
جدائی جذبۂ عشق کی صحیح آئینہ دار ہے | اور جدائی عاشقوں کو بہت سازگار ہے

اگر ما زندہ ایم از دردمندی است   وگر پائندہ ایم از دردمندی است

اگر ہم زندہ ہیں تو یہ فراق کی دردمندی سے ہے   اور اگر پائندہ ہیں تو یہ بھی فراق کی دردمندی سے ہے

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد

دردِ فراق سے تڑپتے رہنے اور وصل نہ ہونے میں کیا لطف ہے

خوشا کسے کہ بدنبالِ محمل است ہنوز (زبورِ عجم)

مبارک ہے وہ شخص جو ابھی محمل کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے

دہد آتشِ جدائی شررِ مرا نمودے

آتش جدائی ہی میرے شرر کو فروغ و نمود عطا کرتی ہے ۔

بہ ہماں نفس بمیرم کہ فرو نشانم او را (زبورِ عجم)

جب میں اس آتش جدائی کو بجھا دوں تو یہ گویا میری موت ہے

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصال

تو ابھی یہ نکتہ نہیں سمجھا کہ شوق وصل سے مردہ ہو جاتا ہے

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام (زبورِ عجم)

ایک دائمی زندگی کا راز کیا ہے؟ ناتمام حالت میں جلتے رہنا!

اگر نہ بوالہوسی با تو نکتۂ گویم

اگر تو بندہ ہوس نہیں تو میں تجھے ایک نکتہ بتاتا ہوں

کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است (پیام مشرق)

وہ یہ کہ عشق فریاد بے اثر سے پختہ تر ہوتا ہے۔

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی

میں خوش ہوں کہ تو نے عاشقوں کو ایک دائمی سوز عطا فرمایا

درماں نیافریدی آزارِ جستجو را (پیام مشرق)

اور درد جستجو کے لیے کوئی دوا (وصل) پیدا ہی نہیں کی

جدائی شوق را روشن بصر کرد

جدائی ہی نے عشق کی آنکھوں کو نور عطا کیا

جدائی شوق را جوئندہ تر کرد

اور جدائی نے عشق کو تلاش و جستجو کا ذوق دیا

نمی دانم کہ احوالِ تو چون است

میں نہیں جانتا کہ تیری حالت و کیفیت کیا ہے۔

مرا ایں آب و گِل از من خبر کرد (پیام مشرق)

لیکن میرے آب و گل (وجود) نے مجھے مجھ سے باخبر کر دیا

گرمیٔ آرزو فراق

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذّتِ طلب
عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب
گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہُو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

کوششِ ناتمام

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح
چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے
رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیٔ شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے
کہتا تھا قطبِ آسماں قافلۂ نجوم سے
ہمرہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لیے
سوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لیے

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے
رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے (بانگ درا)

جُدائی

سُورج بُنتا ہے تارِ زر سے دنیا کے لئے ردائے نوری
عالم ہے خموش و مست گویا ہر شے کو نصیب ہے حضوری
دریا، کہسار، چاند، تارے کیا جانیں فراق و ناصبوری
شایاں ہے مجھے غمِ جدائی
یہ خاک ہے محرمِ جدائی (بالِ جبریل)

گذشتہ صفحات میں عیش و آرامِ وصل کی جس قدر تردید و مذمت اور اضطرابِ ہجر و فراق کی جس قدر مدح و توصیف آپ نے ملاحظہ فرمائی، اس کے تمام منطقی نفسیاتی اور فلسفیانہ نکات و حکم کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی علم، کسی ہنر، کسی فن، کسی تحقیق و جستجو، کسی تجربہ، کسی مہم اور کسی مقصدِ زندگی میں بھی تکمیل و اتمام (وصل) کا دعویٰ کر کے اس سلسلے میں مزید محنت و مشقت اور تحقیق و جستجو سے (جو سراسر "احساسِ ہجر" پر مبنی ہے) دستبردار ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ دراصل زندگی کے کسی بھی نصب العین میں "تکمیل و اتمام" کا اعتقاد پستیِ ہمت، سستیِ عناصر اور کوتاہیِ نظر کی دلیل ہے۔ یہ اعتقاد نہ صرف انسان کو مزید ترقی و پیش قدمی سے مانع ہے، بلکہ اس کے ساتھ روحانی

فکری اور عملی زوال و انحطاط کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی فطرتاً اور طبعاً سخت کوشی اور تیز رفتاری کی خواہاں ہے، نہ کہ "منزل" کی۔ وہ باطنی طور پر ہمہ وقت وقفِ پرواز ہے اور "آشیانہ" اس کے مزاجِ ارتقا کو راس نہیں آتا۔ پس جب قدرت کا قانونِ ارتقا ایک اٹل چیز ہے اور اس کے نفاذ و عمل کو دنیا کی کوئی قوت روک نہیں سکتی تو پھر زندگی کی بنیاد بھی "سکونِ وصل" پر نہیں بلکہ "اضطرابِ ہجر" پر رکھی گئی ہے اور اس اضطرابِ مسلسل کے تقاضے سے وہ قدرتی طور پر یہ کوشش کرتی ہے کہ اس کا آج گذشتہ کل سے اور اس کا آئندہ کل آج سے بلند و روشن تر ہو، اور زندگی کی قوتِ تسخیر" کا ایک زندہ ثبوت! — چنانچہ علامہ اقبالؔ نے مندرجہ ذیل قطعہ میں زندگی کا یہی قانونِ ارتقاء بیان فرمایا:۔

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد

زندگی ہر لحہ ایک نیا اور تازہ نقش بناتی ہے

بیک صورت قرارِ زندگی نیست

اور وہ (ارتقا کے تقاضوں سے) ایک صورت پر قرار نہیں پکڑتی

اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است

پس اگر تیرا آج تیرے گذشتہ کل سے مساوی و مشابہ ہو

بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست (پیامِ مشرق)

تو سمجھ لے کہ تیری خاکِ جسد میں کوئی شرارِ زندگی نہیں

ظاہر ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ "نقش ہائے تازہ" بھی تو صرف اس صورت میں بنائے جا سکتے ہیں، جبکہ انسان کسی بھی شغل و مقصد میں تکمیل "(وصل)" کا اعتقاد نہ رکھے، بلکہ خود کو اپنے مطمعِ نظر یا "منزل" سے دور (مہجور) سمجھتے ہوئے

اپنی متعین راہ پر مزید محنت و مشقت اور تحقیق و جستجو کرتا رہے۔ گویا:۔

مگو از مدعا[1] ئے زندگانی

تو زندگی کے تکمیل مقصد (انتہا) پر گفتگو نہ چھیڑ

ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست

کیونکہ تو زندگی کے اصول و انداز کا راز دار نہیں

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم

میں تو ذوقِ سفر سے اس حد تک مست ہو رہا ہوں

کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست (پیامِ مشرق)

کہ منزل میرے سامنے ایک سنگ راہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

مجو پایاں کہ پایانے نداری
اپنے عمل کی انتہا نہ ڈھونڈ کیونکہ تو انتہا نہیں رکھتا

بپایاں تا رسی جانے نداری
جب تو انتہا (منزل) کو پہنچے گا تو تجھ میں جان نہیں رہیگی

نہ مارا پختہ پنداری کہ خامیم
ہمیں پختہ نہ سمجھ، کیونکہ ہم ابھی خام ہیں

بہر منزل تمام و ناتمامیم
ہم ہر منزل پر مکمل بھی ہیں اور نامکمل بھی

بپایاں نارسیدن زندگانی است
انتہا (منزل) کو نہ پہنچنا ہی زندگانی ہے

سفر مارا حیاتِ جاودانی است
سفر ہمارے لئے ایک حیات جاوداں ہے

ز ماہی تا بمہ جولانگہِ ما
مچھلی سے لیکر چاند تک تمام کائنات ہماری جولانگاہ ہے

مکان و ہم زماں گردِ رہِ ما
اور مکان و زمان ہر دو ہمارے راستے کی گرد ہیں

---

[1] یہاں "مدعا" سے مراد ہے "تکمیلِ مدعا" یا "منزل"

بخود پیچیم و بے تاب نمودیم

ہم اپنے آپ ہیں پیچ کھاتے ہیں اور نمود (اظہار) کیلئے بے چین ہیں

کہ ما موجیم و از قعرِ وجودیم (زبورِ عجم)

کیونکہ ہم کائنات کی گہرائی میں سے ایک موج ہیں

پس دنیا کی جو قومیں "منزل" یا "تکمیل" کے تصور سے بالاتر رہتی ہیں، راہِ عمل میں شب و روز ساعی ہیں اور سرچشمۂ تحقیق و جستجو سے سیراب ہو کر بھی جن کی تشنگی میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، مختلف علوم و فنون میں ان کی ترقی و توانائی کسی سے مخفی نہیں۔ علاوہ ازیں عناصرِ قدرت اور مادیات سے انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں جو فائدہ اٹھایا ہے، وہ سب پر ظاہر و باہر ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ[1] خدا کی طرف سے نوعِ انسانی کے لئے ایک قانونِ جزا ہے، جس میں وہ مومن اور کافر کی قطعاً تخصیص نہیں کرتا۔ زندگی میں جو بھی جتنی کوشش کرے گا وہ اپنی کوشش کا پھل پائے گا۔ اب سوال تو یہ ہے کہ خاص طور پر مسلمان نے دیگر قوموں کی ترقی و پیش قدمی سے کیا سبق سیکھا؟ اصولِ فطرت، قوانینِ شریعت اور نوامیسِ الٰہی کا امانتدار ہو کر اس نے جد و جہد، تحقیق و جستجو اور تسخیرِ عناصرِ کائنات میں کس قدر سعی و محنت کا مظاہرہ کیا؟ —— یہ چیز تو بقولِ اقبال ممکن تھی شعورِ ہجر و فراق سے، لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ بیچارہ جاہل و سادہ لوح اور بر خود غلط مسلمان ایک دائمی خوش فہمی کے تحت خود کو تمام اجزائے کائنات سے، مقاصدِ حیات سے، عیش و آرامِ عقبیٰ سے، رحمت و شفاعتِ رسول سے، حتیٰ کہ اپنے خالق و مالک سے بھی اس قدر "قریب و واصل" سمجھتا ہے

---

[1] انسان کو صرف وہی کچھ ملے گا جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

کہ کسی نیکی کے بغیر بھی اس غفور الرحیم کا لطف و کرم اسے نجات کا سرٹیفکیٹ عطا فرما کر بہشت بریں میں بلا روک ٹوک داخل کر دے گا۔

بہشتے بہر پاکانِ حرم ہست
ایک بہشت تو اللہ کے پاک اور فرمانبردار بندوں کے لئے ہے
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
اور ایک بہشت محنتی اور صاحب ہمت لوگوں کے لئے ہے
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
ہندی مسلمان سے کہہ دو کہ مست اور خوش و خرم رہ
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست (ارمغان حجاز)
کیونکہ ایک بہشت ایسا بھی ہے جو بالکل مفت ملتا ہے

پس یہ صورتِ حال پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں مسلمان سے کہنا ہے تو صرف اس قدر کہنا ہے کہ اے حضرت! آپ زندگی کے ہر شعبے میں ضرورت سے زیادہ لطف اندوزِ "وصل" ہو رہے ہیں، اگر ایک آزاد و مختار قوم کی صفات پیدا کرنا ہیں اور خدا کی کائنات سے کوئی ٹھوس اور مستقل فائدہ اٹھانا ہے تو ذرا "ہجر و فراق" کا شعور پیدا کیجئے اور راہِ زندگی میں محنت و مشقت اور تحقیق و جستجو کی زحمت گوارا فرمائیے اور یوں بھی آپ کم از کم خدا کا یہ ازلی قانون تو جانتے ہی ہیں کہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ (۱۳ : ۱۱)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلا کرتا تاوقتیکہ افراد خود اپنی حالت کو بدلنے (اصلاح پذیر کرنے) کی کوشش نہ کریں۔

اقبالؒ کا فلسفۂ خطر

خطر تاب و تواں را امتحان است

عیارِ ممکناتِ جسم و جان است!

اقبال

اقبالؒ کا فلسفۂ خطر

اس عنوان کے تحت تعلیماتِ اقبالؒ کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

یعنی "اگر تو کامیاب زندگی چاہتا ہے تو خطرات کے ماحول میں زندگی بسر کر!" سبحان اللہ! چند بلیغ الفاظ میں فروغِ حیات، جوشِ کار اور جد و جہد کا کتنا عظیم الشان درس دیا گیا ہے۔ انسانی لائحۂ عمل اور عزائم و اقدامات سے "ذوقِ خطر" کو خارج کر دیجئے اور پھر دیکھئے کہ حواس و قویٰ پر کس قدر مرگ آفریں تعطل طاری ہوتا ہے اور قلب و دماغ پر یاس و اندوہ کے کیسے تاریک و منحوس بادل چھاتے ہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی فقدانِ خطر اور خواہشِ راحت و سکون کے کم از کم تاثرات یہ ہوں گے کہ دل میں امید و یقین کی جھلک تک نہیں رہے گی۔ جذبۂ آرزو سرد پڑ جائے گا۔ ہر روشن چیز بھی تاریک دکھائی دے گی۔ اسبابِ کامیابی و کامرانی میں بھی ناکامی کی بھیانک صورت دکھائی دے گی، حواس مغلوب و منفعل رہیں گے۔ نامساعد حالات سے قوتِ مقاومت فنا ہو جائے گی، کچھ موہوم سے خطرات و خدشات انسان کو ہراساں کرتے رہیں گے اور اس طرح

معاشرہ کا ایک عضوِ معطل ہی نہیں بلکہ دوشِ ملّت پر ایک ناروا بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وہ منحوس و نامبارک شخص ہے جسے اسلام "راہب" کہتا ہے اور جو اقبال کے الفاظ میں "ننگِ وجود" اور "ناسورِ جسمِ ملّت" ہے۔ رہبانیت کی یہ طرزِ عمل زندگی اور تمنیاتِ زندگی سے شرمناک گریز ہے اور اقبال اس گریز کا شدید دشمن ہے:-

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

پس علامہ اقبال اسی گریز و فرار کی پے در پے مذمت کرتے ہوئے ارتقائے ہر حیات کے لیے اس ذوقِ خطر اور عزمِ حوادث کی تلقین فرماتے ہیں جو انسان کو ہستی میں ایک بیباک مجاہد بنا دے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل کلام میں اس ذوقِ خطر باطل سوز برق و شرار ملاحظہ ہوں:-

ز قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور
یعنی مگرمچھوں کے قید و بند اور شکار کی داستانیں آ کر سنا
مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
اور یہ نہ کہہ کہ میری کشتی دریا کے طوفان سے شناسا ہی نہیں

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
اپنی محفل ساحل پر آراستہ نہ کر کیونکہ اس جگہ
نوائے زندگانی نرم خیز است
زندگی کی آواز نہایت مدھم اٹھتی ہے

بلکہ طوفان خیز دریا میں پھلانگ اور موجوں سے الجھ پڑ

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است!

کیونکہ غیر فانی زندگی صرف جنگ و تصادم میں ہے

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت

سکندر نے خضر سے کیسا عمدہ نکتہ بیان کیا

شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو!

کہ تو خشکی اور تری کے سوز و سازِ زندگی میں شریک ہو

تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی

تو زندگی کی جنگ میدان کے کنارے کھڑا دیکھ رہا ہے

بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو!

آ اور عرصۂ جنگ میں مر کر زندہ جاوید ہو جا

مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ

کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز

ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد!
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد!

پس یہی وہ ذوقِ خطر، جذبۂ عمل اور جرأتِ رندانہ ہے جس کے طفیل دنیا میں محیر العقول انقلابات رونما ہوئے ہیں اور تاریخ کا رُخ پلٹ گیا ہے۔ اگر انسان محض سوچ بچار، حزم و احتیاط اور "عقل" مصلحت اندیشیوں پر مدارِ کار رکھے، تو پھر نہ ذوقِ خطر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کوئی مستقل انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ یہ صرف عشق و جنون، جرأتِ رندانہ اور نتائج و عواقب سے بے نیاز اقدام خطرات ہے جو دنیا کی ہر مشکل کو آناً فاناً حل کرتا ہے اور نظامِ باطل کو ایک ہی ضربِ کاری سے زیروزبر کر دیتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

بیچاری عقلِ مصلحت اندیش کے پاس شکوک و شبہات تخمین و ظن اور خوفِ عواقب کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے:۔

عقل کو "تنقید" سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

لیکن بایں ہمہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "ذوقِ خطر" اور "عزمِ حوادث" کے فقدان کا حقیقی اور بنیادی سبب کیا ہے؟ —— جواب یہ ہے کہ "خوفِ خلق"

اور "خوفِ مرگ"

اور غور فرمائیے تو خوفِ مرگ کی اصل وجہ بھی "خوفِ خلق" ہی ہے، جسے قرآن "ضعفِ ایمان" پر محمول کرتا ہے اور نتیجۃً "شرک" کی صورت اختیار کرتے ہوئے تمام عقائد و ایمانیات کو کھوکھلا اور بے روح کر دیتا ہے بہرکیف "خوفِ خلق" کی نفی کرتے ہوئے تو صریحًا فرمایا:-

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(پ۴ - ع۹)

یہ (ایماندار) لوگ تو وہ ہیں جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مقابلے کے لئے (کافر و مشرک) لوگوں نے لشکر اور سامانِ جنگ جمع کیا ہے۔ اس لئے تم ان سے ڈر کر رہو۔ یہ سن کر ان کا ایمان اور بھی محکم و توانا ہو گیا اور وہ کہنے لگے ہمیں اللہ (کی مدد) ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے (پس جب وہ میدانِ جہاد میں گئے تو) پھر اللہ کی بہت سی نعمتیں (مالِ غنیمت) اور فتح و نصرت کے ساتھ واپس آئے اور انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ وہ اللہ کی رضا پر چلے اور اللہ بڑے فضل و کرم کا مالک ہے۔ یہ تو سراسر شیطان ہے۔ جو تمہیں اپنے دوستوں (اور مریدوں) سے ڈراتا ہے۔ اگر تم سچے مسلمان ہو تو ان سے ہرگز نہ ڈرو، بلکہ صرف مجھ سے ڈرو۔

اور پھر اس ضمن میں اللہ تعالےٰ اپنے سچے اور مخلص دوستوں کی سب سے بڑی علامت ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ خالقِ دوسرا کے علاوہ نہ تو مخلوق میں سے کسی چیز سے خائف و مرعوب ہوتے ہیں اور نہ موت سے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (پ ۱۱ - ع ۱۲)	خدا کے سچے دوستوں پر نہ تو مخلوق کا خوف طاری ہوتا ہے اور نہ وہ کبھی غمزدہ ہوتے ہیں۔

پس اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ خوفِ مخلوق اور خوفِ مرگ جیسی امراضِ خبیثہ کا بہترین عملی علاج کیا ہے؟ — چونکہ یہ چیزیں مومن کی فطرت اور اس کے عظیم الشان مقاصدِ حیات کے عین منافی تھیں، لہٰذا کلام اللہ نے ہمیں ان کا بہترین علاج "غزوہ و جہاد" بتایا چنانچہ قرآنِ مجید میں اکثر جگہ صریحًا بیان کیا گیا کہ نوعِ انسانی میں سے کفر و شرک، فسق و فجور، غصبِ حقوق اور ظلم و ستم کے طور طریقے محو کرنے کے لیے جب جہاد کا بگل بجایا جائے اور بندگانِ حق کو میدانِ کارزار کی جانب دعوت دی جائے تو اس وقت گھروں میں چھپنے والے، اہلِ باطل سے خوف زدہ ہونے والے اور رزم و پیکار سے جی چرانے والے لوگ "مسلمان" نہیں بلکہ "منافق" ہیں اور منافق کو کافر سے بھی بدتر اور عذاب و عقاب میں پست تر قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (پ ۵ : ع ۱۸)	منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں نفیِ خوفِ خلق اور مذمتِ خوفِ مرگ کرتی ہوئی بے شمار آیات موجود ہیں اور پھر جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف و توصیف میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ کسی دوسری آسمانی یا دنیوی کتاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا چنانچہ نوعِ

انسان کی روحانی و اخلاقی فلاح و بہبود اور رضائے الٰہی کے لئے اقدامِ خطر اور عزم مصائب و حوادث کرنے والے شیر دل مجاہدین کی اس سے زیادہ فضیلت و عزت افزائی اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دوڑتے، ہانپتے، اور سموں کی تاہرانہ ضرب سے چنگاریاں اڑاتے ہوئے گھوڑوں کی قسم کھائے؟[1]

بہرکیف یہ ایک حقیقت بیّنہ ہے کہ دنیا میں "جہاد" سے زیادہ دہشت انگیز پُرجلال، طالب جرأت و ہمت اور ذی وقار اقدامِ خطر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میدانِ جہاد وہ عرصۂ خطرات ہے جس میں بے شمار سر تنِ خاکی سے جدا ہو ہو کر مرغِ بسمل کی طرح رقص کرتے ہیں، خون کی ندیاں چلتی ہیں، ہتھیاروں کی جھنکار اور توپ و تفنگ کی گرج سے ایک قیامت صغریٰ برپا ہوتی ہے۔ ہاں، ایک گوشِ حقیقت نیوش کے لئے اس محشر شور و ہنگامہ سے یہ مقدس اور حیات افروز آواز بار بار گونجتی ہے کہ:-

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد، از قبیلۂ ما نیست!

ترجمہ:- "جو شخص میدان جہاد کے شور و غوغا کی تاب نہ لا سکے۔ وہ از خود ہماری صف سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور جو یہاں شہید نہ ہوا، وہ ہمارے قبیلہ و خاندان میں سے نہیں ہے۔"

دیکھئے، خدارا اس مقدس اور فقید المثال مرکزِ خطرات و آفات کا ایک ولولہ انگیز اور ہمت افزا منظر تو دیکھئے۔ اگر آپ کا ذوقِ جستجو اور شوقِ مطالعہ ایسے فطری مناظر کے لئے مضطرب نہ ہو تو پھر ایمان و یقین کو حرارت کہاں سے نصیب ہوگی؟ اور آپ کارزارِ حیات کے کٹھن خطرات کے لئے آمادہ کیونکر ہوں گے؟ چنانچہ میدان جہاد کا یہ

---

[1] دیکھئے سورہ العٰدیٰت (پ۳۰)

روح افزا منظر ملاحظہ فرمائیے :-

فوج کی تیاری

امڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل   تھے برچھیوں کے صورتِ منقار مِل پہ پِل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخیٔ اجل   وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
دو دو تبر تھے پاس ہر ایک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے کھنچے ہوئے حلقے کمند کے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش   کر ہو گئے تھے شور سے کرّوبیوں کے گوش
تھرائی یوں زمین کہ اڑے آسماں کے ہوش   نیزے ہلا کے نکلے سوارانِ درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

حد سے فزوں ہے کثرتِ افواجِ نابکار   نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ ہے تیغ آب دار
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثلِ کارزار   ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم ہیں جیسے ہوں گُل بے کھلے ہوئے
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں   نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں   ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں
سنگیں دلوں نے ہاتھ میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اٹھائے ہیں

(میر انیسؔ)

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ دغا پہ لگی چوب یک بیک — اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
تنبور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک — قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیٔ نبرد — گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخِ چار میں یہ رُخِ آفتاب زرد — ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخ لاجورد — مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد — تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے "الحذر! — دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
لو ٹل گیا زمیں کا طبق آسمان سے"

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد — ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیٔ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی اور زمیں بھی زرد — خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد

اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں (میر انیس)

دو حریفوں کی معرکہ آرائی

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزہ کو دی ٹکان
چمکی انی تو برق پکاری کہ "الامان"
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ "ہاں"
ڈانڈا ئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور رہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب
قبضہ میں لی کمان کیا فی بعد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب
تیور چڑھائے قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیز نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّا اتر گیا (میر انیس)

مندرجہ بالا اشعار میں میدانِ جنگ کے جو مناظر دکھائے گئے ہیں اور افواج و سپاہ
کی جو رزم و پیکار اور ہنگامہ آرائی پیش کی گئی ہے وہ دنیا کا بڑے سے بڑا آرٹسٹ اپنے موقلم

اور الوانِ رنگا رنگ سے ان کا کوئی ایک پہلو بھی اس مکمل و موثر صورت میں نہیں دکھا سکتا۔ ان چیزوں کی صحیح تصویر کشی کے لئے آرٹسٹ کا برش تو نہایت ناقص شے ہے، فردوسی اور ہومر جیسے امامانِ رزم، شاہانِ اقلیمِ شعر و سخن اور خازنانِ ذخیرۂ الفاظ بھی رزم کے میدان میں میرانیس کی گرد کو نہیں پہنچ سکے۔ بہرکیف ان مثالوں کا حقیقی مقصد ہے جذباتِ جہاد کا احیاء۔ اور مسلمانوں کے خونِ منجمد کا جوش و خروش!—— اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

الغرض اسلام ایک دینِ کامل ہونے کی حیثیت سے آپ کو "انسانِ کامل" اور مردِ شجاع بنا کر کشمکشِ حیات، حوادثِ روزگار اور خطراتِ میدانِ کارزار کے لئے محکم و توانا کرتا ہے اور فریضۂ جہاد کے ذریعہ تمام مفاسدِ طبع اور عناصرِ رہبانیت کو فنا کرتے ہوئے آپ کو "احسنِ تقویم" اور "نائبِ حق" کا مقامِ رفیع عطا کرتا ہے۔ کیا اللہ کی رضا اور محبوبیت مومن کے لئے کوئی معمولی سی نعمت ہے؟ اور یہ نعمت ملتی کیونکر ہے؟—اس طرح کہ:۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ٥	اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس مضبوطی سے صف آرا ہو کر جہاد کرتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہیں۔
(پ۲۸ - ع۹)	

آپ دنیا میں ہزاروں قسم کی تجارتیں کرتے ہیں اور ان میں نفع بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی، لیکن زبانِ الٰہی میں "جہاد" سے بہتر تجارت اور کیا ہوگی کہ اس میں سو فی صد نفع ہی نفع ہے اور خسارے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ	مسلمانو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتاؤں

تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝	جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔ وہ
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ	تجارت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ	پر ایمان لاؤ (توحید و سنت کی پیروی کرو)
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے
تَعْلَمُوْنَ ۝	جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تجارت تمہارے لئے
(پ ۲۸ - ع ۱۰)	سب سے بہتر ہے۔

اور پھر اس سے بہتر خرید و فروخت اور کیا ہو گی جو اللہ اور مومن کے درمیان ہوتی ہے اور جس میں ایک لمحہ کے عیش شہادت کے عوض مسرت و طمانیت کی غیر فانی بہشت عطا کی جاتی ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	بے شک اللہ تعالےٰ نے بہشت کے بدلے
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ	مسلمانوں کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں۔ وہ
الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور اس میں
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۔	(کفار و مشرکین کو) قتل کرتے ہیں اور خود بھی
(پ ۱۱ - ع ۳)	شہید ہوتے ہیں۔

اس مبارک و مقدس عزم خطر کے بعد کشتہ تیغ عشق کے لئے "مردہ" کا لفظ استعمال کرنا یا اس کے حق میں "موت" کا تصور کرنا بھی شہید کی توہین ہے۔ اور "زندگی" کی تذلیل و تحقیر:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ	اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں۔
اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ	ان کو مردہ ہرگز نہ کہو۔ بلکہ وہ تو دائمی طور
لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔	پہ زندہ ہیں۔ مگر تم ان کی حیاتِ ابدی کی

سمجھ نہیں سکتے۔ (پ: ۳ ع ۱)

چنانچہ خواجہ حافظ نے ایسے مردانِ حق ہی کے متعلق فرمایا ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ترجمہ: "جس شخص کا دل عشقِ حق سے زندہ ہو جائے وہ کبھی نہیں مرتا۔ لہٰذا لوحِ عالم پر ہمارا نقش ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکا ہے۔"

میں نے اس موضوع کے تحت جو کچھ اور جتنا کچھ بھی لکھا۔ وہ درحقیقت علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خطر اور اس کے عملی مفادات کی وضاحت کے لئے لکھا۔ بالخصوص "جہاد" کے مبحث کو میں نے اس لئے پھیلایا کہ وہ منتہائے خطرات ہے، خالقِ خطرات ہے اور انہیں خطرات کے ماحول میں مومن کو مؤثر ترین درسِ حیات دیتا ہے۔ اقبال کی نظر میں تو وہ علم و فراست اور تدبر و حکمت بھی ایک پرِ کاہ کی قدر و قیمت نہیں رکھتے جو کسی مردِ غازی کو اس کے "تیغ و سپر" سے محروم کر دیں:۔

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را (اقبالؒ)

اب میں بالخصوص "خطر" اور "مفادِ خطر" پر کلامِ اقبال سے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ایک فارسی نظم کا تو عنوان ہی یہ واقع ہوا ہے کہ:۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

غزالے باغزالے دردِ دل گفت — "ازیں پس در حرم گیرم کنامے"
ایک ہرن نے دوسرے ہرن سے اپنا دردِ دل کہا — میں آج کے بعد تو حرم میں ہی جائے پناہ ڈھونڈوں گا

بصحرا صید بنداں در کمین اند
بکامِ آہواں صبحے نہ شامے

صحرا میں شکاری ہماری تاک لگائے بیٹھے رہتے ہیں
اور وہاں ہرنوں کے حسبِ منشا نہ صبح ہے نہ شام

اماں از فتنۂ صیاد خواہم
میں صیاد کے فتنوں سے امن و امان چاہتا ہوں

دلے ز اندیشہ ہا آزاد خواہم!
اور اپنے دل کو غم و تشویش سے آزاد کرنا چاہتا ہوں

رفیقش گفت" اے یارِ خردمند
اگر خواہی حیات اندر خطر زی!
اس کے ساتھی نے کہا کہ اے عقلمند دوست!
اگر تو زندگی کا لطف چاہتا ہے تو خطرات میں جی

دما دم خویشتن را بر فساں زن
ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی!
خود کو پے در پے سنگِ فساں پر مار
اور دنیا میں اصیل تلوار سے بھی زیادہ تیز رہ

خطر تاب و تواں را امتحان است
خطرہ ہر ذی روح کی قوت و توانائی کا امتحان ہے

عیارِ ممکناتِ جسم و جان است! (پیام مشرق)
اور جسم و روح کی ممکناتِ تسخیر کو پرکھنے کی کسوٹی

اس نظم کے آخری شعر میں خطرات کا حقیقی مقصد نہایت جامع و مانع صورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ غور کیجئے تو تن آسانی، عیش و مسرت، راحت و آرام اور عافیت پسندی افراد و اقوام کی طبائع میں جو مرگ آفریں سستی و خاموشی اور سکون و جمود پیدا کرتے ہیں، انہیں اگر کوئی چیز فنا کرتی ہے اور فنا کر کے افراد و اقوام کو آمادۂ تسخیر و عمل کرتی ہے تو وہ صرف خطرات ہی ہیں۔ خطرات فی الواقع انسان کی قوت و توانائی اور عزم و استقلال کا بہترین امتحان بن کر اس کی روحانی و جسمانی ممکنات کو بیدار و آشکار کر دیتے ہیں۔

اگر طبع انسانی کو ایک کھیتی تصور کیجئے تو خطرات ایک سحاب رحمت بن کر اسے سیراب کرتے ہیں۔ اور اس کے باطنی خزائن کو فی الفور منصۂ شہود پر لے آتے ہیں جس طرح حنا پتھر پر پس جانے کے بعد ہی رنگ دیتی ہے اور سونا کٹھالی میں پگھل کر ہی خالص تر ہوتا ہے، اسی طرح فطرتِ انسانی بھی خطرات ہی سے زیادہ روشن و توانا ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں یہاں کوئی طویل بحث چھیڑے بغیر صاحب فہم و بصیرت لوگوں کے لئے اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ از آدم تا ایں دم تمام انبیاءؑ، اولیاءؒ، صلحاء اور مصلحین نوع انسانی کے عزم و عمل کی حرارت و جولانی کا حقیقی باعث ہی اہل باطل کے پیدا کردہ گوناگوں خطرات تھے۔ اور یہ خطرات ہی بیشتر حالات میں ان کی فتح و کامرانی کا ذریعہ بنے۔ خود صحابہ کرامؓ نے جس معجز نما تیز رفتاری سے مادی و عسکری اور اجتماعی ترقی و توانائی حاصل کی اور مختلف ممالک میں پیروانِ باطل پر جو حیرت انگیز فتوحات پائیں ان کا ایک بہت بڑا سبب وقت کے پیش آمدہ خطرات ہی تھے۔

اور اس ضمن میں مجمل طور پر میں یہ نکتہ بھی آپ پر ضرور واضح کروں گا کہ جس چیز کو اصطلاحِ جدید میں "ارتقاء" (EVOLUTION) کہا جاتا ہے، اس کی بنیاد بھی سراسر "خطرات" ہی پر ہے۔ آج کا ترقی یافتہ تمدن، جذبۂ تحقیق و جستجو، فروغِ علوم اور سائنس کی تمام تخلیقات حاصل و نتیجہ ہیں افراد و اقوام کے اس مبہم "احساسِ خطر" کا جس کے تحت وہ نہ صرف اپنے سے زیادہ دانا و توانا افراد و اقوام کے غلبہ و اقتدار سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ بلکہ زندگی کی دوڑ میں ان پر سبقت لے جانے کے آرزومند بھی! مثلاً صرف مقصدِ "دفاع" ہی کی خاطر حضرت انسان تیر و شمشیر کی ساخت سے شروع ہو کر اور پھر توپ و تفنگ وغیرہ کے مرحلے طے کرتے ہوئے آج "ایٹم بم" اور "ہائیڈروجن بم" وغیرہ جیسی تباہ کن چیزوں تک پہنچ چکے ہیں اور ہنوز عملِ ارتقا جاری

ہے۔ آخر اس غیر متناہی جد وجہد کی تہ میں کیا چیز کارفرما ہے؟ — وہی احساس خطر کہ مجھ پر کوئی اور فرد یا قوم حملہ آور ہو کر فتح و غلبہ حاصل نہ کر لے۔ یہاں یہ دوسری بات ہے کہ ایسے خطرات و خدشات کو تمام نوع انسانی کے حفظ و بقا کی بجائے محض ذاتی اغراض و مفادات اور قومی فوقیت و برتری کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ یہ در اصل خطرات کا قصور نہیں، بلکہ انسان کی ذاتی ہوا و ہوس کا قصور ہے اور فہم و شعور کی کج روی! —

یہی وجہ ہے کہ:۔

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو

اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ (اقبالؔ)

کلامِ اقبالؒ

اب علامہ اقبال کی فارسی اور اردو تصنیفات سے چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں عزم و اقدامِ خطر کے عملی فوائد بیان کئے گئے ہیں:۔

روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر
اگر جنگ کے دن دشمن کا لشکر

بر گمانِ صلح گردد بے خبر
صلح کے گمان پر غافل و بے خبر ہو جائے

گیرد آسان روزگارِ خویش را
اپنا وقت راحت و آرام سے بسر کرے

بشکند حصن و حصارِ خویش را
اور اپنے قلعے اور چار دیواریاں توڑ دے

تا نہ گیرد بازکارِ او نظام
تو جب تک اس کا ساز و سامان دوبارہ منظم نہ ہو جائے

تاختن بر کشورش آمد حرام
اس کے ملک پر چڑھائی کرنا شرعاً ناجائز ہے

سرِ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟
کیا تو جانتا ہے کہ اس فرمانِ خدا میں کیا حکمت ہے

زیستن اندر خطرہا زندگیست!
یہ کہ خطرات میں رہنا ہی فروغِ زندگی ہے

شرع می خواہد کہ چوں آئی بجنگ — شعلہ گردی واشگافی کامِ سنگ

شریعت یہ چاہتی ہے کہ جب تو آمادہ جنگ ہو — تو شعلہ بن جائے اور پتھر کو بھی پھاڑ کر رکھ دے

آزماید قوتِ بازوئے تو — می نہد الوند پیشِ روئے تو

شریعت تیری قوتِ بازو کو آزماتی ہے — اور اس لئے کوہ الوند تیرے سامنے لا رکھتی ہے

باز گوید سرمہ ساز الوند را — از تفِ خنجر گداز الوند را

پھر کہتی ہے کہ اس پہاڑ کو سرمہ کر — اور اپنے خنجر کی حرارت سے الوند کو پگھال دے

نیست بیمِ ناتوانے لاغرے — درخورِ سرپنجۂ شیرِ نرے

ایک کمزور اور دبلی پتلی بھیڑ — شیر نر کے پنجۂ آہنیں کے قابل نہیں ہے

باز چوں با صعوہ خوگر می شود — از شکارِ خود زبوں تر می شود

جب ایک باز چڑیوں کے شکار کا عادی ہو جائے — تو وہ اپنے شکار سے بھی کمزور تر ہو جاتا ہے

شارعِ آئیں شناسِ خوب و زشت — بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت

پس اس شارعؐ نے جو ہر بھلے برے کا قانون خوب سمجھتا ہے — تیرے لئے غلبہ و اقتدار کا یہ نسخہ تجویز کیا

از عمل آہن عصب می سازدت — جائے خوبے در جہاں اندازدت

وہ عمل کے ذریعے تیرے پٹھوں کو فولادی بناتا ہے — اور دنیا میں تجھے بلند و موزوں موقف تک پہنچاتا ہے

خستہ باشی استوارت می کند — پختہ مثلِ کوہسارت می کند

اگر تو کمزور و ناتواں ہو تو وہ تجھے محکم و توانا کرتا ہے — اور تجھے پہاڑوں کی طرح پختہ اور ٹھوس بناتا ہے

ہست دینِ مصطفےؐ دینِ حیات — شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات!

مصطفےؐ کا دین (اسلام) زندگی سے معمور ہے — اور اس کی شریعت قانونِ حیات کی تفسیر ہے

گر زمینی آسماں سازد ترا — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

اگر وہ زمین ہے تو وہ دین تجھے آسمان بنا دیگا — اور جو کچھ خدا چاہتا ہے وہی کچھ تجھے بنا دیگا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را
اس کا پالش پتھر کو آئینہ بنا دیتا ہے
از دلِ آہن رباید زنگ را (رموزِ بیخودی)
اور لوہے کے دل سے زنگ اتار دیتا ہے

نائبِ حق در جہاں آدم شود
خدا کا نائب دنیا میں انسان ہی بنتا ہے
بر عناصر حکمِ او محکم شود
اور عناصر پر اس کا حکم واقتدار مضبوط تر ہوتا ہے

تنگی ات پہنا پذیرد در جہاں
اس حالت میں تیری تنگی وسعت سے بدل جاتی ہے
کارِ تو اتمام گیرد در جہاں
اور تیرا ہر کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے

خویش را بر پشتِ باد اسوار کن
پس تو خود کو ہوا کی پیٹھ پر سوار کر
یعنی ایں جمّازہ را مہار کن
یعنی اس اونٹنی کی ناک میں مہار ڈال

دست رنگیں کن ز خونِ کوہسار
تو پہاڑوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ
جوئے آبِ گوہر از دریا بر آر
اور موتیوں کی ندی قعرِ دریا سے نکال لا

صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند
ایک ہی فضا میں سینکڑوں دنیائیں مخفی ہیں
مہرہا در ذرّہا پوشیدہ اند
اور ذروں کے اندر سورج چھپ رہے ہیں

از شعاعش دیدہ کن نادیدہ را
اس سورج کی شعاع سے پوشیدہ اشیاء کو ظاہر کر
وا نما اسرارِ نافہمیدہ را
اور جو چیزیں سمجھی نہیں جا سکیں ان کے حقائق بیان کر

تابش از خورشیدِ عالمتاب گیر
دنیا کو روشن کرنے والے سورج سے حرارت لے
برقِ طاق افروز از سیلاب گیر
اور طاق کو روشن کرنے والی بجلی سیلاب سے

جستجو را محکم از تدبیر کن
اپنی جستجو کو تدبیر سے مضبوط و توانا کر

انفس و آفاق را تسخیر کن (رموزِ بیخودی)

اور نہ صرف اپنے نفس کو بلکہ دنیا کو بھی مسخر کر

مومن بالائے ہر بالا ترے ۔۔۔ غیرت او بر نتابد ہمسرے
وہ ایک ایسا مومن ہے جو ہر بالا تر سے بھی بالا ہے ۔۔۔ اور اس کی غیرت اپنے کسی ہم پایہ کو گوارا نہیں کرتی

خرقۂ لَاتَحْزَنُوا اندر برش ؎ ۔۔۔ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش
"غم نہ کرو" کا لباس اس کے جسم پر ہے ۔۔۔ اور "فتح مند تم ہو" کا تاج اس کے سر پر

می کشد بارِ دو عالم دوشِ او ۔۔۔ بحر و بر پروردۂ آغوشِ او
اس کا کندھا دونوں جہان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے ۔۔۔ اور بحر و بر نے اس کی آغوش میں پرورش پائی ہے

بر غوِ تندر مدام افگندہ گوش ۔۔۔ برق اگر ریزد ہمی گیرد بدوش
وہ ہمیشہ بجلی کی کڑک پر کان رکھے ہوئے ہے ۔۔۔ اور جب بجلی گرتی ہے تو وہ اسے اپنے کندھے پر لیتا ہے

پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر ۔۔۔ امر و نہیِ او عیارِ خیر و شر
وہ باطل کے سامنے تو تلوار ہے مگر حق کے سامنے ڈھال ۔۔۔ اس کا امر و نہی دنیا میں خیر و شر کا معیار ہے

از بلا ہا پختہ تر گردد خودی ۔۔۔ تا خدا را پردہ در گردد خودی
خودی تو مصائب سے پختہ تر ہوتی ہے ۔۔۔ حتّٰی کہ وہ خدا کو بھی بے نقاب کر دیتی ہے

از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفےٰ است ؎ ۔۔۔ "مرد را روزِ بلا روزِ صفاست!"
تو مصائب سے ہراساں ہے؟ حدیث رسولؐ کہتی ہے کہ ۔۔۔ مرد مومن کے لئے روز مصائب روز تزکیہ باطن ہے

؎ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔
دو نہ تو سست و افسردہ ہو اور نہ کسی قسم کا غم کرو۔ کیونکہ اگر تم سچے مومن ہو تو (کفار پر) ہمیشہ غالب و فتحیاب رہو گے" ؎ ۴۴۴ صفحہ پر ملاحظہ کریں

مرد حق بیں جز بحق خود را ندید — لا الٰہ می گفت و در خوں می تپید

مرد حق بیں تو خدا کے سوا اپنی حالت پر نظر ہی نہیں کرتا — وہ کلمہ توحید کہتا ہے اور خون (مصائب) میں غلطاں رہتا ہے

عشق را در خوں تپیدن آبروست — ارّہ و چوب و رسن عیدین اوست

عشق کیلئے خون (مصائب) میں غلطاں رہنا ہی عین عزت ہے — اور آرہ اور چوب و رسن ہی اس کی عیدیں ہیں

ا۔ مجاہدین اسلام اور کفار کے درمیان جنگ شروع ہونے سے پیشتر ایک رومی سپہ سالار نے حضرت خالد بن ولید سے کہا: "آپ لوگ تو کچھ عقل و ہوش اور دور اندیشی سے کام ہی نہیں لیتے۔ آپ کے پاس نہ تو جنگ کا ساز و سامان ہوتا ہے اور نہ تربیت یافتہ افواج۔ آپ چند زنگ آلود تلواروں اور مٹھی بھر صحرائی بدوؤں کو لے کر ہماری اس قدر منظم و مسلح اور لاتعداد افواج کے مقابل صف آرا ہو جاتے ہیں جان بوجھ کر خطرات میں پڑنا اور خود کو ہلاکت میں ڈالنا دانا لوگوں کا کام نہیں۔ حضرت خالد نے جواباً فرمایا "ہمارے رسول برحق کا ارشاد ہے کہ "مصائب و نوائب اور خطرات کا دن مرد مومن کے لئے تزکیہ نفس اور صفائے قلب کا دن ہے" پس جو لوگ مصائب و خطرات اور جنگ و جہاد کی جستجو میں رہتے ہیں، وہ تمہاری کثرت افواج، افراط سامان جنگ اور خوفزدہ کرنے والی تقاریر سے کیونکر مرعوب ہونگے"؟

پھر آپ نے یہ آیہ شریفہ پڑھی:-

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝

"یہ (ایماندار) لوگ تو ایسے جری ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مقابلے کے لئے (کافر و مشرک) لوگوں نے لشکر اور سامان جنگ جمع کیا ہے لہٰذا تم ان سے ڈر کر رہو۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بھی محکم و توانا ہو گیا اور وہ کہنے لگے "ہمیں تو اللہ کی مدد ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے"۔

خویشتن را وا نمودن زندگی است
ضربِ خود را آزمودن زندگی است

لہذا اپنی قوت باطن کو ظاہر کرنا ہی زندگی ہے
اور اپنی ضرب کاری کو آزمانا ہی دلیل زندگی ہے

در رہِ حق ہر چہ پیش آید نکوست
راہ حق میں جو کچھ بھی پیش آئے مبارک ہے

مرحبا نا مہربانی ہائے دوست (جاوید نامہ)
دوست کی نامہربانی (جفا) پر بھی سر آنکھوں پر (تحسین) ہوں

امتحانِ پاک مرداں از بلاست
تشنگاں را تشنہ تر کردن رواست

خدا کے پاک مردوں کا امتحان مصائب سے ہوا ہی کرتا ہے
اور جو پیاسے ہیں انہیں زیادہ پیاسا کرنا روا ہے

در گذر مثلِ کلیمؑ از رودِ نیل
سوئے آتش گام زن مثلِ خلیلؑ

تو موسیٰؑ کی طرح دریائے نیل کے پار ہو جا
اور ابراہیمؑ کی مانند آگ کی طرف قدم اٹھا

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست
وہ شخص جو بوئے دوست (عشقِ حق) رکھتا ہے اس کا نغمہ

ملتے را می برد تا کوئے دوست (جاوید نامہ)
پوری قوم کو محبوب کے کوچے تک لے جاتا ہے

زندہ رود

از تو خواہم سرِ یزداں را کلید
طاعت از ما جستن و شیطاں آفرید

میں تجھ سے خدا کے اس بھید کا حل چاہتا ہوں
کہ ہمیں تو اطاعت کا حکم دیا مگر ساتھ ہی شیطان پیدا کر دیا

زشت و ناخوش را چناں آراستن — در عمل از ما نکوئی خواستن!

برائی اور گناہ کو تو اس قدر آراستہ و دلکش کرنا — اور پھر عمل میں ہم سے نیکی کی توقع رکھنا

از تو پرسم ایں فسوں سازی کہ چہ؟ — با قمارِ بدنشیں بازی کہ چہ؟

میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ یہ جادوگری کس لئے! — اور ایک فریبی جوا باز سے کھیل کیا معنی!

مشتِ خاک و ایں سپہرِ گرد گرد — خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد؟

انسان کی ایک مشتِ خاک اور آسمان کی یہ گردباد؟[1] — تو خود ہی کہہ کہ یہ کام اس کی شان کے لائق تھا

کارِ ما افکارِ ما، آزارِ ما

ہمارے کام ہمارے لئے تشویش و تکلیف کا باعث ہیں

دست با دنداں گزیدن کارِ ما

اور ہم دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹا کرتے ہیں

شاہِ ہمدان

بندۂ کز خویشتن دارد خبر — آفریند منفعت را از ضرر

وہ بندۂ حق جو اپنی قوت باطن سے باخبر ہو — نقصان میں سے بھی فائدے کی صورت پیدا کرتا ہے

بزم با دیو است آدم را وبال — رزم با دیو است آدم را جمال

شیطان کیساتھ مجلس اختیار کرنا انسان کے لئے موجبِ بربادی ہے — لیکن اس سے جنگ آزما ہونا انسان کیلئے وجہِ ترقی ہے

---

[1] اسی مفہوم میں ایک اردو شعر ہے:۔

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک — ستم ہے یا کرم تیری لذتِ ایجاد!

خویش را بر اہرمن باید زدن　　　تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن

پس خود کو ابلیس پر دے مارنا چاہیئے　　　تو سراسر تیغ ہے اور وہ پتھر جس پر یہ تیز تر ہو گی

تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت

تو زیادہ تیز ہو تاکہ تیری چوٹ سخت پڑے

ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت　(جاوید نامہ)

ورنہ تو دونوں جہان میں محروم و بدنصیب ہو گا

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

شرابِ معرفت سے ربط و انس پیدا کر اور اسے پے در پے پی

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن　(جاوید نامہ)

اور جب تو پختہ ہو جائے تو خود کو سلطنتِ جمشید پر دے مار

ایں کارِ حکیمے نیست دامانِ کلیمے گیر

تسخیرِ کائنات ایک فلسفی کا کام نہیں، بلکہ کسی کلیم کا دامن پکڑ

صد بندۂ ساحل مست یک بندۂ دریا مست　(پس چہ باید کرد)

کیونکہ ساحل کے سو آرزومند ایک عاشق دریا کے مساوی نہیں ہو سکتے

نکشد سفینۂ کس بہ یم بلند موجے

عشق ساحل کے سکون و جمود میں ذوقِ عمل کے لئے جو نقصان

خطرے کہ عشق بیند بسلامتِ کنارہ　(زبورِ عجم)

دیکھتا ہے اس کے تحت طوفانی سمندر میں کشتی ہی نہیں چلاتا[1]

---

[1] کہ وہ چلاتے چلاتے کہیں واصلِ ساحل نہ ہو جائے۔

من اے دریائے بے پایاں بہ موجِ تو در افتادم

اے دریائے ناپیدا کنار! میں تو تیری موجوں سے الجھ چکا ہوں

نہ گوہر آرزو دارم ، نہ می جویم کرانے را (زبورِ عجم)

نہ تو مجھے تیرے موتیوں کی آرزو ہے ، اور نہ میں ساحل پر جانا چاہتا ہوں

چو موج مستِ خودی باش و سر بطوفاں کش

تو موج کی طرح مستِ خودی ہو جا اور اپنا سر طوفان میں دے دے

ترا کہ گفت کہ بنشیں و پا بداماں کش؟

تجھے کس نے کہا کہ ساحل پر آرام سے بیٹھ جا اور پاؤں چادر میں سمیٹ لے

بقصدِ صیدِ پلنگ از چمن سرا برخیز

چمن کے عیش و آرام کو چھوڑ اور چیتے کے شکار کے لئے اٹھ کھڑا ہو

بکوہ رخت گشا خیمہ در بیاباں کش!

پہاڑ میں اپنا سامان کھول اور جنگل میں اپنے خیمے گاڑ

بہ مہر و ماہ کمندِ گلو فشار انداز

سورج اور چاند پر گلا زخمی کرنے والی کمند پھینک۔

ستارہ را ز فلک گیر و در گریباں کش! (زبورِ عجم)

اور ستاروں کو آسمان سے توڑ کر اپنے گریبان میں رکھ لے

چو موج خیز و بہ یم جاودانہ می آویز

موج کی طرح اٹھ اور ہمیشہ کے لئے سمندر سے مخلوط ہو جا

کرانہ می طلبی؟ بے خبر کرانہ کجاست! (زبور عجم)

تو کنارہ ڈھونڈ رہا ہے؟ نادان کنارہ ہے کہاں؟

غلط خرامیِ ما نیز لذتے دارد

میری غلط چال بھی اپنے اندر سو لذتیں رکھتی ہے

خوشم کہ منزلِ ما دور و راہ خم بخم است (زبور عجم)

میں خوش ہوں کہ میری منزل دور ہے اور راہ پیچ در پیچ

تو در زیرِ درختاں، ہمچو طفلاں آشیاں بینی

تو بچوں کی طرح درختوں کے نیچے پرندوں کے گھونسلے ڈھونڈتا پھرتا ہے

بہ پرواز آ کہ صیدِ مہر و ماہے می تواں کردن (زبور عجم)

پرواز میں آ کر سورج اور چاند کو بھی شکار کیا جا سکتا ہے

اے موجِ شعلہ سینہ بہ بادِ صبا کشائے

اے موجِ شعلہ! اپنا سینہ بادِ صبا پہ کھول دے

شبنم مجو کہ می دہد از سوختن فراغ (زبور عجم)

شبنم کی آرزو نہ کر جو تیرے سوز کو یکسر ختم کر دے

عجم بحریست ناپیدا کنارے

عجم وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں

کہ درو ے گوہر الماس رنگ است!

اور اس میں الماس کے رنگ کے بے شمار موتی ہیں

ولیکن من نہ رانم کشتیٔ خویش

لیکن میں تو اپنی کشتی اس دریا میں چلاتا ہی نہیں

بدریائے کہ موجش بے نہنگ است! (پیام مشرق)

جس کی موجوں میں مگرمچھ موجود نہ ہوں

بکیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است

زندہ دل لوگوں کے مذہب میں زندگی کے معنی ہیں جفا طلبی

سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است (پیام مشرق)

بنا بریں میں نے کعبہ کا سفر اسلئے اختیار نہیں کیا کہ راہ بے خطر ہے

چو موج سازِ وجودم ز سیل بے پرواست

موج کی طرح میرا سازِ وجود بھی مست و بے پروا طوفان سے ہے

گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم (پیام مشرق)

تو یہ خیال نہ کر کہ میں اس سمندر میں ساحل تلاش کر رہا ہوں

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست

مجھے تو تیر، نیزے، خنجر اور تلوار کی آرزو ہے

با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

میرے ساتھ نہ آ کیونکہ میں تو طریقِ حسینؑ کی آرزو رکھتا ہوں

از بہر آشیانہ خس اندوزیم، نگر

گھونسلے کے لیے میرے تنکے جمع کرنا بھی دیکھ

باز ایں نگر کہ شعلۂ درگیرم آرزوست (پیام مشرق:)

اور پھر یہ بھی دیکھ کہ مجھے پھونک دینے والے شعلے کی تمنا ہے

گفتند لب بہ بند و ز اسرارِ ما مگو

انہوں نے کہا کہ ہونٹ بند رکھو اور ہمارے بھید بیان نہ کر

گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزوست (پیام مشرق،)

میں نے کہا کہ نہیں، مجھے تو صرف نعرۂ تکبیر کی آرزو ہے

مرید ہمتِ آں رہروم کہ پا نہ گذاشت

میں اس مسافر کی ہمت کا غلام ہوں جس نے

بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست (پیام مشرق،)

اس راستے پر پاؤں ہی نہ رکھا جس میں کوہ و دشت و دریا نہ ہو

می تواں جبریل را گنجشکِ دست آموز کرد

ہمت ہو تو جبریل کو بھی ہاتھ کی سدھائی ہوئی چڑیا بنایا جا سکتا ہے

شہپرش با موئے آتش دیدہ بستن می تواں

اور اس کے پر کو آگ دیکھتے ہوئے بال سے باندھا جا سکتا ہے

گر بخود محکم شوی سیلِ بلا انگیز چیست
اگر تو خود مضبوط ہو جائے تو بلا خیز طوفان کی تو کیا حقیقت ہے
مثلِ گوہر در دلِ دریا نشستن می تواں (پیامِ مشرق)
موتی کی طرح دریا کے دل میں بھی بیٹھا جا سکتا ہے

وائے آں قافلہ کز دونیِ ہمت میخواست
اس قافلہ پر صد افسوس جس نے پستیٔ ہمت سے وہ
رہگذارے کہ در و ہیچ خطر پیدا نیست (پیامِ مشرق)
راستہ اختیار کیا جس میں کسی قسم کا خطرہ ہی نہیں

چہ خوش زد ترک ملاّحے سرودے
ایک ترک ملاح نے کیا ہی خوشگوار نغمہ بپا کیا
رُخِ او احمرے، چشمش کبودے
اس کا رخسار سرخ تھا اور آنکھیں نیلی
بدریا گر گرہ افتد بہ کارم
اگر دریا میں میرے کام کے اندر کوئی گرہ پڑ جائے
بجز طوفاں نمی خواہم کشودے! (ارمغانِ حجاز)
تو میں اسے طوفان کے علاوہ اور کسی شئے سے نہ کھولوں گا

نهنگے بچۂ خود راچہ خوش گفت
ایک مگرمچھ نے اپنے بچہ سے کیا خوب کہا

بہ دین ما حرام آمد کرانہ!
کہ ہمارے دین میں ساحل ڈھونڈنا حرام ہے

بہ موج آویز و از ساحل بپرہیز
موجوں سے الجھ اور کنارے سے دور دور رہ

ہمہ دریاست ما را آشیانہ! (ارمغانِ حجاز)
ہمارے لئے تمام دریا ہی آشیانہ ہے

تو در دریا نہٗ او در بر تست
اے بچۂ نہنگ! تو دریا میں نہیں بلکہ وہ تیرے پہلو میں ہے

بہ طوفاں در فتادن جوہر تست
طوفان میں جا گرنا ہی تیرا جوہر زندگی ہے

چو یک دم از تلاطم ہا بیاسود
اگر یہی دریا ایک دم کے لئے بھی تلاطم برپا نہ کرے

ہمیں دریا ئے تو غارت گرِ تست (ارمغانِ حجاز)
تو اس کی پرسکون موجیں تجھے غرق کرنے کیلئے کافی ہیں

گلہ از سختیٔ ایام بگذار
مصائب زمانہ کے خلاف شکوہ و شکایت چھوڑ دے
کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است
کیونکہ جس نے سختیاں نہ سہی ہوں وہ کھوٹا رہتا ہے
نمی دانی کہ آب جوئبا راں
کیا تو نہیں جانتا کہ آبشاروں کا پانی
اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است (ارمغانِ حجاز)
جب پتھروں پر رواں دواں ہو تو زیادہ خوشگوار ہے

بدستِ من ہماں دیرینہ چنگ است
میرے ہاتھ میں وہی پرانا چنگ ہے
درونش نالہ ہائے رنگ رنگ است
جس میں طرح طرح کے نغمہ ہائے نالہ و فریاد پوشیدہ ہیں
ولے بنوازمش با ناخنِ شیر
لیکن میں تو اس ساز کو مضراب کی بجائے ناخنِ شیر سے بجاتا ہوں
کہ او را تار از رگ ہائے سنگ است (ارمغانِ حجاز)
کیونکہ اس ساز کی تاریں پتھر کی رگوں سے بنی ہوئی ہیں

نہاں اندر دو حرفے سرِّ کار است

تمام معاملات کارِ جہاں دو حرفوں ہی میں پوشیدہ ہے

مقامِ عشق منبر نیست دار است

کہ عشق کا اصل موقف منبر نہیں بلکہ دار ہے

براہیماں ز نمرودان نترسند

ابراہیم نمرودوں سے ہرگز نہیں ڈرا کرتے

کہ عودِ خام را آتش عیار است (ارمغانِ حجاز)

کیونکہ کچی چوبِ عود کی کسوٹی آگ ہے

قلندر میلِ تقریرے ندارد

مردِ حق زیادہ گفتگو پر رغبت نہیں رکھتا

بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد

اور اس نکتے کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی اکسیر نہیں

ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست

کہ وہ خراب و برباد کھیتی کسی قسم کا حاصل نہیں دیگی

کہ آب از خونِ شبّیرے ندارد

جو خونِ شبیرؑ سے سیراب نہیں ہوتی

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص

کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا (ارمغانِ حجاز)

خود آگاہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اس مردِ مجاہد پر زرہ پوشی (ارمغانِ حجاز)

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد (بالِ جبریل)

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ (بالِ جبریل)

ترا بحر پُر سکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ! (ضربِ کلیم)

کہا پہاڑ کی ندی نے سنگریزے سے
فتادگی و سرافگندگی تری معراج
ترا یہ حال کہ پامال و دردمند ہے تو
مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج
جہاں میں تُو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا
کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج (ضربِ کلیم)

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سُراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ (ضربِ کلیم)

دریا میں موتی اے موجِ بے باک!
ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک! (ضربِ کلیم)

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک (ضربِ کلیم)

جو سختیِ منزل کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی (ضربِ کلیم)

عنوانِ "خطر" پر یہ تمام مثالیں پیش کرنے کے بعد برادرانِ اسلام سے یہ استفسار کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اے امانتدارانِ قرآن! اے حاملانِ لا الٰہ الا اللہ! اے عاشقانِ رسول برحق! اور اے وارثانِ ذوالفقار! اولادِ حیدرؓ و خالدؓ ہونے کے باوجود آج تم میں حیدرؓ و خالدؓ کا ذوقِ خطر کیوں نابود ہو رہا ہے؟ آج تم بھی دربارہ اشاعتِ حق اور قیامِ حق جیسے فرضِ مقدس کی تعمیل کے لئے خطرات و آفات کی جستجو کیوں نہیں کرتے؟ آج تمہارے دلوں میں بھی اُس ذوقِ خطر اور اُس شوقِ شہادت کا ولولہ کیوں نہیں، جس کے زیرِ اثر مسلمانوں کے نابالغ بچے بھی پنجوں کے بل کھڑے ہو ہو کر خود کو بالغ مجاہدین کی صفوں میں شامل کرتے تھے؟ آج تمہارے بھی ساٹھ کلمہ گو مسلمان

وقفِ خطرات ہو کر ساٹھ ہزار کفار سے ٹکر لیتے ہوئے کیوں فتح یاب نہیں ہوتے؟ آج تم بھی اپنے اسلاف کی طرح ہر دشت و صحرا میں نعرۂ تکبیر اور علمِ توحید بلند کرنے کے بعد "بحرِ ظلمات" میں اپنے گھوڑے کیوں نہیں دوڑا دیتے؟ آج تمہارے دلوں میں بھی فتح، نصرتِ حق کا یقین اس قدر پختہ کیوں نہیں کہ تم تعدادِ قلیل[1] کے باوجود کنارِ اندلس اپنی کشتیوں کو نذرِ آتش کرتے ہوئے یہ باطل سوز اعلان کر دو کہ ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست؟

آج تم بھی تیغِ ایوبی[2] کے وہ جوہر دکھانے کی قوت و صلاحیت کیوں نہیں رکھتے جس کے مقابل تمام "شیر دل" بادشاہوں کی تلواریں ٹوٹ گئیں اور سر عجز و بے بسی میں جھک گئے! اور آج تم بھی خونِ شہیداں میں بہارِ حیاتِ ابدی کے رنگا رنگ جلوے کیوں نہیں دیکھتے؟ — ان تمام سوالات کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ دنیا کے سب سے بڑے مجاہد، سب سے بڑے مردِ حق پرست اور سب سے بڑے عاشقِ خطرات کے الفاظ میں یہ ہے کہ: "میری امت دنیا کی کسی چیز سے زوال پذیر نہ ہوگی، مگر صرف دو چیزوں سے، ایک مال کی محبت، دوسری موت کا خوف۔" اور آپ ہی فرمائیے کہ کیا عہد حاضر کا مسلمان مال کی محبت میں ہر دوسری محبت، حتٰی کہ اللہ اور رسولؐ کی محبت سے بھی دست بردار نہیں ہو جاتا؟ اور کیا وہ محض "خوفِ مرگ" کے زیرِ اثر مخلوق کے ہزاروں بے بنیاد خوف اپنے دل و دماغ پر مسلط نہیں کیے ہوئے؟ جب "حبِّ مال" اور "خوفِ مرگ"

---

[1] کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (آیۂ قرآنی) کتنی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑے جماعت پر فتح پالیتی ہے۔

[2] غازیِ اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس۔

حواس و عزائم کو اس بری طرح سے مغلوب و معطل کئے ہوئے ہوں تو پھر قوم میں "ذوقِ خطر" اور "شوقِ جہاد" کیونکر پیدا ہوگا؟

ہاں، ہماری تمام روحانی اور باطنی امراض کا علاج آج بھی ہمارے پاس موجود ہے اور وہ یہ کہ ہم "خوفِ مرگ" کی بجائے "خوفِ خدا" اختیار کریں اور "حبِ مال" کی بجائے "حبِ رسول" میں پختہ و خالص ہوں۔ صرف یہی علاج ہمیں وہ "عظمتِ رفتہ" دوبارہ دلا سکتا ہے، جس کا میں نے اوپر تذکرہ کیا:۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبالؔ)

پس حقیقی مقصدِ حیات کے متعلق تعلیماتِ قرآنی، ارشاداتِ نبویؐ، اور سیرِ صحابہؓ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مجھے اس مضمون کے آخر میں یہ الفاظ کہنے دیجئے کہ:۔

ہزار لعنت اس "زندگی" پر جو ذوقِ خطر اور شوقِ جہاد سے بالکل محروم ہے کیونکہ ایسی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے!

خدا کی لاکھ رحمت اس زندگی پر جو ذوقِ خطر اور شوقِ جہاد سے ہمہ وقت معمور و گرم خیز ہے۔ کیونکہ وہ عارضی و فانی ہو کر بھی ایک دائمی و ابدی زندگی ہے ـــــ وہ زندگی جس کی ضربِ کلیمی سے موت کوسوں دور بھاگتی ہے!

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ
بندۂ حق تو شیر ہے اور موت ہرن جس پر وہ حملہ آور ہوتا ہے — موت اس کے سو مرتبوں میں ایک مرتبہ ہے
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام
وہ مردِ کامل موت پر اس بے باکی سے جھپٹتا ہے — جیسے ایک باز کبوتر پر حملہ آور ہوتا ہے

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
غلام تو ہر لمحہ موت کے خوف سے مرتا رہتا ہے — اور اس کی زندگی خوفِ مرگ سے حرام ہو جاتی ہے

بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر
لیکن مردِ آزاد کی شان ہی کچھ اور ہے — اور موت اسے ایک نئی روح عطا کرتی ہے

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگ آزاداں ز آنے بیش نیست
اسے صرف عرفانِ نفس کا ذوق ہے موت کا خدشہ نہیں — اور آزادوں کی موت ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہوا کرتی

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد — زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد
اس موت سے بلند تر ہو جا جو قبر سے تعلق رکھتی ہے — کیونکہ یہ تو محض درندوں اور چوپایوں کی موت ہے

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
مردِ مومن تو اللہ تعالیٰ سے وہ موت چاہتا ہے — جو پستیٔ خاک سے آزاد و بلند تر ہو

آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
وہ دوسری موت جو راہِ عشق کی انتہا ہے: — وہ موت جو عشق کے میدانِ جنگ میں آخری تکبیر ہے

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضےٰ چیزے دگر
اگرچہ ہر موت مومن کے لئے شیریں و خوشگوار ہے — تاہم فرزندِ علی کی موت کچھ اور شان رکھتی ہے

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است
دنیوی بادشاہوں کی جنگ تو سراسر تباہی و بربادی ہے — لیکن مومن کی جنگ (جہاد) سنّتِ پیغمبری ہے

جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست! — ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست!
مومن کی جنگ کیا ہے؟ اپنے دوست (خدا) کی طرف ہجرت — اور دنیائے دوں کو چھوڑ کر کوچۂ محبوب اختیار کرنا

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانیِ اسلام گفت[1]
وہ ہستیِ مقدس جس نے قوموں کو درسِ عشق دیا تھا — جنگ (جہاد) کو اسلام کی رہبانیت فرمایا

---

[1] حاشیہ بر صفحہ ۴۶۴

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را

یعنی سچ تو یہ ہے کہ شہید کے سوا یہ نکتہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا

کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را (جاوید نامہ)

کیونکہ اس نے یہ نکتہ قیمتِ خون دے کر خریدا ہے

اور ایسا مردِ خطرات و مہمات قیام و استحکامِ حق کے لئے شہید ہو کر بھی کہتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ :-

جان دی، دی ہوئی تری ہی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حاشیہ صفحہ ۴۶۲

ؔ الْجِهَادُ رُهْبَانِيَّةُ الْإِسْلَامِ۔

یعنی " اسلام کی رہبانیت جہاد ہے۔"

اقبالؒ کا فلسفۂ تخریب و تعمیر

گفت رُومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند؟

اقبالؒ

اقبالؒ کا فلسفۂ تخریب و تعمیر

آپ اس عنوان کو دیکھتے ہی متعجب ہوں گے کہ بیک وقت "تخریب" اور "تعمیر" جیسی دو متضاد چیزوں میں ربط و تعلق کیا؟ اور پھر وہ بھی کلام اقبالؒ کے ضمن میں جو سراپا درسِ تعمیر واقع ہوا ہے اور عناصر تخریب کی کوئی جھلک تک نہیں رکھتا؟ — جی ہاں یہ اعتراض بالکل بجا اور اس کا تسلی بخش جواب مولف پر فرض جب بحرِ اقبالؒ سے یہ نادر و نو گوہرِ معانی نکالا ہے تو اس کے حسنِ باطنی کا تجزیہ اور اس کی حکیمانہ قیمتیات کی تعیین بھی مجھ پر واجب ہو چکی ہے۔

پیشتر ازیں کہ اس موضوع پر کلامِ اقبال سے موزوں مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کی وضاحت کی جائے "تخریب و تعمیر" کے تصور کا وہ فطری اور اسلامی پس منظر معلوم کرنا نہایت ضروری ہے، جو فکرِ اقبالؒ کی حقیقی اساس واقع ہوا ہے۔ اس ضمن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تخریب" یا "بربادی" کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ — سادہ و بیّن جواب یہ ہے کہ "باطل" کے عناصر دنیا میں فروغ پکڑ رہے تھے لہذا ایسے گمراہ کن دور میں انسانیت کو ظلم و ستم، فسق و فجور اور شرک و بدعت سے

سے نجات دلانے کے لئے ضلالت یا تخریبی قوتوں کی بیخ کنی ہر مردِ مومن پر فرض ہو گئی۔ اور پھر اس عمل جہاد با لباطل کے بعد "تعبیر" کی ضرورت و اہمیت خود واضح ہو جاتی ہے کہ کفر و باطل نے انسانی قلب و دماغ میں جو مصنوعی اور بے سند چیزیں ٹھونس رکھی تھیں، ان کی جگہ توحید و سنت اور راستبازی کے مفید و صحت مند نقوش مرتسم کئے جائیں گے اور ہوا و ہوس میں گھرے ہوئے انسان کو اس کے فراموش شدہ عہد "بلیٰ" سے قریب تر لایا جائے گا۔

"اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ"[1] کے جواب میں عہدِ "بَلٰى"[2] تو روزِ ازل عالمِ ارواح ہی میں متعین ہو چکا تھا، لیکن ہبوطِ آدم کے بعد نسلِ آدم کیلئے عالمِ سفلی میں بھی بذریعہ وحی یہ اعلانِ برحق کرتے ہوئے ایک بھولی بسری حقیقت کی یاد دہانی کرائی گئی کہ

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ	نیکی کو بدی سے بالکل الگ اور واضح کر کے
بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ م بِاللّٰهِ فَقَدِ	دکھا دیا گیا ہے۔ اب جو کوئی شیطانی طریق
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ	عمل سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے،
لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○	اس نے ایسا مضبوط کڑا تھام لیا جو ٹوٹ نہیں
(پ ۳ : ۲ ع)	سکتا اور اللہ رسب کچھ، سنتا اور جانتا ہے۔

اور تمام عناصرِ ضلالت سے اصولِ رشد و ہدایت کو ممیز کر دینے کے بعد دنیا کے جس دور میں تبانِ ہوا و ہوس نے سرکشی کی اور "باطل" نے زور پکڑا تو پھر "حق" کی ایک ہی ضرب کاری نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال کے مروجہ نظامِ باطل

---

[1] کیا میں ہی تمہارا حقیقی خالق و پروردگار اور معبودِ برحق نہیں ہوں۔"

[2] "بے شک تو ہی ہے۔"

کو یوں آناً فاناً نابود کر دیا کہ گویا وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔ ملاحظہ ہو حق کا یہ ناقابلِ مقاومت حملہ :-

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ
فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ
الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝

(پ ۱۷ : ع ۲)

بات یہ ہے کہ ہم حق کو (ایک پتھر کی طرح) باطل کے سر پر دے مارتے ہیں (اور اس ضرب سے) باطل کا کچومر نکل آتا ہے اور وہ اسی دم فنا ہو جاتا ہے اور (مشرکو) جو باتیں تم بناتے ہو ان سے خراب ہو گے۔

اور یہ نظامِ باطل اس سہولت (و تیز رفتاری) سے کیوں فنا نہ ہو جبکہ مشاہدات کے علاوہ زبانِ الٰہی میں بھی وہ مکڑی کے جالے سے زیادہ بودا اور ناپائدار واقع ہوا ہے :-

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ
اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ
لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ۝

(پ ۲۰ : ۱۶ ع)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے دوست (و حاجت روا دیوتا) بنا رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جو (اپنے نزدیک) ایک مضبوط گھر بناتی ہے، حالانکہ سب گھروں میں بودے سے بودا گھر مکڑی کا ہے، کاش یہ لوگ (باطل کے اس ضعف و اضمحلال کو) سمجھتے۔

پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب تخریبی عناصر (باطل) کے برباد ہونے کا وقت آجائے اور تعمیری عناصر (اصولِ حق) غلبہ و اقتدار حاصل کر رہے ہوں تو دنیا کی کوئی قوت پیروانِ باطل کو ہلاکت سے بچا نہیں سکتی۔ بالفاظ دیگر "حق" کا یہ فطری حق ہے کہ وہ فتح

پائے اور "باطل" کے لئے ازل سے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ شکست و ذلت سے دو چار ہو۔ چنانچہ:۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ہ (پ ۱۵: ۹ ع)

دین حق آگیا اور دین باطل (اس کے آنے سے) از خود فنا ہو گیا اور باطل کو تو (آخرکار) مٹنا ہی تھا۔

اور پھر جب کبھی حق نے دنیا میں غلبہ و اقتدار حاصل کیا تو باطل ہزار حیلہ سازیوں اور لغو و مضحکہ خیز کوششوں کے باوجود روحِ حق کو کوئی ضعف نہیں پہنچا سکا۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ہ (پ ۲۸: ۹ ع)

کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (قرآن اسلام) کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو کمل کر کے رہے گا۔ اگرچہ یہ چیز کافروں کو ناگوار گزرے۔

علامہ اقبال نے بھی ازلی حقیقت بالفاظ ذیل بیان فرمائی:۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

پس ظاہر ہے کہ جب تک نظام باطل کے لئے "تخریب" کا عمل مکمل نہ ہو اور عناصر شر کی پوری طرح بیخ کنی نہ کر لی جائے، تعمیر و اصلاح کا دور شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی ملک یا کسی قوم میں حق و باطل یا خیر و شر یا صدق و کذب، یا نیکی و بدی مخلوط صورت میں نتیجۃً گمراہی و کجروی، اور عقائد و اعمال میں تذبذب کا باعث رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی اکثر جگہ یہ مفہوم دہرایا کہ:۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ

اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ مخلوط نہ کرو اور جان

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (پ : ۶۵) بوجھ کر حق بات کو مت چھپاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے کو حق اور باطل کی مخلوط و مرکّب صورت اس قدر ناگوار ہے اور وہ اسے نوعِ انسانی کے حق میں اس حد تک منبعِ فتنہ و فساد سمجھتا ہے کہ اپنے پیغمبر برحق کو اس وقت تک کفار اور منافقین کے قتلِ عام کا حکم دیا، جب تک زمین ان کے فتنہ انگیز وجود سے قطعی طور پر پاک و صاف نہ ہو جائے، اور جب تک دین حق (اسلام) تمام دنیا میں اپنی خالص اور مکمل شکل و ہیئت کے ساتھ غلبہ و اقتدار حاصل نہ کرے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (پ ۹ : ۱۹ ع)

(مسلمانو!) کفار و مشرکین سے جہاد کرتے رہو حتّٰی کہ (زمین میں کفر و فسق کا) کوئی فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اگر وہ (فتنہ انگیزی سے) باز آ جائیں تو اللہ ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

سچ پوچھئے تو یہ ہے "تخریب باطل" اور "تعمیر حق" کا وہ شاندار اور مکمل ترین لائحہ عمل جس کی پیروی ہر حق پرست اور ہر مخلص مسلمان پر فرض کی گئی ہے!

جب آپ اپنی مادی و جسمانی ضروریات میں اس قدر ہوشیار و محتاط ہیں کہ ہر چیز کو اس کی "خالص" صورت میں تلاش کرتے ہیں اور اشیائے خوردنی و نوشیدنی مثلاً (دودھ، گھی، آٹا وغیرہ) میں "کھوٹ" یا "ملاوٹ" کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، تو پھر آپ ان عقائد اور اصولِ حیات کے "خالص" اور حسبِ فطرت ہونے پر کیوں مصر نہ ہوں جن پر آپ کی دنیوی و اُخروی فلاح و بہبود کا انحصار ہے؟ — چنانچہ آپ غور فرمائیں تو جہاد فی سبیل اللہ بھی انسانی عقائد و اعمال کے تزکیہ و طہارت اور اصلاح کا وہ مردانہ و شجاعانہ اقدام ہے جو قصرِ باطل کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر ایوانِ حق کی محکم و پائندہ

بنیادیں استوار کرتا ہے اور شرک و فسق کے شجرۂ خبیثہ کو کاٹ کر توحید، تقویٰ اور حسن عمل کے شجرۂ طیبہ کی تخم ریزی کرتا ہے۔ یہ ہے "تخریب و تعمیر" کا وہ اٹل قانون جو صبح ازل سے کار فرما ہے اور جس نے تاریخ امم میں لاتعداد تغیرات و انقلابات پیدا کئے ہیں!

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟

ترجمہ:۔ رومی نے کہا کہ جب ہر پرانی عمارت کو نئے سرے سے تعمیر کیا جاتا ہے تو کیا تو نہیں جانتا کہ پہلے اس عمارت کو مکمل طور پر مسمار و منہدم کر لیا جاتا ہے؟

ہاں تو ذرا ایک لمحے کے لئے غور فرمائیے کہ مختلف ادوار تاریخ میں کس قدر اقوام و ملل قدرت کے اس "عمل تخریب" کا شکار ہوئی ہیں۔ زیادہ نہیں تو صرف عاد، ثمود، قوم لوط، قوم نوح، فرعون و آل فرعون، اور بنی اسرائیل وغیرہ ہی کو لے لیجئے اور چشم عبرت سے مشاہدہ فرمائیے کہ خدائے ذوالجلال کا دست مختار دنیوی قیام حق کے لئے تباہی باطل میں کوئی رعایت و تاخیر بھی کرتا ہے؟ ــــ اس کا دوامی اعلان تو یہ ہے کہ۔

مرتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی، کٹتی جائیں گی (حالی)

آپ اس غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہ ہوں کہ "تخریب باطل" اور "تعمیر حق" کا یہ عمل صرف انبیائے کرام اور ان کے معجزات تک ہی محدود چلا آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر امت کے علماء، اولیاء، اور صلحاء بھی قوم کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تعمیر کے لئے حکماً مکلف کئے گئے ہیں اور اس کے عملی شواہد تاریخ کے صفحات میں آج بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کورانہ تقلید کی شدید مذمت کرتے ہوئے

تجدد و اجتہاد کی پے درپے تاکید کی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ :-

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے   اقبال

پس یہ ایک مقلد و منفعل شخص نہیں بلکہ وہ مجدد و مجتہد غالب و قاہر اور صاحب تسخیر ہستی ہے جو اقبال کے "مرد مومن" — "مرد حق" یا — "نائب حق" کا روپ بھر کر وہ کچھ کر دکھاتی ہے، جس کا تذکرہ مندرجہ ذیل اشعار میں کیا گیا :-

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تُو
پُختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

تخریب و تعمیر پر کلامِ اقبالؒ

فلسفۂ تخریب و تعمیر کے جس مفہوم و مقصد کی وضاحت گذشتہ صفحات میں کی گئی ہے اب اس کے پیشِ نظر کلامِ اقبالؒ سے مندرجہ ذیل مثالوں پر غور فرمائیے:۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است

دنیا میں خدا کا خلیفہ ہونا بہت مبارک چیز ہے — اور عناصر پر حکمران ہونا بھی بہت مبارک ہے

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستئ او ظلِ اسم اعظم است

خدا کا خلیفہ گویا دنیا کی روح ہے — اور اس کی ہستی خدا کے اسم اعظم کا سایہ ہے

از رموزِ جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود

وہ جزو و کل کے اسرار سے باخبر ہے — اور دنیا میں اللہ کے حکم سے قائم و محکم ہے

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند — ایں بساطِ کہنہ را برہم زند

جب وہ دنیا کی وسعت میں خیمہ گاڑتا ہے — تو اس کے پرانے فرش کو توڑ پھوڑ دیتا ہے

فطرتش معمور و می خواہد نمود — عالمے دیگر بیارد در وجود

اس کی فطرت معمور حق ہے اور اظہار کے لئے بیتاب — وہ قوت تسخیر سے ایک اور دنیا وجود میں لاتا ہے

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کل — روید از کشتِ خیالِ او چو گل

اس دنیائے جزو و کل کی طرح سینکڑوں دنیائیں — اس کے خیال کی کھیتی سے پھولوں کی طرح اگتی ہے

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را — از حرم بیروں کند اصنام را

وہ ہر خام چیز کی فطرت کو پختہ کرتا ہے — اور بتوں کو کعبہ سے باہر نکال پھینکتا ہے

شیب را آموزد آہنگِ شباب — می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

وہ بڑھاپے کو تحصیل شباب کا طریقہ سکھاتا ہے — اور ہر چیز کو از سرِ نو رنگِ شباب عطا کرتا ہے

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر — ہم سپاہی ہم سپہگر ہم امیر

وہ نوعِ انسانی کو خوشخبری سنانیوالا بھی ہے اور ڈرانیوالا بھی — وہ سپاہی بھی ہے، سپاہ گر بھی ہے، اور امیرِ لشکر بھی

چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار — تیز تر گردد سمندِ روزگار

جب وہ شہسوار باگ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے — تو اسپ زمانہ کی رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے

از قُمِ او خیزد اندر گورِ تن — مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

جب وہ کہتا ہے کہ "اٹھ" تو جسم کی قبر میں مردہ روحیں — یوں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جیسے چمن میں صنوبر

ذاتِ او توجیہہ ذاتِ عالم است — از جلالِ او نجاتِ عالم است

اس کی ہستی وجودِ عالم کی اصل تعبیر ہے — اور اس کے جلال سے دنیا کی نجات ہے

زندگی بخشد ز اعجازِ عمل

وہ اپنے اعجازِ عمل سے دنیا کو نئی زندگی دیتا ہے

می کند تجدیدِ اندازِ عمل (اسرارِ خودی)

اور لوگوں کے طریقِ عمل میں روحِ جدت پیدا کرتا ہے

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ — جامِ تو فریادیٔ بیدادِ سنگ

اے کہ جو آسمان کے جور و جفا سے تنگ ہو رہا ہے — اور تیرا جام پتھر کے ظلم و ستم پر فریاد کر رہا ہے

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا — سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا

یہ آہ و نالہ اور فریاد کب تک کرتا رہے گا؟ — اور غم و رنج میں اپنا سینہ کب تک پیٹتا رہے گا؟

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات

درحقیقت مضمونِ زندگی تو عمل میں پوشیدہ ہے — اور عمل ہی سے قانونِ زندگی کی تخلیق میں لطف ہے

خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو

اٹھ اور قوتِ تسخیر سے ایک نئی دنیا پیدا کر — شعلۂ حق اپنے سینہ میں رکھ اور خلیل اللہ کا سا نعرۂ توحید لگا

جہانِ نا مساعد ساختن ‏ ‏ ‏ ‏ بست در میداں سپر انداختن

ناموافق دنیا پر قناعت کر بیٹھنا ‏ ‏ ‏ ‏ گویا میدانِ جنگ میں ڈھال رکھ دیتا ہے

رِ خود دارے کہ باشد پختہ کار ‏ ‏ ‏ ‏ با مزاجِ او بسازد روزگار

مردِ خود دار جو تجربہ کار و پختہ کار بھی ہو ‏ ‏ ‏ ‏ زمانہ اس کے مزاج سے موافقت کیا کرتا ہے

نہ سازد با مزاجِ او جہاں ‏ ‏ ‏ ‏ می شود جنگ آزما با آسماں

دنیا اس کے مزاج کے مطابق نہ ہو ‏ ‏ ‏ ‏ تو وہ آسمان سے جنگ آزما ہوتا ہے

بلند بنیادِ موجودات را ‏ ‏ ‏ ‏ می دہد ترکیبِ نو ذرات را

قوتِ حق سے کائنات کی بنیادیں اکھیڑ پھینکتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ اور نئے ذرات سے نئی دنیا تعمیر کرتا ہے

دش ایام را برہم زند ‏ ‏ ‏ ‏ چرخِ نیلی فام را برہم زند

گردشِ ایام کو درہم برہم کر دیتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ اور نیلے آسمان کی بھی دھجیاں اڑا دیتا ہے

کند از قوتِ خود آشکار ‏ ‏ ‏ ‏ روزگارِ نو کہ باشد سازگار

اپنی قوتِ تسخیر سے ایک ایسی نئی دنیا ‏ ‏ ‏ ‏ وجود میں لاتا ہے جو اس کے مزاج کے مطابق ہو

رجہاں نتواں اگر مردانہ زیست ‏ ‏ ‏ ‏ ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

دنیا میں انسان مردانہ وار زندگی بسر نہ کر سکے ‏ ‏ ‏ ‏ تو پھر مردوں ہی کی طرح جان دینا زندگی ہے

زماید صاحبِ قلبِ سلیم ‏ ‏ ‏ ‏ زورِ خود را از مہماتِ عظیم

کے سینہ میں ایک دلِ زندہ ہو وہ اپنی طاقت ‏ ‏ ‏ ‏ کو بڑی بڑی مہموں کی تسخیر سے آزماتا ہے

شق باد شوار در زیدن خوش است ‏ ‏ ‏ ‏ چوں خلیل از شعلہ گُل چیدن خوش است

ق کا لطف تو کسی مشکل مہم ہی سے آتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ اور ابراہیم کی طرح شعلوں سے پھول چننا ہی خوشگوار ہے

مکناتِ قوتِ مردانِ کار ‏ ‏ ‏ ‏ گردد از مشکل پسندی آشکار

دانِ عمل کی قوتِ مخفی کی ممکنات ‏ ‏ ‏ ‏ صرف مشکل پسندی ہی سے ظاہر ہوتی ہیں

حربۂ دوں ہمتاں کین است وبس — زندگی را ایں یک آئین است وبس

پست ہمت لوگوں کا ہتھیار تو صرف بغض ہے — اور وہ اسی چیز کو زندگی کا آئین سمجھتے ہیں

زندگانی قوتِ پیدا ستے

حالانکہ زندگی ایک ظاہر و پیدا قوت ہے

اصل او از ذوقِ استیلا ستے (اسرار خودی)

اور اس کی بنیاد ذوقِ غلبہ و تسخیر پر رکھی گئی ہے

باز گفتم پیشِ حق رفتن چساں! — کوہ خاک و آب را گفتن چساں؟

پھر میں نے پوچھا کہ خدا کے سامنے جا حاضر ہونا کس طرح! — اور دنیا کے کوہ خاک و آب کو شق کرنا کس طرح؟

آمر و خالق بروں از امرِ خلق — ما ز شمشیرِ روزگاراں خستہ حلق

جو خالق و حاکم ہے وہ تو مخلوق و حکم سے الگ ہے — اور ہم یہاں ضرب ہائے زمانہ سے خستہ حلق ہیں۔

گفت اگر "سلطاں" ترا آید بدست[1] — می تواں افلاک را از ہم شکست

اس نے کہا اگر تیرے ہاتھ زور و قوت آجائے — تو پھر آسمانوں کو بھی توڑا پھوڑا جا سکتا ہے

باش تا عریاں شود ایں کائنات — شوید از دامانِ خود گردِ جہات

ذرا صبر کر حتیٰ کہ یہ کائنات بے نقاب ہو جائے — اور اپنے دامن سے سمتوں کا غبار جھاڑ دے

---

[1] "سلطان" سے تلمیح مقصود ہے اس آیہ شریفہ کی طرف: یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ (اے جنوں اور آدمیوں کے گروہ! اگر تم سے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے ہو کر کہیں نکل بھاگو (اور اللہ کے قبضہ و اختیار سے باہر ہو جاؤ) تو ذرا نکل دیکھو۔ مگر یاد رہے کہ نکلنا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ تم میں اس قدر) زور و قوت ہو۔"

در وجودِ او نہ کم بینی نہ بیش — خویش را بینی ازو او را ز خویش
تو خدا کے وجود میں کوئی کمی زیادتی نہیں دیکھے گا — خود کو اس کے نور سے دیکھے گا اور اس کو اپنے نور سے

نکتۂ "اِلّا بسُلطاں" یاد گیر — ورنہ چوں مور و ملخ در گل بمیر
پس تو "اِلّا بسلطان" کا نکتہ خوب سمجھ لے — ورنہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح مٹی میں مرجا

از طریقِ زادن اے مردِ نکوئے — آمدی اندر جہانِ چار سوئے
اے مردِ نیک! تو اس دنیائے چار سو میں — "ولادت" کے طریقے سے وارد ہوا ہے

ہم بروں جستن بزادن می تواں — بندہا از خود کشادن می تواں
اسی طرح دنیا سے باہر پھاندنا بھی ولادت سے ممکن ہے — اور اپنے وجود کے قید و بند توڑنا بھی ممکن ہے

لیکن ایں زادن نہ از آب و گل است — داند او مردے کہ او صاحبدل است
لیکن یہ "ولادت" پانی اور مٹی سے نہیں ہے — اس راز کو ایک صاحبِ دل شخص ہی سمجھ سکتا ہے

آں ز مجبوری است ایں از اختیار — آں نہاں در پردہ ہا ایں آشکار
وہ ولادتِ جسمی تو مجبوری سے ہے اور یہ اختیار سے — وہ پردوں میں پوشیدہ تھی اور یہ بالکل آشکار ہے

آں یکے با گریہ[1] ایں با خندہ ایست — یعنی آں جوئندہ ایں یابندہ ایست
وہ ولادت تو رونے سے عمل میں آئی اور یہ ہنسنے سے ہے — یعنی وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی اور اس نے مقصود پالیا

آں[2] سکون و سیر اندر کائنات — ایں سراپا سیر بیروں از جہات
وہ تو صرف سیر و سکونِ کائنات میں محدود تھی — اور یہ سراپا سیر ہے، اور سمتوں کی قید سے آزاد

آں یکے محتاجِ روز و شب است — واں دگر روز و شب او را مرکب است
وہ ولادت رات اور دن کی محتاجی ہے — اور دوسری روز و شب کو اپنی سواری بنا لینا

---

[1] مگر نعرۂ قرآن سے، گزشتہ آیت ہی کا جزو ہے

[2] کیونکہ بچہ پیدا ہوتے وقت روتا ہے۔

زادنِ طفل از شکستِ اشکم است   زادنِ مرد از شکستِ عالم است

بچے کا پیدا ہونا تو پیٹ کے پھوٹنے سے ہے   لیکن مردِ حق کا پیدا ہونا دنیا کے ٹوٹنے پھوٹنے سے ہے

زادن اندر عالمے دیگر خوش است   تا شباب دیگرے آید بدست

دوسری دنیائے باطنی میں پیدا ہونا ہی خوشگوار ہے   تاکہ زندگی کو اس عمل سے نیا شباب حاصل ہو

ہر دو زادن را دلیل آمد اذان   آں بلب گویند و ایں از عینِ جاں

ہر دو پیدائشوں کی بنیاد اذان ہی پر ہے   لیکن وہ اذان ہونٹوں سے کہی جاتی ہے اور یہ روح سے

جانِ بیدارے چو زاید در بدن

جب بھی کسی کے جسم میں روحِ بیدار پیدا ہوتی ہے

لرزہ ہا افتد دریں دیرِ کہن (جاوید نامہ)

تو اس پرانے تبکدے (دنیا) میں زلزلے برپا ہونے لگتے ہیں

نیست عالم جز بتانِ چشم و گوش   اینکہ ہر فردائے او میرد چو دوش

یہ دنیا بتانِ چشم و گوش سے زیادہ کچھ نہیں   یہ دنیا جس کا ہر آنے والا کل گذشتہ کی طرح مر جاتا ہے

در بیابانِ طلب دیوانہ شو   یعنی ابراہیمِ ایں بت خانہ شو

پس تو اس دشتِ جستجو میں دیوانہ وار کوشش کر   یعنی اس بت خانۂ دنیا کو مثلِ ابراہیم پاش پاش کر دے

چوں زمین و آسماں را طے کنی   ایں جہان و آں جہاں را طے کنی

جب تو زمین اور آسمان کو طے کر جائے گا   تو گویا اس جہان اور اُس جہان کو بھی طے کر جائیگا

از خدا ہفت آسماں دیگر طلب   صد زمان و صد مکاں دیگر طلب

خدا سے سات آسمان اور طلب کر   اور اسی طرح سو زمان و مکان اور طلب کر

بے خود افتادن لبِ جوئے بہشت   بے نیاز از حرب و ضرب و خوب و زشت

بہشت کی نہر کے کنارے مست و مدہوش پڑے رہنا   اور اس طرح جنگ و جہاد اور امتیازِ حق و باطل سے بے نیاز ہو جانا

گر نجاتِ ما فراغ از جستجو ست — گور خوشتر از بہشتِ رنگ و بو ست

اگر ہماری نجات الٰہی جستجو سے کنارہ کش ہونے میں ہے — تو پھر بہشتِ عیش و آرام سے تو قبر ہی بہتر ہے

اے مسافر جاں بمیرد از مقام

اے مسافر! روح تو سکون و جمود سے مرجاتی ہے

زندہ تر گردد ز پرواز مدام (جاوید نامہ)

روح صرف دائمی پرواز ہی سے زندہ و پائندہ رہتی ہے

خویشتن را وا نمودن زندگی است — ضربِ خود را آزمودن زندگی است

اپنی قوتِ باطن کو ظاہر کرنا ہی زندگی ہے — اور اپنی ضرب کو کسی مہم سے آزمانا ہی زندگی ہے

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست — ہر جہاں اندر بر او چوں قبا ست

بندۂ مومن خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے — ہر دنیا اس کے جسم پر قبا کی طرح موزوں ہے

چوں کہن گردد جہانے در برش

جب ایک دنیا اس کے جسم پر بوسیدہ ہو جاتی ہے

می دہد قرآں جہانے دیگرش (جاوید نامہ)

تو قرآن اسے ایک نئی دنیا عطا کرتا ہے

کلکِ حق از نقش ہائے خوب و زشت — ہر چہ ما را سازگار آمد نوشت

اچھے اور برے نقوش میں سے قدرت کے قلم نے — جو نقش ہمارے حق میں سازگار تھا وہی بنایا

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب؟ — از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب!

اے مردِ نیک اصل! کیا تو جانتا ہے کہ "ہونا" کے کیا معنی ہیں؟ — ذاتِ الٰہی کے حُسن سے پورا پورا حصہ پانا!

آفریدن؟ جستجوئے دلبرے — وا نمودن خویش را بر دیگرے

اور پھر "پیدا کرنا"، کیا معنی؟ محبوب کی جستجو! — کسی پر اپنے حسنِ باطن کا اظہار!

این همه هنگامه هائے هست و بود ــــ بے جمالِ ما نیاید در وجود
اس دنیا کا تمام ہنگامۂ ہست و بود ــــ ہمارے حسن کے بغیر وجود ہی میں نہیں آسکتا
زندگی هم فانی و هم باقی است ــــ این همه خلاقی و مشتاقی است
زندگی اپنے عمل کے لحاظ سے فانی بھی ہے اور باقی بھی ــــ اور حقیقتاً وہ ایک قوتِ تخلیق و جستجو ہے
زندهٔ؟ مشتاق شو خلاق شو ــــ همچو ما گیرندهٔ آفاق شو
اگر تو زندہ ہے تو آرزومند ہو اور کچھ پیدا کر دکھا ــــ اور ہماری طرح دنیا کو محکوم و مسخر کر
در شکن آں را که ناید سازگار ــــ از ضمیرِ خود دگر عالم بیار
جو کچھ تجھ سے موافق نہیں اسے تباہ کر دے ــــ اور پھر اپنے ضمیر سے ایک نئی دنیا پیدا کر
بندهٔ آزاد را آید گراں ــــ زیستن اندر جهانِ دیگراں
بندہ آزاد و خوددار کے لئے دوسروں کی دنیا میں ــــ زندہ رہنا نہایت تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہے
هر که او را قوتِ تخلیق نیست ــــ پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
ہر وہ شخص جس میں پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے ــــ ہمارے نزدیک کافر و زندیق سے کسی طرح کم نہیں ہے
از جمالِ ما نصیبِ خود نبرد ــــ از نخیلِ زندگانی بر نخورد
اس نے ہمارے حسن سے اپنا حصہ نہ لیا ــــ اور زندگی کے درخت سے پھل نہ کھایا

مردِ حق! برنده چوں شمشیر باش
اے مردِ حق: تلوار کی طرح تیز کاٹنے والا بن
خود جهانِ خویش را تقدیر باش (جاوید نامہ)
اور اپنی دنیا کی تقدیر آپ بن جا

مرغک اندر شاخسارِ بوستاں ــــ بر مرادِ خویش بندد آشیاں
ایک پرندہ بھی باغ کی شاخوں میں ــــ اپنی منشا کے مطابق گھونسلا بناتا ہے

توکہ داری فکرتِ گردوں مسیر — خویش را از مرغکے کمتر مگیر

توکہ آسمان کی سیر کرنے والی فکر رکھتا ہے — خود کو ایک پرندے سے تو کمتر نہ سمجھ

دیگر ایں نُہ آسماں تعمیر کُن — بر مرادِ خود جہاں تعمیر کُن

تو اُن نو آسمانوں کو از سرِ نو تعمیر کر — اور اپنی منشا کے مطابق ایک نئی دنیا تعمیر کر

چوں فنا اندر رضائے حق شود — بندۂ مومن قضائے حق شود

جب بندۂ مومن رضائے حق میں فنا ہو جاتا ہے — تو وہ خود ہی تقدیرِ حق بن جاتا ہے

چار سوئے با فضائے نیلگوں — از ضمیرِ پاکِ او آید بروں

ایک نئی دنیائے چار سو اور نیا نیلا آسماں — اس کے پاک ضمیر سے وجود میں آتا ہے

در رضائے حق فنا شو چوں سلف

اپنے آباؤ اجداد کی طرح رضائے حق میں فنا ہو جا

گوہرِ خود را بروں آر از صدف (پس چہ باید کرد)

اور اپنے موتی کو صدف سے باہر نکال

جہانِ ما کہ نابود است بودش

ہماری دنیا جس کا وجود عدم کا حامل ہے

زیاں توام ہمی زاید ز سودش

اور اس کے فائدہ کے ساتھ ہی ساتھ نقصان بھی لازم ہے

کہن را نو کن و طرحِ دگر ریز

لہذا نئی دنیا کی بنیاد رکھ اور پرانے نظام کو نیا کر

دلِ ما بر نتابد دیر زودش (پیامِ مشرق)

ہمارا دل اس کے جلد اور دیر کو برداشت نہیں کرسکتا

افسرِ پادشہی رفت و بہ یغمائی رفت

تاج شاہی فنا ہو گیا اور تاخت و تاراج سے فنا ہوا

نئے اسکندری و نغمۂ دارائی رفت

اور اس طرح سکندر کی نَفَسری اور دارا کا نغمہ بھی فنا ہو گیا

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست

کوہکن ہاتھ میں تیشہ لیے آیا اور اس نے پرویزی (شاہی) کا مطالبہ کیا

عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت

مالک و آقا کی عشرت اور محکوم و غلام کی مشقت ختم ہوئی

یوسفی را ز اسیری بہ عزیزی بردند

یوسف کو قید سے نکال کر عزیزِ مصر کے تخت پر لے گئے

ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت

اور زلیخا کا سب افسانہ و جادو فنا ہو گیا

رازہائے کہ نہاں بود بہ بازار افتاد

جو راز پوشیدہ تھے وہ برسرِ عام آ گئے

آں سخن سازی و آں انجمن آرائی رفت

وہ بحث و تمحیص اور وہ مجلس آرائی جاتی رہی

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است

اگر تیری آنکھ صاحب نظر ہے تو خوب غور سے دیکھ

زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است (پیامِ مشرق)

کہ زندگی ایک نئی دنیا کی تعمیر میں مصروف ہے

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز

آ اور سن کہ تارِ ساز سے نئے نغمے پیدا ہو رہے ہیں

مے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

ہم وہ شراب پیالے میں ڈالیں جو صراحی کو پگھلا دیتی ہے

مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم

پیرِ مغاں اور اس کے میخانہ کو تازہ و نو نظام عطا کریں

بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

اور پرانے میخانوں کی بنیادیں اکھیڑ کر پھینک دیں

ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم

چمن کے ڈاکوؤں سے تباہیٔ لالہ و گل کا انتقام لیں

بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

اور غنچہ و گل کی محفل ایک نئی بنیاد پر استوار کریں

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے؟

تو پروانے کی طرح شمع کے طواف میں کب تک زندگی بسر کرے گا

زخویشتن ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے؟ (پیامِ مشرق)

اور اپنی تجلیٔ فطرت سے کب تک بیگانہ و محروم رہیگا

جواں مردے کہ خود را فاش بیند

وہ جوانمرد جو اپنی قوتِ باطن کو صاف صاف دیکھ لے

جہانِ کہنہ را باز آفریند

پرانی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اسے از سرِ نو بناتا ہے

ہزاراں انجمن اندر طوافش
ہزاروں محفلیں اس جوان کے طواف میں رہتی ہیں
کہ او با خویشتن خلوت گزیند (از ارمغان حجاز)
کیونکہ وہ اپنے آپ سے تنہا مجلس اختیار کئے ہوئے ہے

مگو با من خدائے ما چنیں کرد
تو یہ نہ کہہ کہ میرے خدا نے تو میرے ساتھ ایسا اور ایسا سلوک کیا
کہ شستن می تواں از دامنش گرد
کیونکہ دامنِ ہستی سے گردِ مصائب جھاڑی بھی جا سکتی ہے
تہ و بالا کن ایں عالم کہ در وے
اور تو اس دنیا کے ظلم و بدنظمی کو برباد ہی کیوں نہیں کر دیتا
قمارے می برد نامرد از مرد (ارمغان حجاز)
جس میں ایک نامرد شخص مرد سے بازی جیت جاتا ہے

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را
وہ مسلمان جو رمزِ دینِ حق کو سمجھتا ہے
نساید پیش غیر اللہ جبیں را
غیر اللہ کے سامنے اپنی پیشانی کبھی نہیں رگڑتا
اگر گردوں بہ کامِ او نہ گردد
اگر آسمان اس کے حسبِ منشا گردش نہیں کرتا -

بکامِ خود بگرداند زمیں را (ارمغانِ حجاز)

تو پھیر دے زمین کو اپنی مرضی کے مطابق ضرور گھماتا ہے

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے

میری خاک اس لئے بلند پرواز ہو رہی ہے کہ ایک نیا آسمان بنائے

ذرۂ ناچیز سے تعمیرِ بیابانے نگر! (زبورِ عجم)

یہ معجزہ بھی دیکھو کہ ایک ذرہ صحرا کی تعمیر پر آمادہ ہے

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند او را

جب دنیا پرانی ہو جاتی ہے تو کارکنانِ قضا و قدر اسے بالکل جلا دیتے ہیں

وز ہماں آب و گل ایجادِ جہاں نیز کنند (زبورِ عجم)

اور اسی کے آب و گل سے ایک نئی دنیا تعمیر کرتے ہیں

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟

خالقِ کائنات نے کہا کہ کیا میری دنیا تجھے سازگار ہے؟

گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن! (زبورِ عجم)

میں نے کہا کہ سازگار نہیں۔ فرمایا کہ اسے تباہ و برباد کر دے

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام

پرانی دنیا کو پاش پاش کر دے اور از سرِ نو اسے تعمیر کر

ہر کہ در ورطۂ لا ماند بہ الا نرسید[1] (زبورِ عجم)

جو شخص بھی نفی کے بھنور میں رہا وہ اثبات کی منزل کو کبھی نہ پہنچا

بہر نفس کہ بر آری جہاں دگرگوں کن

تو جو سانس بھی لے اس سے دنیا کا نقشہ بدلتا چلا جا

دریں رباطِ کہن صورتِ زمانہ گذر

اور اس پرانی سرائے میں زمانے کی طرح گذر کر

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند

اگر اس سفرِ زندگی میں جبریل و حور بھی تیری باگ پکڑیں

کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر (زبورِ عجم)

تو ان کے دل پر اپنی برقِ ناز گرا اور دلبرانہ انداز سے گذر جا

مذہبِ زندہ دلاں خوابِ پریشانے نیست

زندہ دل لوگوں کا مذہب کوئی پریشان خواب نہیں ہے

از ہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است (زبورِ عجم)

بلکہ اسی خاکِ دنیا سے ایک اور نئی دنیا بنانا ہے

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند

وہ قلندر جو اپنے آب و گل کی تسخیر (ضبطِ نفس) میں کوشاں ہیں

---

[1] یعنی جو شخص نفیِ حق پر بضد ہے وہ اثباتِ حق تک کیونکر پہنچے گا؟

زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
گودڑی پہن کر بھی بادشاہوں سے خراج وصول کرتے ہیں
بجلوت اندو کمند بہ مہر و مہ پیچند
وہ محفل میں ہوں تو سورج اور چاند پر اپنی کمندیں پھینکتے ہیں
بخلوت اندو زمان و مکاں در آغوشند
اور تنہائی میں ہوں تو زمان و مکان کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیتے ہیں
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
امن و صلح کے دن وہ سرتا پا ریشم بنے رہتے ہیں ۔
بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند
لیکن بروزِ جنگ وہ اپنی قوت روح سے باخبر اور جسم سے بالکل بےخبر ہیں
نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند
وہ آسمانِ دو رنگ کو ایک نظام تازہ عطا کرتے ہیں
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بردوشند (زبورِ عجم)
اور پرانے ستاروں کے جنازے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں

ایں مہ و مہرِ کہن راہ بجائے نہ برند
یہ پرانے سورج اور چاند تو ہمیں کسی منزل پہ نہیں پہنچائیں گے
انجمِ تازہ بہ تعمیرِ جہاں می بائست (زبورِ عجم)
کیونکہ نئی دنیا کی تعمیر کے لئے ہمیں نئے ستارے درکار ہیں

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

رومی نے کہا کہ جب ہر پرانی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا جاتا ہے

می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند؟ (بانگِ درا)

تو کیا تو نہیں جانتا کہ پہلے اس کو مکمل طور پر منہدم کر لیا جاتا ہے؟

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے (بانگِ درا)

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ (بانگِ درا)

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز (بالِ جبریل)

طلسمِ گنبدِ گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگِ خارہ نہیں (بالِ جبریل)

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے (بالِ جبریل)

یہ عالم، یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم، یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت — تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ — حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس! (بالِ جبریل)

عالمِ نو

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اُسے
کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
جسم اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کفِ خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر! (ضربِ کلیم)

اب اس مضمون کے عنوان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ "تخریب" سے علامہ اقبالؔ کی مراد ہے "تخریبِ باطل" اور "تعمیر" سے اُن کا مقصد ہے "تعمیرِ حق"۔ دنیا کی وہ قومیں جو سراسر باطل کی پیرو ہیں اور جنہیں ہم گلے کی رگیں پھلا پھلا کر "کافر" اور "جہنمی" کہتے ہیں، اُن کا تو ذکر چھوڑئیے، ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ خود مسلمانوں کی طرزِ عمل نے کلام اللہ کے بتائے ہوئے طریقِ حق کو مسخ کر کے یا باطل کو حق میں اس بری طرح مخلوط کر کے کافر اور مسلمان کے درمیان "دوغلے" مسلمانوں کا جو جمِ غفیر پیدا کیا ہے اور جنہیں قرآن "منافقین" کا خطاب دیتا ہے، کیا وہ کفار سے زیادہ گمراہ، زیادہ بدعقیدہ، زیادہ بدعمل اور قوم و ملت کے حق میں زیادہ مہلک و مضر نہیں ہیں؟ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو اللہ اور رسولؐ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے تخریبی عناصر کی مکمل طور پر بیخ کنی کی جائے۔ اور مسلمانوں کو تمام فستق القلب منافقین سے نجات دلا کر مخلصین و صالحین کے گفتار و کردار سے مستفید کیا جائے۔ پس اس نوعیت کی تعمیرِ حق کے لئے

یعنی "تخریبِ باطل" کا عمل جاری رکھنا چاہیئے اور اس لئے مجھے اپنے سابقہ الفاظ ایک مرتبہ پھر دہرانے دیجئے کہ: جب تک نظامِ باطل کے لئے "تخریب" کا عمل نہ ہو اور عناصرِ شر کی پوری طرح بیخ کنی نہ کر لی جائے، تعمیر و اصلاح کا دور شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی ملک یا کسی قوم میں بھی حق و باطل یا خیر و شر یا صدق و کذب یا نیکی و بدی مخلوط صورت میں ہمیشہ گمراہی، کجروی اور عقائد و اعمال میں تذبذب کا باعث رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے بھی اکثر جگہ یہ مفہوم دہرایا:۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ	اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ مخلوط نہ کرو۔ اور
وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (پ ۱ ع ۵)	جان بوجھ کر حق بات کو مت چھپاؤ۔

پس ہر ایسے دور میں جب "دینِ حق" اپنی خالص صورت میں موجود نہ ہو اور انسان کی خود ساختہ شرکیات و بدعات اور رسم و رواج سے اس کی ازلی و فطری شکل و ہیئت کو مسخ کیا جا رہا ہو، ہر مردِ مومن کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ خلیل اللہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے صنم کدہ جہان کے بتانِ وہم و گماں کو پاش پاش کرتے ہوئے "لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" کا عملی درس دے اور توحیدِ الٰہی کو بھولی بھٹکی انسانیت کے دل و دماغ میں جاگزین کرے۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے (اقبال)

ے کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام" (اقبال) یعنی پرانے نظامِ باطل کو توڑ دے اور پھر نئے نظامِ حق کی تعمیر کر"

ے "میں فانی اور زوال پذیر چیزوں کو محبوب نہیں رکھتا۔"

اور یہ بھی یاد رہے کہ جب صنم کدۂ جہاں کے مشرک و باطل پرست پجاری خود ساختہ بتوں کی پرستش پر مصر رہیں اور "سبیل الطاغوت" راہِ شیطانی سے کنارہ کش ہو کر اللہ تعالےٰ کی معین کی ہوئی نہایت روشن و واضح "صراطِ مستقیم" اختیار نہ کریں تو پھر ایک غیرت مند و خود دار مردِ مومن کا طریقِ عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اُس نے تاریک و گمراہ اور مخالف و نامساعد زمانے پر کبھی قناعت نہیں کی بلکہ زمین سے لے کر "چرخِ نیلی فام" تک کی دھجیاں اڑا کر از سرِ نو ایک ایسا صالح، صحت مند، حق اندیش اور منور و سازگار[1] زمانہ پیدا کیا ہے جو ناموسِ ازل کا محافظ ہو، انسان کے مقامِ خلافت[2] و نیابت کا صحیح آئینہ دار ہو اور مقصدِ تخلیقِ کائنات کا مکمل طور پر ترجمان، چنانچہ "تخریب و تعمیر" کے معنوی تقاضوں میں ایسے مردِ باطل شکن و حق آشکار کا یہ فطری خاصہ کبھی نہ بھولیے کہ۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
وہ مردِ خوددار جو تجربہ کار اور پختہ کار بھی ہو — زمانہ اس کے مزاج سے موافقت کیا کرتا ہے

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
اور اگر دنیا اس کے مزاج کے مطابق نہ ہو — تو وہ آسمان سے جنگ آزما ہوتا ہے

برکند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیب نو ذرات را
اور قوتِ حق سے کائنات کی بنیادیں اکھیڑ پھینکتا ہے — اور نئے ذرات سے نئی دنیا تعمیر کرتا ہے

گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
وہ گردشِ ایام کو درہم برہم کر دیتا ہے — اور نیلے آسمان کی بھی دھجیاں اڑا دیتا ہے

---

[1] وہ زمانہ اور وہ ماحول جو "نظامِ حق" کے لئے سو فی صد "سازگار" ہے۔

[2] إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (آیۂ شریفہ)

می کند از قوّت خود آشکار   روزگارِ نو کہ باشد سازگار!

وہ اپنی قوت تسخیر سے ایک ایسی نئی دنیا   وجود میں لاتا ہے جو اس کے مزاج کے مطابق ہو

زندگی بخشد ز اعجازِ عمل   می کند تجدیدِ اندازِ عمل!

وہ اپنے اعجاز عمل سے دنیا کو نئی زندگی دیتا ہے   اور لوگوں کے طریق عمل میں ایک نئی روح پیدا کر دیتا ہے

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را   از حرم بیروں کند اصنام را

وہ ہر خام چیز کی فطرت کو پختہ کرتا ہے   اور بتوں کو کعبہ سے باہر نکال پھینکتا ہے

ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است   از جلالِ او نجاتِ عالم است

اس کی ہستی وجودِ عالم کی اصل تعبیر ہے   اور اسی کے جلال سے دنیا کی نجات ہے

ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست

جس شخص میں (ایک نئی دنیا کے خلق کیلئے) قوت تخلیق نہیں ہے

پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست!

وہ ہمارے نزدیک کافر و زندیق سے کسی طرح کم نہیں

اقبالؒ کی حکمتِ لاؔ و الاّ

لا و الا سازو برگِ اُمتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں!

(اقبالؒ)

اقبالؒ کی حکمتِ لا و الا

کلامِ اقبال میں "لا و الا" سے کیا مراد ہے؟

عربی میں "لا" حرفِ نفی ہے، اور "اِلا" حرفِ استثنیٰ، اور علامہ اقبالؒ بھی اپنے فارسی و اردو کلام میں ہر جگہ ان دو حروف کو انہیں معانی میں استعمال فرماتے ہیں۔ یعنی "لا" سے ان کی مراد ہوتی ہے "نفی غیر اللہ" اور "الا" سے ان کی مراد ہوتی ہے اللہ تعالےٰ کی وحدانیت اور ذات و صفات کا اثبات۔ اسلام میں کلمۂ توحید کی مکمل صورت ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ ــــ جس کا سادہ اور واضح ترجمہ یہ ہے کہ: "کائنات میں کوئی بھی معبودِ برحق نہیں، مگر اللہ تعالےٰ!" ــــ

چنانچہ اس کلمۂ توحید کے پیشِ نظر (جو ہر مسلمان کے ایمان کی روحِ رواں ہے) "لا" سے علامہ اقبالؒ قطعی اور کلی طور پر نفی غیر اللہ فرماتے ہیں۔ اور "اِلا" سے اشارۃً واحد و لاشریک اور معبودِ برحق ہونے کا مفہوم و مطلب اخذ فرماتے ہیں۔ لہٰذا آئندہ چل کر اس موضوع پر ان کا کلام خاطر خواہ طور پر سمجھنے کے لئے ان اصطلاحات کا مذکورہ بالا مفہوم پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اسلام کے نزدیک "لا و اِلاّ" لازم و ملزوم ہیں!

اس تمہید کے بعد یہ حقیقت نہایت واضح اور غیر مبہم طور پر منشرح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں "لاَ و اِلاّ" لازم و ملزوم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے واحد و لاشریک اور معبود برحق ہونے پر ایمان کامل کے لئے لازم آتا ہے کہ اولاً ہم بصمیم قلب غیر اللہ کی نفی کریں، اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے معبود واحد ہونے کا اثبات۔ بہرکیف ایک مسلمان کے ایمان کی تکمیل اسی "نفی و اثبات" پر منحصر ہے اور انہیں کے اتحاد و اجتماع سے اس کا عشق باللہ اور عقیدۂ توحید بدرجۂ کمال پختہ ہوتا ہے:۔

در مقامِ لاَ نیا ساید حیات　　سوئے اِلاّ می خرامد کائنات!

در محبت پختہ کے گردد خلیل　　تا نگردد لاَ سوئے اِلاّ دلیل!

یعنی: "زندگی محض مقامِ "لاَ" (نفی) پر ساکن و جامد ہو کر نہیں رہ جاتی۔ بلکہ کائنات کی فطرت یہ ہے کہ وہ "اِلاّ" (اثبات) کی جانب تیزی سے گامزن ہوتی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت میں کیونکر پختہ و کامل ہو سکتے تھے۔ تا وقتیکہ "لاَ" (نفی غیر اللہ) "اِلاّ" (اثباتِ حق تعالیٰ) کے لئے دلیل راہ نہ بن جاتا؟"

نفیِ بے اثبات محض کفر و الحاد ہے!

پس ہر ایسی نفی جس کے بعد اثبات نہ ہو، محض کفر و الحاد ہے اور ایمان و یقین کا اس میں کوئی شائبہ تک نہیں۔ چنانچہ علم و مطالعہ، تحقیق و تدقیق، اور اپنے "ترقی یافتہ" تہذیب و تمدن کے باوجود اقوام یورپ کی "تہذیب حاضر" میں جس پر علامہ اقبال نے اکثر جگہ نہایت عادلانہ اور مبنی برحقیقت تنقید کی ہے) لادینی، زندقہ اور دہریت کا دور دورہ ہے۔ سائنس کی شبانہ روز "ریسرچ" گوناگوں جدید ایجادات، اور علوم و فنون کی

"ذہنی رو" نے انسان کو ایک ایسی "روحانی و اخلاقی بلندی" تک پہنچا دیا ہے کہ وہ "نفی" (انکارِ وجود باری تعالیٰ) کے لئے تو نہایت دلیر و بے باک ہے۔ لیکن "اثبات" کی جانب اس کا ایک قدم نہیں اٹھتا اس اندوہناک صورتِ حال کے پیشِ نظر علامہ مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے۔مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا! (بالِ جبریل)

ان کا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ جدھر دیکھئے "تہذیبِ حاضر" کے ہر معاشرے اور ہر حلقے میں "لا" (نفی) ہی کا دور دورہ ہے۔لیکن اثباتِ وجودِ باری تعالےٰ یا شعورِ توحید کے علےٰ کسی میں بھی ذوق و شوق یا جذبۂ طلب نہیں۔ اور ایسی صورت حال میں شجرِ عقائد کی جڑ کو دیمک اس بری طرح چاٹ جاتی ہے کہ قوم کا پورا ڈھانچہ دھڑام سے زمین پر آ رہتا ہے۔یہی ہے "نفی" کا وہ تباہ کن نتیجہ و تاثر جو پوری قوم کی اجتماعی موت ہے۔

لَا و اِلَّا سازو برگِ امتاں نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

یعنی: "لَا" اور "اِلَّا" یقیناً لازم و ملزوم ہونے کی صورت میں امت کا سرمایۂ حیات ہیں۔لیکن جہاں محض نفیِ بے اثبات ہو۔ وہاں امت کی موت یقینی ہے!"

اس ضمن میں یہ اسلامی و شرعی نکتہ بھی واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ جس طرح "نفیِ بے اثبات" سے کفر لازم آتا ہے، بالکل اسی طرح "اثباتِ بے نفی" بھی عقیدہ و ایمان میں خلل کا موجب ہے۔یعنی اگر کوئی شخص "لَا اِلٰہ" کے بغیر صرف "اِلَّا اللہ" کا ورد و وظیفہ کرے تو یہ ورد اسلام کے نزدیک مردود اور ناقابل قبول ہوگا۔بالفاظ دیگر اثباتِ توحیدِ باری تعالےٰ کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ پہلے "لَا اِلٰہ" کہہ کر نفیِ غیر اللہ کی جائے۔چنانچہ ملتِ بیضا کے ہر فرد اور ہر جماعت سے استدعا ہے

کہ افضل الذکر "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کو اس کی مکمل صورت میں پڑھا کریں، اور مکمل صورت ہی میں اس کا ورد و وظیفہ کیا کریں۔ ورنہ محض "اِلَّا اللّٰہ" کا ورد شارع علیہ السلام کی نظر میں غلط اور نہایت گمراہ کن ہے۔ درست اور صحت مند عقائدِ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ نفی و اثبات کے الفاظ بیک وقت زبان پر آئیں۔ اور قلبِ مومن ان کی تصدیق و تائید کرے۔

وابستۂ "لَا" اقوام کے لئے زوال و انحطاط لازمی ہے

علامہ اقبالؔ نے حرف "لَا" کو انکارِ وجودِ باری تعالیٰ کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے جب وہ کسی مادہ پرست اور دہریہ فرد یا قوم پر تنقید فرماتے ہیں، تو وہاں "لَا" سے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور ذات و صفات کا انکار مراد ہوتا ہے۔ مثلاً روس یا کسی بھی دوسرے کمیونسٹ ملک کے لادین نظام پر بالفاظِ ذیل اظہارِ خیال فرماتے ہیں:۔

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ
اسی طرح تو دیکھتا ہے کہ انگریز کے دورِ حکومت میں

بندگی با خواجگی آمد بجنگ
مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی ہے

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
روس کا قلب و جگر اس انقلاب کے باعث خون ہو چکا ہے

از ضمیرش حرفِ "لَا" آمد بروں
اور بطور نتیجہ اس کا دل مذہب کا منکر ہو گیا ہے

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است
اس نے پرانے نظامِ سیاست کو درہم برہم کر دیا ہے

تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
اور دہریت سے رگِ عالم پر ایک تیز ڈنک مارا ہے

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
میں نے اس کے نظامِ حکومت کا خوب مطالعہ کیا ہے

لَا سلاطیں، لَا کلیسا، لَا اِلٰہ
وہ شاہی کا بھی منکر ہے، مذہب کا بھی اور خدا کا بھی

فکر او در تندباد لا بماند مرکب خود را سوئے الّا نراند
اس کی سوچ بچار "نفی" کی آندھی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ اپنے گھوڑے کو "اثبات" کی جانب مہمیز نہ کر سکا

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں خویش را زیں تندباد آرد بروں
لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جبکہ وہ اپنے زورِ جنوں سے خود کو اس آندھی کی زد سے باہر نکال لے گا

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے الّا می خرامد کائنات
زندگی کا مزاج تو یہ ہے کہ وہ "نفی" تک ہرگز محدود نہیں تھا بلکہ کائنات فطرتاً "اثبات" کی جانب مائل رہتا ہے

لا و الّا ساز و برگِ اُمتاں نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں
لا اور الّا دونوں ہی امتوں کا سامانِ حیات ہے اور نفی بے اثبات یقیناً امتوں کی موت ہے

در محبت پختہ کے گردد خلیل[۱] تا نگردد لا سوئے الّا دلیل
خلیل اللہ عشقِ الٰہی میں پختہ کیونکر ہو سکتے تھے جب تک لا بالآخر الّا کی جانب دلیلِ راہ نہ بنتا

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن[۲] نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
اے کہ حجرے کے کونے میں بیٹھا ہوا باتیں بناتا ہے نمرودانِ عصر کے سامنے "لا" کا نعرہ بلند کر

ایں کہ می بینی نیرزد با دو جَو از جلالِ لا اِلٰہ آگاہ شو
جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ تو دو جَو کی قیمت بھی نہیں رکھتا لہٰذا تو لا اِلٰہ کے جلال و اثر سے باخبر ہو

---

۱ یعنی جب تک خلیل اللہ پہلے غیر اللہ کی نفیِ مطلق نہ فرماتے، وہ ذات و صفاتِ حق تعالےٰ کا مقامِ اثبات حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

۲ یعنی اپنے دور کے تمام مشرک اور جابر و مستبد لوگوں کے سامنے بے باکی کے ساتھ نفیِ غیر اللہ کر!

هر کہ اندر دست او شمشیر لا است[1]
جو شخص بھی اپنے ہاتھ میں لا کی تلوار رکھتا ہے
جملہ موجودات را فرمانروا است!
وہ تمام کائنات کا مختار و بادشاہ ہے

اور اس لئے "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی کی زبانی ملت روسیہ کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اشتراکیت کا لادین نظام نوع انسانی کی تباہی و بربادی ہے لیکن وہ نظامِ معیشت جو روحانی و اخلاقی اقدار کا بدرجۂ اتم حامل ہوتے ہوئے بھی انسانیت کے لئے حسب فطرت ایک قابلِ عمل راہِ اعتدال پیش کرتا ہے وہ صرف اسلام و قرآن میں موجود ہے جس نے "ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ" کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کی غریب و نادار، محنت کش اور مفلوک الحال آبادی پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ اس مفہوم میں تمام اشعار "پیغامِ افغانی بہ ملت روسیہ" کے زیرِ عنوان اس کتاب کے مقالہ "اقبال اور سرمایہ و محنت" میں ملاحظہ فرمائیں!

اسی طرح تصنیفات اقبال میں بعض ایسے افراد کا بھی ذکر ہے۔ جو محض "لا" (نفی) تک محدود رہ گئے۔ اور "اِلّا" (اثبات) تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ مثلاً جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی فریڈرک نطشے "فوق الانسان" کے جنون میں خدا کی ہستی کا قطعی منکر ہو گیا تھا۔ بلکہ فوق الانسان (BEYOND MAN) ہی کو خدائی صفات و اختیارات کا حامل سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس پر بالفاظ ذیل تنقید فرماتے ہیں:۔

---

[1] یعنی جو شخص رب واحد کا پرستار ہے اور اپنے ہاتھ میں نفی غیر اللہ کی تلوار رکھتا ہے، وہ سچا "نائب حق" ہونے کی بنا پر تمام کائنات کا فرماں روا ہے!

من بہ رومی گفتم ایں دیوانہ کیست ؎۱ گفت ایں فرزانۂ المانوی است

میں نے وہاں رومی سے پوچھا کہ یہ دیوانہ کون ہے — وہ بولا "یہ جرمنی کا حکیم فرزانہ نٹشے ہے!"

درمیانِ ایں دو عالم جائے اوست ؎۲ نغمۂ دیرینہ اندر نائے اوست!

ان دونوں جہانوں کے درمیان (اعراف میں) اس کا مقام ہے — "انا الحق" کا پرانا نغمہ اس کی بانسری میں ہے

باز ایں حلاج بے دار و رسن — نوعِ دیگر گفتہ آں حرفِ کہن!

یہ گویا پھر بھی منصور حلاج مگر اس نے پھانسی نہ پائی — کیونکہ اس نے وہ پرانا نعرہ کسی اور انداز میں لگایا ہے

حرفِ او بے باک و افکارش عظیم ؎۳ غربیاں از تیغِ گفتارش دو نیم!

اس کی گفتگو بے خوف اور اس کے افکار عظیم ہیں — اہلِ مغرب اس کی تیغِ گفتار سے دو نیم ہو رہے ہیں

ہم نشیں بر جذبۂ او پے نبرد ؎۴ بندۂ مجذوب را مجنوں شمرد!

وہ اس کے جذبات کی تہ تک رسائی نہ پا سکے — لہٰذا ایک مجذوب انسان کو حواس باختہ سمجھ لیا

عاقلاں از عشق و مستی بے نصیب — نبضِ او دادند در دستِ طبیب!

وہ بندگانِ عقل وخرد جو عشق و مستی سے بے نصیب تھے — اس کی نبض کا اندازہ طبیب کے ہاتھوں کرانے لگے

۱؎ "جاوید نامہ" میں سیرِ افلاک کے دوران اول تا آخر روحِ رومیؒ روحِ اقبالؒ کی رہنمائی کرتی ہے!

۲؎ نٹشے نے بھی باندازِ دگر گویا "انا الحق" ہی کا نعرہ بلند کیا تھا، کیونکہ وہ اپنے "فوق الانسان" کو تمام خدائی صفات کا حامل سمجھتا تھا۔

۳؎ کیونکہ نٹشے نے کلیسا کے نظام پر بے پناہ حملے کئے تھے اور وہ عیسائیت کو "سراپا رہبانیت" قرار دیتا ہے جو انسان کے قوائے عمل کو شل کر دیتی ہے۔

۴؎ یورپ کے نقادوں نے غالباً جذبۂ انتقام کے تحت نٹشے کو "حواس باختہ" اور "مجنوں" قرار دیا ہے لیکن علامہ اقبال کا جذبۂ انصاف، و دیانت اسے محض "مجذوب" کہنے پر اکتفا کرتا ہے!

باپزشکاں چیست غیر از ریونگ
وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ

بیچارہ طبیبوں کے پاس جید جوئی کے سوا اور ہی کیا
افسوس اس مجذوب کی حالت پر جو فرنگ میں پیدا ہوا

ابن سینا بر بیاضے دل نہد [1]
رگ زند یا حب خواب آور دہد

ابن سینا تو علاج کے لئے پہلے اپنی بیاض دیکھے گا
پھر یا تو مریض کا فصد کھولیگا یا اسے خواب آور گولیاں دیگا

بود حلاجے بشہر خود غریب!

وہ ایک ایسا منصور حلاج تھا جو اپنے ہی شہر میں مسافر تھا

جاں ز ملا برد و کشت او را طبیب!

مُلا سے تو اس کی جان بچ نکلی مگر طبیب نے اسے ہلاک کر دیا

مرد رہ دانے نبود اندر فرنگ [2]
پس فزوں شد نغمہ اش از تار چنگ

دراصل فرنگ میں کوئی صحیح مرد رہنما نہیں تھا
لہٰذا اس کا نغمہ تار چنگ کے نغمے سے بھی فزوں ہو گیا

راہرو را کس نشاں از رہ نداد
صد خلل در واردات او فتاد!

اس مسافر کیلئے صحیح راستے کی نشاندہی کسی نے نہ کی
لہٰذا اس کی واردات قلب میں خلل عظیم واقع ہو گیا

نقد بود و کس عیار او نہ کرد
کار دانے مرد کار او را نہ کرد!

وہ ایک ایسی نقدی تھا جس کی پرکھ کسی سے بھی نہ ہو سکی
اور کوئی عامل کار گذار اسے عمل کی درست شاہراہ نہ دکھا سکا

عاشقے در آہ خود گم گشتۂ
سالکے در راہ خود گم گشتۂ

وہ ایک ایسا عاشق تھا جو اپنے درد آہ میں گم ہو کر رہ گیا
اور وہ ایک ایسا راہگیر تھا جو اپنی راہ میں کھو کر رہ گیا

---

[1] ابن سینا، حکیم بوعلی سینا، کیونکہ "سینا" حکیم بوعلی کے دادا کا نام تھا۔

[2] "پس فزوں شد نغمہ اش از تار چنگ" یعنی وہ محروم ایمان تھا اور اس لئے صحت مند اور متوازن ذہن نہ رکھنے کے باعث اس نے "فوق الانسان" کی امتیازی صفات بیان کرنے میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ وجود باری تعالیٰ کا منکر ہو گیا اور اپنے "فوق الانسان" کو خدا کا درجہ دے دیا!

مستیِ او ہر زجاجے را شکست ؎۱ از خدا ببرید و ہم از خود گسست!

اس کی مستی نے ہر شیشے کو پاش پاش کر دیا — اس نے خدا سے قطع تعلق کیا تھا، لیکن خود سے بھی منقطع ہو گیا

خواست تا بیند بچشمِ ظاہری — اختلاطِ قاہری با دلبری!

اس نے چاہا تھا کہ اس چشمِ ظاہر ہی سے — "قاہری" اور "دلبری" کا باہمی ربط و تعلق دیکھے

خواست تا از آب و گل آید بروں ؎۲ خوشہ کز کشتِ دل آید بروں!

اس نے چاہا تھا کہ محض پانی اور مٹی ہی سے — وہ خوشہ پیدا کرے جو صرف کشتِ دل سے اگ سکتا ہے

آنچہ او جوید مقامِ کبریاست — ایں مقام از عقل و حکمت ما وراست!

جس مقام کا وہ متلاشی تھا وہ صرف خدا کا مقام ہے — اور ایسا مقام انسان کی عقل و حکمت سے ماورا ہے

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است — لا و الا از مقاماتِ خودی است!

زندگی دراصل اشاراتِ خودی کی شرح ہے — اور اس شرح میں لا و الا مقاماتِ خودی ہیں

او بہ لا در ماند و تا الا نرفت ؎۳ از مقامِ "عبدہ" بیگانہ رفت!

وہ محض "لا" کی پستی میں رہا اور "الا" تک اس کی رسائی نہ ہوئی — لہٰذا وہ "عبدہ" کے اسرار و رموز سے نا آشنا رہا

؎۱ اس شعر میں "زجاج" استعارہ ہے تمام ضعیف و کمزور عقائد اور توہمات کیلئے جو "مسیحیت" کی پیداوار تھے۔ مصرعِ ثانی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ "فوق الانسان" کے والہانہ عشق میں ہستیِ باری تعالیٰ کا قطعی منکر ہو گیا تھا، لیکن اس وارفتگی میں اپنے حواس کو بھی متوازن نہ رکھ سکا، اور "مجذوب" ہو گیا!

؎۲ یعنی اس نے صرف ایک پیکرِ آب و گل سے وہ "خوشہ" (فوق الانسان) پیدا کرنا چاہا ہے جو صرف مزرعِ ایمان اور کشتِ دل سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ ہاں، اقبالؒ کا "مردِ مومن" بلاشبہ "کشتِ دل" سے پیدا ہوا ہے اور وہی ناموسِ خودی کا سچا محافظ ہے!

؎۳ "مقامِ عبدہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا مطیع بندہ، کہ یہی انسانیت کی سب سے بڑی سعادت ہے!

با تجلّی ہم کنار و بے خبر!
دور تر چوں میوہ از بیخ شجر!

وہ تجلّی سے ہمکنار ہو کر بھی اس سے بے خبر تھا
اور پھل کی طرح اپنے ہی درخت کی جڑ سے دور تھا

چشمِ او جز رویت آدم نخواست
نعرہ بے باکانہ زد "آدم کجاست؟"

اس کی آنکھ صرف "فوق الانسان" کی متلاشی رہی
لہٰذا بے باکی سے یہ نعرہ لگایا کہ "میرا مطلوبہ انسان کہاں ہے؟"

ورنہ او از خاکیاں بیزار بود [1]
مثلِ موسےٰ طالبِ دیدار بود!

ورنہ وہ عوام کالانعام سے بیزار و متنفر تھا
اور درپردہ مثلِ موسےٰ طالبِ دیدارِ الٰہی تھا

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے!

کاش وہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے زمانے میں ہوتا
تاکہ ازل کے عشق و سرور سرمدی سے بہرہ اندوز ہوتا

اور نٹشے ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا کے تمام فلسفی "حکمتِ یزدانی" اور نورِ باطن سے محروم رہنے کے باعث ہمیشہ ظلمتِ "لَا" ہی میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے، لیکن مقام "اِلَّا" تک رسائی نہ پا سکے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں متعدد جگہ "حکیم" (فلسفی) کو مادہ پرست اور گم کردہ راہ قرار دیا ہے جو اس قدر بلند پروازی کے باوجود "طبیعیات" اور طلسمِ عناصر کی حدود سے آگے پرواز نہیں کر سکا۔

---

[1] نٹشے اپنے تمام خطبات و مقالات میں ہر جگہ "فوق الانسان" ہی کا متلاشی دکھائی دیتا ہے اور اس کے نزدیک وہی مقصدِ حیاتِ کائنات ہے۔ "فوق الانسان" کے علاوہ وہ تمام نوعِ انسانی کو چوپایوں اور بھیڑوں بکریوں کے ریوڑ سمجھتا ہے، کیونکہ وہ انسانِ کامل کی بنیادی اور اہم ترین صفات سے عاری ہیں!

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِّ محبت[1] سے بے نصیب رہا!
پھرا فضاؤں میں کرگس[2] اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا! (بالِ جبریل)

اقبال کی حکمتِ "لا و اِلاّ" فرد و ملت کیلئے ترقی و سرفرازی کی ضامن ہے

"لاَ اور اِلاَّ" کی ان تمام توضیحات کے بعد نہایت وثوق و اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کی حکمتِ لا و اِلاَّ فرد و ملت ہر دو کے لئے ترقی و سرفرازی کی ضامن ہے، چونکہ توحیدِ باری تعالےٰ مومن کا بنیادی عقیدہ ہے" اور یہیں سے کفر و اسلام کی سرحدوں کا تعین ہوتا ہے۔ لہٰذا "خیر الامم" کی تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کا انحصار نکتۂ "لا و اِلاّ" کو صحیح طور پہ سمجھنے۔ اور پھر اس پر خلوص کے ساتھ عمل پیدا ہونے پر ہے۔ یہی وہ بے پناہ اور ناقابلِ مقاومت قوت ہے جس کے متعلق فرمایا:۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے! (بانگِ درا)

---

[1] "سرِ محبت": عشقِ الٰہی کا راز۔

[2] کرگس: گدھ جو ایک مردار خوار پرندہ ہے۔ اس مصرع میں "شاہیں" سے مراد ہے مردِ مومن اور "کرگس" سے مراد ہے فلسفی۔

اور یہی وہ معجزہ ایمانی ہے جو دنیا کی تمام مادی قوتوں پر غالب و فاتح رہ سکتا ہے:۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

الغرض بحر "لا و الا" میں غواصی کر کے گوہر مراد پانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پہلے "بتان وہم و گمان" کو پاش پاش کرے اور عقل و خرد کی وضع کی ہوئی حدود زمان و مکان سے ماورا پرواز کرتے ہوئے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کے عالم لاہوت میں محو و مستغرق ہو جائے، کہ یہی مقام توحید ہے:۔

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

بالآخر قارئین کرام سے استدعا ہے کہ اس موضوع کے تحت مندرجہ ذیل منتخب کلام پر بھی بطورِ خاص غور و خوض فرمائیں:۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

نکتہ می گویم از مردانِ حال — امتاں را "لا" جلال "الا" جمال
میں تجھے مردانِ حال کے عمل کا ایک نکتہ بتاتا ہوں — قوموں کیلئے لا سراپا جلال ہے اور الا جمال

لا و الا احتساب کائنات [1] — لا و الا فتح بابِ کائنات
لا اور الا کائنات کا بہترین محاسبہ ہے — لا و الا کے اعجاز سے کائنات کا دروازہ کھلتا ہے

[1] حاشیہ صفحہ ۵۰۹ پر

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں [1] حرکت از لَا زاید از اِلّا سکوں

یہ ہر دو اس جہانِ "کُنْ" کی تقدیر ہیں اس کُن کی حرکت تو لَا سے پیدا ہوتی ہے اور سکون اِلّا سے

تا نہ رمزِ لَا اِلٰہ آید بدست بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک رمزِ لا الٰہ ہمارے ہاتھ نہ آجائے غیر اللہ کے بند کو ہرگز نہیں توڑا جا سکتا

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لَاست ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

دنیا میں ہمارے آغازِ کار حرفِ لَا سے ہے اور یہ مردِ خدا کی پہلی منزل ہے!

ملّتے کز سوزِ او یک دم تپید از گِلِ خود خویش را باز آفرید

جو قوم اس کے سوز سے ایک دم بھی تڑپ لی اس نے اپنی مٹی سے خود کو دوبارہ تعمیر کر لیا

پیشِ غیر اللہ "لَا" گفتن حیات [2] تازہ از ہنگامۂ او کائنات

غیر اللہ کے سامنے "لَا" کہنا لقائے حیات ہے اور اس کے ہنگاموں ہی سے کائنات تازہ و نو ہے

از جنونش ہر گریباں چاک نیست درخورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

لیکن اس کے جنون سے ہر گریباں چاک نہیں ہے اور ہر خس و خاشاک اس شعلہ کے قابل نہیں ہے

جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

صرف ایک مردِ زندہ کے دل میں اس کا جذبہ سو راہ نشینوں کو سرگرم سفر کر دیتا ہے

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ تخمِ لَا در مشتِ خاکِ او بریز!

کیا تو کسی غلام کو اس کے آقا سے جنگ آزما دیکھنا چاہتا ہے؟ تو پھر اس کی خاک میں صرف تخمِ لَا پھینک دے

حاشیہ صفحہ ۵۰۸ [1] یعنی کائنات کے حقیقی اور قابلِ اعتماد اسرار و رموز صرف اسی وقت انسان پر آشکار ہوتے ہیں جبکہ وہ بیک وقت "لَا و اِلّا" (نفی و اثبات) کا قائل ہو!

حاشیہ صفحہ ہذا [1] یعنی کائنات کی ابتدا "لَا" (نفیِ غیر اللہ) سے ہے اور اُس کی انتہا "اِلّا" (اثباتِ حق تعالیٰ) ہے

[2] یعنی ایک مومن جسور و غیور پوری بے باکی سے غیر اللہ کے سامنے اس کی نفی کرتا ہے!

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر — ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

جس شخص کے جگر میں "لا" کا سوز موجود ہو — اس کا خوف و دبدبہ خوفِ قیامت سے بھی زیادہ ہے

لا مقامِ ضربہائے پے بہ پے — ایں غوِ رعد است نے آوازِ نے!

"لا" مسلسل ضرباتِ حق کا مرتبہ بلند ہے — یہ بجلی کی کڑک ہے، بنسری کا نغمہ نہیں!

ضربِ او ہر بود را سازد نبود

اس کی ایک ضرب ماسوا اللہ کو محو و نابود کر دیتی ہے

تا بروں آئی ز گردابِ وجود!

تاکہ تو عالمِ وجود کے شرک آموز گرداب سے باہر نکل آئے

با تو می گویم ز ایامِ عرب [1] — تا بدانی پختہ و خامِ عرب

میں تجھ سے تاریخِ عرب کا تذکرہ کرتا ہوں — تاکہ تو عرب کے پختہ و خام کا اندازہ کر سکے

ریزہ ریزہ از ضربِ او لات و منات — در جہات آزاد از بندِ جہات

لات و منات اس کی ضرب سے پاش پاش ہو گئے — وہ اطرافِ عالم ہی میں رہ کر بھی ان سے آزاد تھا

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او — قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

اس کے ہاتھ سے ہر پرانا لباس چاک چاک ہو گیا — اور قیصر و کسریٰ جیسے شاہ اس کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد — گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد

کبھی تو جنگل اس کے طوفانِ برق و باراں کی زد میں رہا ہے — اور کبھی سمندر اس کے طوفانوں سے جوش میں رہے

عالمے در آتشِ او مثلِ خس — ایں ہمہ ہنگامۂ "لا" بود و بس

اس کی آتشِ حق میں ایک دنیا مانندِ خس جل گئی — یہ سب کچھ لا کا پیدا کیا ہوا ہنگامہ تھا

---

[1] یہاں "ایامِ عرب" سے مراد ہے قرنِ اول میں عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین کا زمانہ جبکہ اسلام کا عروج اور جلال و جبروت اپنے نصف النہار پر تھا۔

اندریں دیرِ کہن پیہم تپید	تا جہانے تازۂ آمد پدید
عرب اس پرانے بتکدے میں مسلسل تڑپتا رہا	حتیٰ کہ اس کی جد و جہد سے ایک جہانِ تازہ پیدا ہو گیا
بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست	هر چه هست از تخم ریزیہائے اوست
دنیا میں صدائے حق اسی کی صبح خیزی سے بلند ہوئی	اور ایمان و عمل سے متعلق سب کچھ اسی کی تخم ریزی کا نتیجہ ہے
اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند	از کنارِ جوئے او آوردہ اند
یہ جو دستِ قدرت نے شمعِ لالہ روشن کر رکھی ہے	یہ لالہ درحقیقت اسی کے کنارِ جو سے لایا گیا ہے

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست

جب اس نے اپنی لوحِ دل کو نقشِ غیر اللہ سے پاک کر دیا

از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست!

تو اس کی کفِ خاک سے سینکڑوں ہنگامے برپا ہوئے

وائے ما اے وائے ایں دیرِ کہن [1]	تیغِ لا در کف نہ تو داری نہ من
افسوس ہماری حالت پر دنیا کے پرانے بتکدے میں بیٹھے ہیں	اور یہاں تیغِ لا نہ تیرے ہاتھ میں ہے نہ میرے ہاتھ میں
دل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں	ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں!
اے جواں! اپنے دل کو بندِ غیر اللہ سے آزاد کرے	اور حق کے لئے اس جہانِ کہنہ سے کنارہ کش ہو جا
تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن؟	اے مسلماں مردن است ایں زیستن
غیرتِ دین کے بغیر تو کب تک زندگی بسر کریگا!	اے مسلمان! ایسی زندگی درحقیقت بدتر از موت ہے

---

[1] مراد یہ ہے کہ قرنِ اوّل میں مسلمانوں کو جس قدر عروج و اقبال نصیب ہوا، وہ مکمل طور پر نفیِ غیر اللہ کا ثمرہ ہے

[2] "تیغِ لا" نفیِ غیر اللہ کی تلوار، جو تمام مشرکانہ اور ملحدانہ عقائد و تصوّرات کو محو و نابود کردیتی ہے!

مردِ حق باز آفریند خویش را | جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
مردِ حق پرست دنیا میں اپنے آپ کو دوبارہ پیدا کرتا ہے | اور نورِ حق تعالےٰ کے سوا اور کسی روشنی میں خود کو نہیں دیکھتا

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند[1]
وہ اپنے آپ کو سیرۃ مصطفیٰؐ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے
تا جہانے دیگرے پیدا کند! (پس چہ باید کرد)
تاکہ وہ حق پرستی کی ایک نئی دنیا پیدا کرے

لا و اِلّا

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانا!
نہادِ زندگی میں ابتدا "لا" انتہا "الّا"
پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلّا سے بیگانہ!
وہ ملّت روح جس کی "لا" سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لب ریز اس ملّت کا پیمانہ! (ضربِ کلیم)

---

[1] اس لئے کہ آنحضرتؐ ہی کو اللہ تعالےٰ نے ہر مسلمان کیلئے "اسوۂ کامل" قرار دیا ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝ (پ۲۱ : ۱۹ع)

جو شخص رضائے الٰہی کی آرزو اور روزِ قیامت (نجات) کی توقع رکھتا ہے اور کثرت سے ذکر حق تعالےٰ کرتا ہو اس کے لئے رسول اللہ کی زندگی ایک موزوں اور پسندیدہ عملی نمونہ ہے!

یہاں بھی پہلے شعر کا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ روحِ ارتقاء کا صعود و عروج نفی سے اثبات کی جانب پرواز کرنے پر منحصر ہے۔ کیونکہ بطورِ مثال اگر دانہ زیرِ خاک ہی خفتہ و مقید رہتا رحالتِ "نفی" میں رہتا) اور شبستانِ خاکی سے سفر کرکے فضائے نور و حرارت میں نمایاں نہ ہوتا ("اثبات" کی شکل اختیار نہ کرتا) تو اسے برِ شاخ و برگ و بر نصیب نہ ہوتے، اور چشمِ انسان سے نہاں معدوم و نابود ہو جاتا!

پھر دوسرے اور تیسرے شعر میں بھی وہی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جو "نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں" ۔ یعنی وہ قوم جس کی روح "لَا" (نفی) سے آگے قدم نہیں اٹھا سکتی، جلد یا بدیر اس قوم کی اجتماعی موت یقینی ہے، اور وہ لوحِ عالم پر محض فسانۂ عبرت بن کر رہ جائے گی۔ پس زندگی کا معتدل اور صحت مند دستور العمل یہ ہے، کہ "لَا و اِلَّا" میں اتحادِ کامل اور ہم آہنگی ہو، کیونکہ اس کی ابتدا "لَا" (نفیِ غیر اللہ) سے ہے۔ اور اس کی انتہا "اِلَّا" (اثباتِ حق تعالیٰ) ہے! ــــــ یہی وہ اسلامی عقیدہ ہے جس سے "مومنِ صادق" کی تخلیق و تشکیل ہوتی ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقوامِ عالم میں بالعموم اور مسلمانوں کی نژادِ نو میں بالخصوص دہریت اور انکارِ وجودِ باری تعالےٰ کا دور دورہ کیوں ہے؟ ــــــ اس سوال کا مبنی بر حقیقت اور واقعاتی جواب تو یہ ہے کہ دنیوی علوم و فنون اور سائنس میں "عقل و خرد" کو ذریعۂ تحقیق و تنقید قرار دینے کے علاوہ مذہبیات اور ایمانیات میں بھی اسی کو معیارِ صحیح و غلط قرار دے لیا گیا ہے۔ خالصتاً مادی و دنیوی علوم و فنون اور سائنس میں عقل و خرد کا دخل و عمل

بالکل درست و بجا ہے، لیکن فہم و شعور کے تمام گمراہ کن اور ذہن کو پراگندہ و مضطرب کر دینے والے محرکات اس وقت جنم لیتے ہیں، جب "ایمانیات" کو بھی عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات حیاتِ بعد الممات، حساب و میزان، جنت و دوزخ، اور جزا و سزا سے انکار ہے۔ چنانچہ ہمیں قرآنِ حکیم کے آغاز ہی میں یہ تلقین کر دی گئی تھی کہ: اس کتاب کے مندرجات کی صداقت میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ کتاب مقدس ذریعۂ رشد و ہدایت تو یقیناً ہے۔ لیکن صرف متقی اور راست باز لوگوں کے لئے' ——— وہ لوگ جو "ایمان بالغیب" رکھتے ہیں، اور اُنہیں آخرت (حشر و نشر اور جزا و سزا) پر یقینِ کامل ہے!" (پ: اع)

پس ہم یہاں یہ ازلی و ابدی حقیقت واشگاف الفاظ میں بیان کر دینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام خصوصاً "ایمانیات" پر تنقید و بحث کی اجازت قطعاً نہیں دیتا۔ اور نہ یہ عُقدے محض عقل و خرد کی موشگافیوں سے حل ہو سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر "ایمان بالغیب" کی اقلیم میں "عقلِ فسوں پیشہ" کو ایک لمحے کے لئے بھی دخل نہیں دینا چاہیئے، اور اگر دخل دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ "لا"، یعنی اسلام و قرآن کی تلقین کردہ تمام "ایمانیات" کی نفی ہوگا۔ اسی بنا پر علامہ مرحوم نے فرمایا:-

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

لہٰذا اس موضوع سے علامہ اقبالؔ کا اصل مقصد و مدعا یہ ہے کہ

بالخصوص مسلمان (کیونکہ انہیں کو سب سے زیادہ صحیح العقیدہ اور پیروِ ایمانیات رہنے کی تاکید کی گئی ہے) دہریت اور انکارِ ذات وصفات کا شکار نہ ہوں، بلکہ "لَا" (نفی وانکار) سے محترز رہتے ہوئے "اِلّاَ" (اثباتِ ایمانیات) کا مسلک اختیار کریں، کیونکہ صرف عقل وخرد، منطقی دلائل، اور "علم کتابی" سے وہ ایمانیات کی گتھیوں کو ہرگز نہیں سلجھا سکیں گے۔ "ملّتِ بیضا" کو اللہ تعالٰی نے دیگر اقوامِ عالم کے لئے ہادی ورہبر ہونے کا اعزاز عطا فرمایا ہے، اور جب بدقسمتی سے مسلمانوں ہی کے عقائد "ایمانیات" کے بارے میں متزلزل ہوئے، یا وہ مائل بہ الحاد ودہریت ہوئے، تو پھر کافر ومشرک اقوام کی رہنمائی کون کرے گا؟

اس ضمن میں مندرجہ ذیل نظم کے الفاظ پر بطورِ خاص غور وفکر فرمائیں؛ جس میں "عشق" سے ہر جگہ "ایمانِ محکم" مراد ہے:-

علم وعشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن[1]!
بندۂ تخمین وظن! کرمِ کتابی نہ بن!
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

---

[1] تخمین وظن: قیاس آرائی اور شک وشبہ

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات![1]
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات!
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں!
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں!
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں!
عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتحِ باب![2]

---

[1] یعنی "علم" تو زیادہ سے زیادہ اسمائے الٰہی کے معانی اور صفاتِ خداوندی کا ادراک کر لیگا، لیکن "عشق" کا مقام یہ ہے کہ وہ عالمِ صفات سے ماورا پرواز کرتے ہوئے تماشائے "ذات" کرتا ہے اور تجلیاتِ الٰہی سے ہمکنار رہے، چنانچہ معراج "مشاہدۂ ذات" ہی تو ہے:۔

برمقامِ خود رسیدن زندگی است ۔ ذات را بے پردہ دیدن زندگی است!
مردِ مومن در نسازد با صفات ۔ مصطفیٰ راضی نہ شد الّا بذات! (جاوید نامہ)

ترجمہ: "مومن کا اپنے اصل مقام تک پہنچنا ہی دلیلِ زندگی ہے، اور ذاتِ خداوندی کو بے پردہ دیکھنا ہی سوز و سازِ حیات ہے، لہٰذا مردِ مومن محض "صفات" پر قناعت نہیں کیا کرتا، کیونکہ رسولِ کریم "مشاہدۂ ذات" سے کمتر کسی شے پر راضی اور مطمئن نہ ہوئے!"

[2] یعنی "یقین" ہی وہ کلید ہے جس سے کائنات کے اسرار و حِکَم کا دروازہ کھلتا ہے، اور زندگی کے مخفی خزائن بے نقاب ہو جاتے ہیں!

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے امّ الکتاب[1]

(ضربِ کلیم)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ "ایمانیات" سے متعلق تمام مسائل و موضوعات کے کسی علمی اور منطقی حل کے لئے "عقل" (REASON) قطعی طور پر اپاہج اور ناکام و نامراد ہے۔ یہاں "لا" (نفی) سے گذر کر "الّا" (اثبات) تک رسائی صرف اسی صورت ممکن ہو سکتی ہے کہ "عشق" کو امام و پیشوا بنایا جائے، کیونکہ ع "عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب!" ——— اقبال کے نزدیک محض "عقل وخرد" انسان کے دل و دماغ میں "بُت خانہ" تعمیر کرتی رہتی ہے، لیکن یہ "خلیلِ عشق" ہی ہے جو اس صنم کدے کو اس "حرمِ کعبہ" میں تبدیل کر دیتا ہے، جس میں فقط معبودِ برحق کی پرستش ہو۔

سفالم را مے او جامِ جم کرد
میری مٹی کے پیالے کو شرابِ عشق نے جامِ جمشید بنا دیا

---

[1] اس مصرع میں "ابن" (بیٹا) اور "امّ" (ماں) میں جو فرق و تضاد ہے، وہ ظاہر ہے اس کا مفہوم و مدّعا یہ ہے کہ "علم" تو کتابِ الٰہی (قرآن) کا محض سطحی مطالعہ کرتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ اس کا ترجمہ و مطلب سمجھتا ہے مگر "عشق" خود اس کتاب کی روح اور حقائق وجوہر ہے "امّ الکتاب" سے مراد "سورۂ فاتحہ" ہے جسے پورے قرآن کا حاصل و خلاصہ اور لبِّ لباب تسلیم کیا جاتا ہے!

درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
اور عشق ہی نے مجھ قطرۂ ناچیز میں بحرِ ذخار مخفی کر دیا

خرد اندر سرم بُت خانۂ ریخت
عقل تو میرے دماغ میں بُت خانہ تعمیر کرتی ہے

خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد!
مگر خلیلِ عشق نے اس بت خانے کو کعبے میں منتقل کر دیا

اور نتیجتہً اس مقالہ سے یہ "سبق" اخذ کرنا کافی ہو گا کہ:۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصورات!

یعنی فیضانِ عشق کے بغیر تمام تعلیماتِ شریعت بھی محض ایک "بُت کدۂ تصوّرات" کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں روحِ ایمان و یقین بالکل مفقود ہو گی!

یہاں آپ یہ استفسار کرنے میں سو فی صد حق بجانب ہوں گے کہ مذکورہ بالا "عشق" کی تحصیل کے یقینی اور مؤثر "ذرائع" کیا ہیں؟ ——
جواباً عرض ہے کہ:۔

۱ - قرآنِ مجید کو با ترجمہ و معانی پڑھنا
۲ - سیرۃِ نبویؐ اور سیرِ صحابہؓ کا غائر مطالعہ
۳ - درود شریف کی مزاولت
۴ - کثرتِ ذکرِ الٰہی (جس کی قرآن مجید میں پے در پے تاکید پائی جاتی ہے اور جسے "اطمینانِ قلب" کا مؤثر ترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے)

۵۔ عالمِ باعمل، اہلِ دل اور سچے اولیاء اللہ کی صحبت جس کے متعلق خود علامہ مرحوم نے بجا طور پر فرمایا :۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی[1]
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں؟
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی[2]
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت[3] ہو تو دیکھ ان کو
"یدِ بیضا"[4] لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں!

(بانگِ درا)

---

[1] عام دستورِ دنیا تو یہ ہے کہ پھونک مارنے سے چراغ بجھ جاتا ہے، لیکن اہلِ دل کی مسیحائی دیکھو کہ ان کے پھونک سے بجھے ہوئے چراغ بھی روشن ہو جاتے ہیں!

[2] اس مصرع میں "دردِ دل" سے مراد ہے "سوزِ عشق" اور "فقیروں" سے مراد ہیں اولیاء اللہ۔

[3] ارادت: عقیدت و محبت۔

[4] "یدِ بیضا" یہ ایک معجزہ ہے منجملہ ان معجزات کے جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا کئے گئے تھے۔ "یدِ بیضا" کے لغوی معنی ہیں سفید اور روشن ہاتھ۔ جب حضرت کلیم اللہ اپنا ہاتھ بغل میں رکھ کر باہر نکالتے تھے۔ تو وہ مثالِ ماہ روشن و تابناک ہوتا تھا، اور کفار اسے دیکھ کر چندھیا جاتے تھے!

اقبالؒ کا فلسفۂ سخت کوشی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اِس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی!

(اقبال)

اقبالؒ کا فلسفۂ سخت کوشی

سخت کوشی ایک قانونِ فطرت ہے

"سخت کوشی" یا مسلسل جد و جہد صبحِ ازل سے ایک قانونِ فطرت ہے۔ یوں تو عمومی حیثیت سے کرۂ ارض کی تمام ذی حیات مخلوق اس قانون کے زیرِ اثر جد و جہد کے لئے مجبور و مکلف ہے، کیونکہ یہی چیز بصورتِ اصطلاح "جہد للبقا" ہے جس کے بغیر زندگی کا قرار و استقلال قطعی ناممکن ہے، لیکن خصوصیت سے اس کا فاعلِ حقیقی اور معمولِ اعلیٰ "انسان" ہی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ حسبِ تصریحِ قرآن زمین میں خدا کا "خلیفہ" یا "نائبِ حق" ہے۔ اور اپنے عقائد و اعمال کی راستی اور صحت مندی سے تمام بنی نوعِ انسان میں امن و آشتی رواداری اور قلب و ذہن کے سکون کا ضامن ہے "جہد للبقاء" اور پھر "بقائے اصلح" پر تو آئندہ چل کر بالتفصیل بحث کی جائے گی، لیکن فی الحال یہ نکتہ روشن و واضح کرنا مقصود ہے کہ "سخت کوشی" دنیا کے ہر فرد اور ہر قوم کی بنائے حیات ہے، روحِ ارتقا ہے، اور اسے اختیار کئے بغیر نہ تو کوئی فرد عزت و آبرو سے اپنے حقوقِ حیات حاصل کر سکتا ہے، اور نہ کوئی ملت۔ بالفاظِ دیگر

سخت کوشی حفظ و بقائے "انا" (خودی) اور زندگی کی عظمت وسطوت اور قوت و جبروت کے لئے لازمی ولابدی شے ہے۔ یہ ایک ایسا مستقل اور ابدی "آئینِ قدرت" اور "اسلوبِ فطرت" ہے کہ جب تک فرد و ملت پوری دلچسپی، ذمہ داری اور انہماک سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ وہ اپنی عزت وآبرو، حقوقِ حیات اور "انا" کے محافظ ہیں، صاحبِ عروج واقبال ہیں، لیکن جونہی وہ اس سے غفلت و اغماض برتیں اور مائل بہ تن آسانی وسہل انگاری ہوں، وہ عبرتناک طریق پر زوال پذیر بلکہ کالعدم ہو جاتے ہیں، اور پشتِ زمین کے لئے ان کا وجود وجہ ننگ و عار ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس آئین قدرت کو مندرجہ ذیل شعر میں خوب بیان فرمایا ہے:۔

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے! (بانگِ درا)

نیز "زندگی" کے زیرِ عنوان بھی تمام اشعار میں زندگی کا یہی رجحانِ سخت کوشی و جفاطلبی بیان کیا گیا ہے اور اس کی قوتِ تسخیر کو زمان و مکان کی قیود سے آزاد و بالاتر قرار دیا گیا ہے:۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی!
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ "کن فکاں"[1] ہے زندگی!

---

[1] تمام کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے حکم "کُن" ہی سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس ضمیر کا حقیقی مرجع انسان ہے

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی!

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی!

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو!
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

(بانگِ درا)

اقبال کا فلسفۂ سخت کوشی ایک قرآنی حقیقت ہے

مذکورہ بالا الفاظ سے یہ ثابت ہوا کہ فرد اور ملت کے قرار و استقلال اور قوت و سطوت کا راز "عمل" اور صرف عمل ہی میں مخفی ہے۔ چنانچہ "عمل" یا سخت کوشی تعلیماتِ اقبال کا ایک نہایت اہم اور منگا رنگ موضوع ہے اور اس مفہوم میں ان کے ہاں بکثرت فارسی اور اردو اشعار پائے جاتے ہیں جن کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ:-

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ
جامِ تو فریادیِ بیدادِ سنگ

اے کہ تو فلک کے "جور و ستم" سے تنگ ہو رہا ہے
اور اے کہ تیرا جام پتھر کے ظلم سے نالاں ہے

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا؟
تیرا یہ نالہ و فریاد و ماتم کب تک جاری رہے گا
سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا؟
اور تیرا سینے کو مسلسل پیٹنا کب تک معمول رہے گا

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
دراصل زندگی کا راز عمل میں پوشیدہ ہے
لذتِ تخلیق قانونِ حیات
اور یہی قانونِ حیات کی تخلیق کا حقیقی لطف ہے

خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو
اب اٹھ اور ہمت سے ایک نئی دنیا کا خالق ہو
شعلہ در برکن خلیل[۱] آوازہ شو
سینے میں شعلۂ عشق اٹھا اور خلیل اللہ کا نعرہ لگا

با جہانِ نامساعد ساختن
ایک مخالف و نامساعد دنیا سے مغلوب ہو جانا
ہست در میداں سپر انداختن
گویا میدانِ جنگ میں ڈھال ہاتھ سے رکھ دینا ہے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار
ایسا انسان جو خوددار بھی ہے اور پختہ کار بھی
با مزاجِ او بسازد روزگار
دنیا خود اس کی معاون و مددگار ہوتی ہے

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں
اور اگر دنیا اس کے مزاج و پسند کا ساتھ نہ دے
می شود جنگ آزما با آسماں
تو وہ آسمان (تقدیر) سے جنگ آزما ہوتا ہے

بر کند بنیادِ موجودات را
وہ موجودات کو اس کی جڑ سے اکھیڑ پھینکتا ہے
می دہد ترکیبِ نو ذرات را
اور نئے ذرات کو ترکیب دے کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے

گردشِ ایام را برہم زند
وہ گردشِ ایام کو درہم برہم کر دیتا ہے
چرخِ نیلی فام را برہم زند
اور چرخِ نیلی فام کا بھی شیرازہ بکھیر دیتا ہے۔

می کند از قوتِ خود آشکار
وہ اپنی قوتِ تسخیر سے ایک نئی دنیا بناتا ہے
روزگارِ نو کہ باشد سازگار
وہ دنیا جو اس کے حسبِ منشا و سازگار ہو

۱؎ نعرۂ خلیل اللہ سے مراد ہے۔ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ یعنی "میں فانی چیزوں کو دوست نہیں رکھتا!"

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
اگر دنیا میں جوانمردوں کی طرح زندہ نہیں رہا جا سکتا
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست!
تو پھر بہادروں کی مانند جان قربان کرنا ہی زندگی ہے

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
ایک زندہ و بیدار دل رکھنے والا شخص
زورِ خود را از مہماتِ عظیم!
اپنی قوت و توانائی کو بڑی بڑی مہمات سے آزماتا ہے

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
دشوار الحصول چیزوں سے عشق رکھنا ہی مستحسن ہے
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
اور خلیل اللہ کی مانند شعلوں سے گل چیننا کرنا ہی خوب ہے

ممکناتِ قوتِ مردانِ کار
صاحب عزم و ہمت مردوں کی ممکناتِ زندگی
گردد از مشکل پسندی آشکار
صرف مشکل پسندی ہی سے نمایاں ہوا کرتی ہے

حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس
لیکن پست ہمت لوگوں کا حربہ تو محض بغض و عناد ہے
زندگی را ایں یک آئین است و بس
اور وہ اپنی زندگی کے لئے یہی ایک اصول اپنائے ہوتے ہیں

زندگانی قوتِ پیدا استے
دراصل زندگی ایک نہایت ظاہر و باہر قوت ہے
اصل او از ذوقِ استیلا استے
اور یہ قوت صرف غلبہ و اقتدار سے مطمئن ہوتی ہے

زندگی کشت است و حاصل قوت است
زندگی گویا ایک کھیتی ہے اور اس کا حاصل قوت ہے
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است (اسرارِ خودی)
اور رمز حق و باطل کی شرح بھی قوت ہی سے ہوتی ہے

لہ اس معرکۂ حق و باطل میں پیروانِ باطل کو شکست دینے کے لئے بھی شرطِ اوّل "قوت" ہے

ان تمام اشعارِ مثنوی میں "عمل" اور اس کی معجز نما قوتِ تسخیر کی نہایت متوازن اور مبنی بر حقیقت تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ ایک اردو شعر میں فرماتے ہیں:۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (بانگِ درا)

اس شعر کا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ عاقبت میں تو جنت و جہنم یا جزا و سزا انسان کے اندازِ عمل پر مرتب ہوں گے ہی، لیکن حیاتِ دنیوی کو بھی جنت یا جہنم بنا لینا انسان کے اپنے اندازِ فکر و عمل پر منحصر ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم کی متعدد آیات میں بھی "عملِ صالح" کی پے در پے تاکید و تلقین کی گئی ہے، اور اسے فرد و ملت کی تمام دنیوی و اُخروی سعادتوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال کا فلسفۂ جد و جہد یا تلقینِ سعیِ پیہم سراسر تعلیماتِ قرآن پر مبنی ہے۔ اور وہ محض عقائد و نظریات کو نہیں بلکہ "عمل" کو نجات و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ یقین اور "ایمان محکم" کی متواتر تاکید و تلقین فرماتے ہیں، لیکن ان کا موقف یہ ہے کہ "یقین و ایمان" کے تمام ثمرات و ممکنات بصورتِ عمل ظہور پذیر ہونا چاہئیں، ورنہ ہنوز ایمان ضعیف و بے روح ہے۔

اب اس قرآنی حقیقت پر غور فرمائیے، جس کی رو سے "ایمان" اور "عمل" لازم و ملزوم ہیں۔ بطورِ مثال:۔

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

(پ ۳۰ - ع ۲۸)

قسم ہے مجھے زمانے کی کہ انسان سراسر نقصان میں ہے مگر (فائدے میں صرف) وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، نیک کام کیے اور ایک دوسرے کو راہِ حق پر چلنے کی نصیحت کرتے رہے اور (مصیبت میں) صبر و تحمل کی تلقین کی۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝ (پ ۱۳ - ع ۱۰)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کے لئے (آخرت میں) خوشی اور اچھا ٹھکانا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِیْمِ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ (پ ۲۱ : ۱۰ ع)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کے لئے نعمتوں سے بھرے ہوئے باغات ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ زبردست ہے حکمت والا۔

"فرد" کی ترقی و سرفرازی وحیِ الٰہی کی روشنی میں

قرآن حکیم میں یہ ابدی حقیقت نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے کہ کسی بھی فرد کی ترقی و پیش قدمی اور اس کی زندگی کے ثمرات و مفادات کا حصول سراسر اس کی سعی و محنت پر موقوف ہے؛ اور یہ "سخت کوشی" یا جذبۂ عمل اس کی فطرت میں ہے۔ جو لوگ اپنی تن آسانی و آرام طلبی کو "قناعت" اور "توکل" کا جامہ پہنانے کے عادی ہیں، یا جو بقولِ اقبالؒ "تقدیر"[1] کو بہانہ بناتے ہوئے عمل اور سخت کوشی سے کنارہ کش ہو چکے ہیں، انہیں اس قانونِ الٰہی کی روشنی میں اپنے اندازِ فکر و عمل کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ اس موضوع پر ان

---

[1] خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ (ارمغانِ حجاز)

سے زیادہ بلیغ اور جامع الفاظ اور کیا ہوں گے کہ:۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰیۙ
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰیۙ ثُمَّ
يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیۙ
(پ۲۷ - ع۷)

انسان صرف اپنی سعی و محنت ہی کا ثمرہ پائیگا،
اور (آخرت میں بھی) اس کی جدوجہد (کی جزا)
اسے دکھائی جائے گی۔ پھر اس کو اس کے نیک
اعمال کا) پورا پورا معاوضہ عطا کیا
جائے گا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍؕ
(پ۳۰ - ع۱۵)

ہم نے انسان کو محنت و مشقت کے لئے
پیدا کیا ہے!

اور اس ضمن میں یہ قانونِ فطرت بھی بیان فرما دیا کہ ہر فرد اپنے اندازِ عمل کے نتائج و ثمرات کا خود ذمہ دار ہے اور اس موضوع پر کوئی بھی دوسرا شخص اس کا بوجھ بانٹ لینے یا اس کے ناپسندیدہ اور قبیح نتائجِ عمل کی تلخی و تباہ کاری میں کمی کر دینے کا مکلف و ذمہ دار نہیں:۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ج
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ
(پ۸ - ع۶)

اور جو کوئی کسی گناہ یا غلط کاری میں مبتلا
ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری بھی صرف اسی پر ہے
اور کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں
اٹھائے گا، پھر تم سب اپنے پروردگار کی
طرف لوٹائے جاؤ گے، اور وہ تمہیں بتائے گا
کہ تم کن باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف
و مجادلہ رکھتے تھے۔

"قوم" کی ترقی و سرفرازی وحی الٰہی کی روشنی میں

مندرجہ بالا آیات میں جس طرح "فرد" کے لئے اس کے دنیوی و اُخروی مفادات وثمرات کو اس کے اپنے اندازِ عمل اور پیمانۂ جد وجہد سے وابستہ کیا گیا ہے۔ بعینہٖ ہر قوم کی ترقی و سرفرازی اور اثر و نفوذ کو بھی اس کے اندازِ عمل اور جذبۂ سخت کوشی اور اصلاح پسندی پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ بھی ایک آئینِ قدرت اور اصولِ فطرت ہے کہ جب تک کسی قوم میں بذاتِ خود اپنی اصلاح اور فلاح و بہبود کا شعور و احساس پیدا نہ ہو اور جب تک وہ اپنے فکری و عملی معائب و مفسدات کو پوری جد وجہد سے رفع کر کے فکر و عمل کی "صراطِ مستقیم" پر مردانہ وار گامزن نہ ہو، اللہ تعالےٰ اس کی حیاتِ اجتماعی میں قطعاً کوئی تغیر و انقلاب پیدا نہیں کرتا۔ اور وہ "قادر مطلق" ہونے کے باوجود ایسا تغیر و انقلاب پیدا بھی کیوں کرے، جبکہ وہ قوم نہ تو ایسے انقلاب انگیز تغیر کی آرزومند ہے، اور نہ اس مقصد کے لئے خلوص سے عملی طور پر کوئی "جد وجہد" کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ اللہ تعالےٰ کا ایک مستقل اور ابدی قانون ہے کہ وہ کسی بھی فرد یا ملت کے کردار اور حیاتِ انفرادی و اجتماعی میں کوئی خوش آئند اور صحت مند تغیر پیدا نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ ایسے تغیر و انقلاب کے لئے اس کے دل میں جذبہ و ولولہ نہ ہو، جراٴت مندانہ اقدام نہ ہو، اور پھر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے خلوص اور عزم و استقامت سے جد وجہد نہ کرے۔ ملاحظہ ہو یہ قانونِ فطرت، مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ میں :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط	اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت کو ہرگز نہیں بدلتا تاوقتیکہ وہ قوم خود اپنی حالت کو بدلنے کے لئے جد وجہد نہ کرے!
(پ۱۳ : ع۸)	

بنا بریں مسلمانوں کو اس دیرینہ اور خطرناک غلط فہمی میں زیادہ دیر تک مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ جدو جہد اور سخت کوشی کے بغیر اللہ تعالےٰ خود ہی اپنے "فضل و کرم" سے ان کی حیاتِ اجتماعی میں مطلوبہ تغیر و انقلاب پیدا کر دے گا۔ اور وہ اپنی گم گشتہ عظمت و سطوت کو محض دعاؤں اور التجاؤں کے سہارے دوبارہ حاصل کر لیں گے!

اقبال کی تلقینِ سخت کوشی فرد و ملت کے لئے

جدوجہد یا "سخت کوشی" علامہ اقبال کا نہایت محبوب و پسندیدہ موضوع ہے، اور اس ذیل میں ان کی فارسی اور اردو تصنیفات میں بہت سی مستقل نظمیں اور منفرد اشعار ملتے ہیں۔ ہر نظم اور ہر شعر میں ان کا زورِ بیان اور جوشِ طبع یکساں طور پر کارفرما ہے، وہ خوب سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں نے صدیوں سے جو تن آسانی و سہل انگاری، یاس و قنوطیت، تعطّل، بے عملی اور کش مکشِ حیات سے گریز کی روش اختیار کر رکھی ہے، اس کی تلافی صرف اسی صورت ممکن ہو سکتی ہے کہ انہیں سخت کوشی، جفا طلبی اور عملِ پیہم کی زیادہ سے زیادہ تلقین کی جائے۔ دنیا ان کے نزدیک ایک ایسا میدانِ جنگ ہے، جس میں ازل سے حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان مسلسل تصادم ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہاں سکر آمیز اور مائلِ عیش و عشرت کرنے والے عوامل تو یقیناً مہلک ہیں لیکن خود اعتمادی اور جرأت و بے باکی سے جہاد کرنے کا نتیجہ بلاشبہ فتح و کامرانی ہے۔ بنا بریں فرماتے ہیں:-

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زُجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

ا۔ زجاج: شیشہ۔ اس مصرع میں "زجاج" استعارہ ہے ضعف و ناتوانی کیلئے اور "سنگ" استعارہ ہے قوت و توانائی کیلئے

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل نہ "جل ترنگ"! (ضربِ کلیم)

اور جس قوم کے مرد تن آسان اور عیش دوست ہوتے ہوئے محنت و مشقت سے جی چرائیں، رزم گاہِ حیات سے گریزاں ہوں، اور ہنگامی مصائب و حادثات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، تو ہر میدان میں "شکست" ان کا مقدر ہے :۔

گریز کشمکشِ زندگی سے مَردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

الغرض اقبالؔ کے نزدیک ہر ایسی زندگی جس میں ذوق و شوق انقلاب اور جذبۂ تسخیر و فتح نہ ہو، یقیناً موت سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ اس میں "زندگی" کے آثار و شواہد ہی نہیں پائے گئے :۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمَم[1] کی حیات کشمکشِ انقلاب!

بعد ازیں اس موضوع پر علامہ اقبالؔ کا منتخب فارسی و اردو کلام پیش کر دیا جاتا ہے۔ قارئین اس کے جوشِ بیان، سوز و گداز اور ولولہ انگیز معانی و مطالب سے بغور محظوظ و مستفید ہوں :۔

---

[1] اُمَم : جمع اُمّت کی

تاکجا خود را شماری ماء و طیں؟ — از گِلِ خود شعلۂ طور آفریں!

تو کب تک خودی کو پانی اور مٹی کا مرکب سمجھے گا — اب اپنی مٹی سے شعلۂ طور برپا کر!

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی ست — سیل را پست و بلند جادہ چیست!

اگر ہمت قوی ہے تو سنگِ راہ بھی پانی ہو کر بہ جاتا ہے — سیلاب کے نزدیک راہ کا پست و بلند کیا معنی رکھتا ہے

سنگِ رہ گردد فسانِ تیغِ عزم — قطعِ منزل امتحانِ تیغِ عزم!

سنگِ راہ تو تیغِ عزم کو تیز کرنے کا پتھر ہے — اور منزل کو کاٹنا تیغِ عزم کا ادنٰے امتحان ہے

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود! — گر بخود محکم نۂ بودن چہ سود؟

بہائم کی مانند محض کھانے اور آرام کر بیٹھنے کا کیا فائدہ؟ — اور اگر تو اپنے آپ میں توانا نہیں تو زندگی کا کیا فائدہ!

خویش را چوں از خودی محکم کنی — تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

جب تو اپنے آپ کو "خودی" سے محکم و توانا کرلے — پھر اگر تو چاہے تو تمام دنیا کو درہم و برہم کرسکتا ہے

چیست مردن؟ از خودی غافل شدن! — تو چہ پنداری فراقِ جان و تن؟

"موت" کیا چیز ہے؟ خودی کی حکمت سے غافل ہو جانا — کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ موت فراقِ جان و تن کا نام ہے

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو

اگر تو فنا چاہتا ہے تو اپنے آپ سے آزاد ہو جا

گر بقا خواہی بخود آباد شو! (اسرارِ خودی)

اور اگر تو بقا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو خوب پہچان لے

نائبِ حق در جہاں آدم شود — بر عناصر حکمِ او محکم شود

خدا کا نائب دنیا میں انسان ہی بنتا ہے — اور عناصر پر اس کا حکم و اقتدار توانا ہوتا ہے

تنگی ات پہنا پذیرد در جہاں — کارِ تو اتمام گیرد در جہاں!

ہر حالت میں تیری تنگی وسعت سے بدل جاتی ہے — اور تیرا ہی کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے

خویش را بر پشتِ باد اسوار کن[1] — یعنی ایں جمّاز را مہار کن!

پس تو خود کو ہوا کی پیٹھ پر سوار کر — یعنی اس اونٹنی کی ناک میں مہار ڈال

دستِ رنگیں کن ز خونِ کوہسار[2] — جوئے آبِ گوہر از دریا برآر!

تو پہاڑوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ — اور موتیوں کی ندی قعرِ دریا سے نکال لا

صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند — مہرہا در ذرہ ہا پوشیدہ اند!

ایک ہی فضا میں سینکڑوں دنیائیں مخفی ہیں — اور ذروں کے اندر سورج چھپ رہے ہیں

از شعاعش دیدہ کن نادیدہ را — وا نما اسرارِ نافہمیدہ را!

اس سورج کی شعاع سے مخفی اشیا کو ظاہر کر — اور ناقابلِ فہم چیزوں کے اسرار و خواص بیان کر

تابش از خورشیدِ عالمتاب گیر — برقِ طاق افروز از سیلاب گیر

دنیا کو روشن کرنے والے آفتاب سے حرارت لے — اور طاق کو روشن کرنے والی بجلی سیلاب سے

جستجو را محکم از تدبیر کن!

اپنی جستجو کو تدبیر سے مضبوط و توانا کر

انفس و آفاق را تسخیر کن! (رموزِ بیخودی)

اور نہ صرف اپنے نفس کو بلکہ دنیا کو بھی مسخر کر

ہیچ می دانی کہ روزے در ولر[3] — موجۂ می گفت با موجِ دگر

کیا تو یہ جانتا ہے کہ ایک دن وُلر میں — ایک موج دوسری موج سے یوں ہمکلام ہوئی

---

[1] مراد یہ کہ فضا کے ذریعے بھی زندگی کی ممکنات کو مسخر کر!

[2] مراد یہ کہ معدنیات کی دریافت سے بھی ملک و ملت کو مستفید کر!

[3] کشمیر کا مشہور دریا۔

چند در قلزم بیک دیگر زنیم
خیز تا یک دم بساحل سر زنیم

ہم اس دریا میں کب تک ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں
اب تو اٹھو کہ ہم چل کر ساحل سے اپنا سر ٹکرائیں

زادۂ ما یعنی آں جوئے کہن
شور او در وادی و کوہ و دمن!

وہ ہمیں میں سے پیدا شدہ پرانی ندی
جس کا شور وادیوں، پہاڑوں اور ٹیلوں میں ہے

ہر زماں بر سنگِ رہ خود را زند
تا بنائے کوہ را برمی زند

ہر لمحہ خود کو سنگِ راہ سے ٹکراتی ہے
تاکہ پہاڑ کو بھی اس کی بنیاد سے اکھیڑ پھینکے

آں جواں کو شہر و دشت و در گرفت
پرورش از شیرِ صد مادر گرفت

وہ جوان جس نے شہر و دشت کو زد میں لے رکھا ہے
اور جس نے سینکڑوں ماؤں کے دودھ سے پرورش پائی ہے

سطوتِ او خاکیاں را محشرے است
ایں ہمہ از ماست نے از دیگرے است

اس کی قوت و سطوت انسانوں کے لئے قیامت ہے
یہ سب کچھ ہمارے جوش و خروش ہی کا نتیجہ ہے

زیستن اندر حدِ ساحل خطاست
ساحلِ ما سنگے اندر راہِ ماست

حدِ ساحل کے اندر زندگی بسر کرنا حماقت ہے
اور ہمارا ساحل ہمارے لئے سنگ راہ بن رہا ہے

با کراں در ساختن مرگِ دوام
گرچہ اندر بحر غلطی صبح و شام

کنارے پر قناعت کر لینا ہمیشہ کی موت ہے
اگرچہ تو دریا میں صبح و شام کھیلتی رہے

زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت
زندگی کا لطف تو کوہ و دشت میں جولانیاں لینا ہے
اے خنک موجے کہ از ساحل گذشت (جاوید نامہ)
لہٰذا خوش نصیب ہے وہ موج جو حدِ ساحل سے گذر گئی

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد — می شناسی عصر ما با ما چہ کرد؟

اے کہ تو ذوق و شوق و سوز و درد سے محروم ہے — کیا تو جانتا ہے کہ ہمارے زمانے نے ہم سے کیا سلوک کیا؟

عصر ما ما را ز ما بیگانہ کرد — از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد

ہمارے زمانے نے ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا — اور انتہا یہ ہے کہ مصطفیٰؐ کے جمالِ روحانی سے بھی بیگانہ کر دیا

سوزِ او تا از میانِ سینہ رفت — جوہر آئینہ از آئینہ رفت!

جب سے اس کا سوزِ عشق سینوں میں نابود ہو گیا — گویا آئینہ سے جوہر آئینہ جدا ہو گیا

باطنِ ایں عصر را نشناختی — داوِ اوّل خویش را در باختی!

اے مسلمان! تو نے عصرِ حاضر کے باطن کو نہیں پہچانا — لہٰذا تو ابلیس سے پہلے داؤ ہی میں شکست کھا گیا

تا دماغِ تو بہ پیچاکش فتاد — آرزوئے زندہ در دل نزاد

جب سے تیرا دماغ اس کی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہے — تیرے دل میں کوئی آرزوئے زندہ پیدا نہیں ہوئی

احتسابِ خویش کن از خود مرو — یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو!

تو اپنے نفس کا محاسبہ کر اور اپنے آپ سے بیگانہ مت ہو — بلکہ کچھ دیر کیلئے اپنے علاوہ دوسروں سے غافل ہو جا

تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس — اندریں کشور مقامِ خود شناس

تیرے نفس میں خوف و ہراس اور یہ وسوسے کب تک؟ — اس ملک میں اپنے صحیح مقام و منصب کو پہچان

ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند — بر نگوں شاخ آشیانِ خود مبند!

اس گلستان میں بہت سی بلند شاخیں ہیں — لہٰذا تو اپنا آشیانہ کسی پست شاخ پر مت بنا

نغمہ داری در گلو اے بے خبر — جنس خود بشناس و با زاغاں مپر!

اے بے خبر! تو اپنے گلے میں نہایت دلپذیر نغمہ رکھتا ہے — اپنی جنس گرانمایہ کو پہچان اور کوؤں کے ساتھ مت اُڑ

خویشتن را تیزیِ شمشیر دہ — باز خود را در کفِ تقدیر دہ!

تو اپنی خودی کو تلوار کی سی تیزی عطا کر — اور پھر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دے

اندرونِ تست سیلِ بے پناہ   پیشِ او کوہِ گراں مانندِ کاہ!

تیرے سینے میں تو ایک بے پناہ سیلاب مخفی ہے   جس کے مقابل پہاڑ بھی تنکوں کی مانند ہو جائیں

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر

اب میرے سوز و گداز سے اپنا حصہ حاصل کر لے

بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر! (پس چہ باید کرد)

کیونکہ میرے بعد مجھ جیسا مردِ فقیر اور نہیں آئے گا!

سکندر با خضرِ خوش نکتہ گفت

سکندر نے خضر سے کیا عمدہ نکتہ بیان کیا کہ

شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو!

تو خشکی اور تری کے سوز و سازِ زندگی میں شریک ہو

تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی

تو زندگی کی جنگ میدان کے کنارے کھڑا دیکھ رہا ہے

بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو! (پیامِ مشرق)

آ، اور میدانِ جنگ میں مر کر زندۂ جاوید ہو جا

دمادم نقشہائے تازہ ریزد

زندگی تو ہر لحظے تازہ بتازہ نقش بناتی رہتی ہے

بیک صورت قرارِ زندگی نیست!

کیونکہ وہ کسی ایک صورت پر قرار و سکون نہیں پاتی

اگر امروزِ تو تصویرِ دوشش است

پس اگر تیرا آج تیرے کل کی ہو بہو تصویر ہے

بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست[1] (پیامِ مشرق)

تو سمجھ لے کہ تیری خاک میں کوئی شرارِ زندگی نہیں

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا

اپنی محفل ساحل پر آراستہ نہ کر کیونکہ اس جگہ

نوائے زندگانی نرم خیز است

زندگی کی آواز نہایت مدھم اٹھتی ہے

بدریا غلط و با موجش در آویز

بلکہ متلاطم دریا میں چھلانگ اور موجوں سے الجھ پڑ

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است (پیامِ مشرق)

کیونکہ غیر فانی زندگی صرف ایک جنگ و تصادم ہی ہے

مگو از مدعائے زندگانی

تو زندگی کے مقصد و مدعا کے متعلق گفتگو مت کر

ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست

کیونکہ تو اس کی تنوع پسندی اور طریقِ عمل کو نہیں جانتا

---

[1] اس قطعہ میں علامہ مرحوم نے نہایت موثر و موزوں الفاظ میں زندگی کا قانونِ ارتقا بیان فرمایا ہے کہ وہ ایک فعّال متحرک اور تیزی سے پیش قدمی کرنے والی قوت ہے۔ سکون و جمود اس کی فطرت کے منافی ہے؛

من از ذوقِ سفر آنگونه مستم

چنانچہ میں ذوقِ سفر سے اس قدر مست ہو رہا ہوں

کہ منزل پیشِ ما جز سنگِ رہ نیست (پیامِ مشرق)

کہ "منزل" میرے نزدیک سنگِ راہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

خیالِ او درونِ دیدہ خوشتر!

محبوبِ حقیقی کا تصور ہی میری آنکھوں کی روشنی ہے

غمش افزودہ جاں کاہیدہ خوشتر

اس کا غمِ عشق بڑھ جانا اور جان کا گھل جانا ہی محبوب ہے

مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت

مجھے ایک اہلِ دل نے یہ حکیمانہ نکتہ سمجھایا کہ

ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر! (پیامِ مشرق)

منزل سے پیچ در پیچ راستہ زیادہ پسندیدہ ہے

دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است!

ہماری حیاتِ جاوداں تو سوزِ ناتمام سے ہے

چو ماہی جز تپش بر ما حرام است!

اور مچھلی کی طرح اضطرابِ مسلسل کے سوا ہم پر سب کچھ حرام ہے

مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل

ساحل کا خواستگار مت ہو، کیونکہ ساحل کی آغوش میں

تپیدِ یک دم و مرگِ دوام است (پیامِ مشرق)

صرف ایک لمحے کا اضطراب ہے، اور پھر مرگِ دوام!

ضمیرِ کُن[1] فکاں غیر از تو کس نیست!

تیرے علاوہ "ضمیرِ کُن فکاں" کا مرجع اور کوئی نہیں

نشانِ بے نشاں[2] غیر از تو کس نیست

اور تیرے سوا اس ہستیِ غائب کا مظہر اور کوئی نہیں

قدم بے باک تر نہ در رہ زیست

لہٰذا زندگی کی راہ میں نہایت بے باکی سے قدم رکھ

بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست (پیامِ مشرق)

کیونکہ دنیا کی وسعت میں تیرے سوا اور کوئی نہیں

عجم بحریست ناپیدا کنارے

عجم وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں

کہ در وے گوہرِ الماس رنگ است!

اور اس میں الماس کے رنگ جیسے بے شمار موتی ہیں

---

[1] اس رباعی کا مخاطب بالخصوص مسلمان ہے، اور فرماتے ہیں کہ "ضمیرِ کُن فکاں" کا اصل مرجع اور دنیا میں موجود حقیقی مردِ مومن ہی ہے۔ لہٰذا اسے مخلوق سے بھی کبھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔

[2] نشانِ بے نشان: غیب اور غیر مرئی خدا کی واضح علامت

لیکن میں تو اپنی کشتی اس دریا میں چلاتا ہی نہیں

بدریائے کہ موجش بے نہنگ است (پیامِ مشرق)

جس کی موجوں میں مگرمچھ موجود نہ ہوں

قبائے زندگانی چاک تا کے؟

تو اپنی زندگی کی قبا کو کب تک چاک کرتا رہے گا؟

چو موراں آشیاں در خاک تا کے؟

اور چیونٹیوں کی مانند خاک میں کب تک گھر بنائیگا؟

بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز

اب پرواز میں آ اور شاہین کا کردار سیکھ

تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے؟

خس و خاشاک میں تو کب تک دانے تلاش کرے گا؟ (پیامِ مشرق)

دل بے باک را ضرغام رنگ است!

ایک بے خوف دل کے لئے شیر بھی گویا بھیڑ ہے

دل ترسندہ را آہو پلنگ است!

اور خوفزدہ دل کے لئے ہرن بھی گویا چیتا ہے

اگر بیمے نداری بحر صحرا است

اگر تو بے باک ہے تو سمندر بھی تیرے لئے صحرا ہے

اگر ترسی بہر موجش نہنگ است [1] (پیامِ مشرق)
اور اگر تو خائف و بزدل ہے تو اس کی ہر موج میں مگرمچھ ہے

زقیدِ و صیدِ نہنگاں حکایتے آور
تو ہمیں مگرمچھوں کے شکار کی کہانیاں آ کر سنا
مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
اور یہ نہ کہہ کہ میری کشتی تو دریا سے آشنا ہی نہیں
مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت
میں تو اس مسافر کی ہمت کا پرستار ہوں جو
بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست (پیامِ مشرق)
ایسی راہ پر گامزن نہیں ہوا جس میں کوہ و دشت و دریا نہیں

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
تو اپنے آپ میں پہاڑوں کی طرح محکم و توانا رہ
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است (پیامِ مشرق)
اور تنکوں کی طرح مت جی کیونکہ ہوا تیز اور شعلہ بے باک ہے

---

[1] اس رباعی میں واقعاتی اور مشاہداتی بنیادوں پر ایک ٹھوس نفسیاتی حقیقت بیان کی گئی ہے یہی مفہوم ایک اور فارسی شعر میں یوں بیان فرمایا :-

بخود نگر ، گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی
اگر نگاہِ تو دیگر شود ، جہاں دگر است ! (زبورِ عجم)

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است

زندہ دل لوگوں کے مذہب میں زندگی کے معنی ہیں جفا طلبی

سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است! (پیامِ مشرق)

میں نے کعبہ کا سفر اس لئے اختیار نہیں کیا کہ اس کی راہ بے خطر ہے

زندگی رہرواں در تگ و تاز است و بس

مسافروں کی زندگی کا مشغلہ تو دوڑ بھاگ ہی ہے

قافلۂ موج را : جادہ و منزل کجاست

چنانچہ قافلۂ موج کیلئے کوئی معین راستہ یا منزل کہاں ہے

گلہ از سختیِ ایّام بگذار

مصائبِ زمانہ کے خلاف شکوہ و شکایت چھوڑ دے

کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است!

کیونکہ جس نے سختیاں نہ سہی ہوں، وہ کھوٹا رہتا ہے

نمی دانی کہ آبِ جوئبا راں

کیا تو نہیں جانتا کہ آبشاروں کا پانی

اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است! (ارمغانِ حجاز)

جب پتھروں پر رواں دواں ہوتا ہے تو زیادہ خوشگوار ہے

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را

وہ مسلمان جو دینِ فطرت کے اسرار و رموز سمجھتا ہے

نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے آگے اپنی پیشانی نہیں رگڑتا

اگر گردوں بکامِ او نہ گردد

اگر آسمان اس کے حسبِ منشا گردش نہ کرے

بکامِ خود بگرداند زمیں را (ارمغانِ حجاز)

تو کم از کم زمین کو وہ ضرور گردش میں لاتا ہے

لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز[1]

اس چمن کا لالہ ابھی آلودۂ رنگ ہو رہا ہے

سپر از دست میندازکہ جنگ است ہنوز

لہٰذا ڈھال کو ہاتھ سے مت چھوڑ کہ ابھی جنگ جاری ہے

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز

اے کہ تو ساحل پر آرام سے بیٹھا ہوا ہے اب اٹھ کھڑا ہو

کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز

کیونکہ ابھی تو تجھے گرداب اور مگرمچھ سے جنگ آزما ہونا ہے

---

[1] یعنی ابھی رزم و پیکار کے آثار موجود ہیں، اور ایسے حالات میں ہتھیار نیچے ڈال دینا دانشمندی نہیں۔

از سرِ تیشہ گذشتن زخردمندی نیست

تیشے سے دست بردار ہو جانا دانائی نہیں

اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز (زبورِ عجم)

کیونکہ ابھی تو کتنے ہی جواہرات کان سے نکالے جانے والے ہیں

مذہبِ زندہ دلاں خوابِ پریشانے نیست

زندہ دل لوگوں کا مذہب و مسلک خوابِ پریشان تو نہیں

از ہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است (زبورِ عجم)

بلکہ (جہانِ کہنہ کی) اسی مٹی سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا ہے

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم

میں اس علم و دانش کو گھاس کے ایک تنکے کے عوض بھی نہیں خریدتا

کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را (زبورِ عجم)

جو کسی مردِ مجاہد کو اس کے تیغ و سپر سے غافل و بیگانہ کر دے

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر

تو اپنی ممکناتِ زندگی پر غور کر اس صحرا سے خوفزدہ ہو کر مت گذر

کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست! (زبورِ عجم)

کیونکہ یہاں موجودِ حقیقی تو ہے، اور وجودِ دو جہاں تیرے سامنے ہیچ ہے

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی

اگر تو اپنے باپ کی میراث سے ایک ہیرے کا خواہاں ہے تو شرمندہ ہو

کجا عیشِ برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است! (زبورِ عجم)

کیونکہ پہاڑ کا سینہ چیر کر ہیرا نکالنے میں کچھ اور ہی لطف ہے

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی! (بانگِ درا)

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز

سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی! (بانگِ درا)

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہِ نو

کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو! (بالِ جبریل)

چیتے کا جگر چاہیئے، شاہیں کا تجسس

جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ! (بالِ جبریل)

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ[1] جس کا چراغ

---

[1] اس لئے کہ چیتے کی آنکھ اندھیری رات میں چیزوں کو روشنیٔ روشن سے بھی بہتر طور پر دیکھ سکتی ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں!
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں[١] میں! (بالِ جبریل)

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
"جوشِ کردار" سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز!
"جوشِ کردار" سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
"جوشِ کردار" سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز!
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
"جوشِ کردار" سے بنتی ہے خدا کی آواز! (بالِ جبریل)

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک

---

١ کیونکہ عقاب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر پرواز کی جائے!

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک!
مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک! (ضرب کلیم)

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد!
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد!
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے، وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد! (ضرب کلیم)

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
"افکار" میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط "مستیٔ کردار"! (ضربِ کلیم)

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
"کوشش" سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد!
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد! (ضربِ کلیم)

ترا بحر پر سکوں ہے، یہ سکوں ہے، یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ! (ضربِ کلیم)

دریا میں موتی! اے موجِ بے باک!
ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک! (ضربِ کلیم)

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی! (ضربِ کلیم)

رہبانیت | "رہبانیت" کا مسلک، قوم کے زوال و انحطاط کا ایک واضح اور بنیادی

سبب ہے۔ کیونکہ یہ مسلک تن آسانی، گوشہ گیری، کشمکشِ حیات سے گریز، تعطل اور اندوہ و دلگیری کا معلم ہے۔ چونکہ یہ فلسفۂ حیات قنوطیت کی پیداوار ہے، اور زندگی کی جائز و حلال نعمتوں اور مسرتوں سے بھی اجتناب کا خواہاں ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ جدوجہد اور سخت کوشی سے نہ صرف اسے کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ اس کی انتہائی ضد واقع ہوا ہے۔ پس ہم نے اس موضوع کے تحت "رہبانیت" کا تذکرہ بھی لازم سمجھا، کیونکہ علامہ اقبال جس اہتمام سے جدوجہد اور سخت کوشی کی تاکید و تلقین فرماتے ہیں، اسی اہتمام سے "رہبانیت" کی تردید و مذمت بھی فرماتے ہیں، کیونکہ وہ انسان کو زندگی کی مثبت اور تعمیری قدروں سے مایوس کر کے اس کے قوائے عمل کو شل کر دیتی ہے۔ یوں بھی ہمارے ہاں قرآن و حدیث کے صریح احکام و فرمودات کی بنا پر "رہبانیت" کو مسلمانوں کے لئے قطعی حرام قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ بعض آیات میں فرماتا ہے کہ میری جائز کردہ نعمتوں اور "طیبات" (پاک چیزوں) کو خود پر حرام و ناجائز قرار دینے کا مسلک یہود و نصاریٰ کے راہبوں نے اختیار کیا، لیکن چونکہ یہ ایک غیر قدرتی اور غیر فطری شے تھی، لہٰذا ان سے بھی اس کی پیروی نہ ہو سکی اور وہ در پردہ عملاً مسلکِ رہبانیت" کے مخالف ہی رہے۔ غور فرمائیے مندرجہ ذیل آیات پر:۔

وَرَهْبَانِيَّةً ۨ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (پ ۲۷ : ۲۰)	اور تارک الدنیا ہو جانے کا مسلک تو نصاریٰ نے خود وضع کر لیا تھا، لیکن ہم نے انہیں یہ طریقِ زندگی اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، یہ مسلک انہوں نے اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا، مگر پھر بھی خلافِ فطرت ہونے کی بنا پر وہ کما حقہٗ اس کی پیروی نہ کر سکے

پھر ہم نے ان میں سے ایمان لانے والوں کو ان کا اجر و ثواب عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

(پ ۸ - ع ۱۱)

آپ کہئے کہ اللہ تعالےٰ کی حلال و جائز کردہ زیب و زینت کی چیزوں اور پاک نعمتوں کو حرام قرار دینے والا ہے کون؟ آپ کہئے کہ یہ جائز نعمتیں ایمانداروں کے لئے ہیں حیاتِ دنیوی میں، اور بالخصوص روزِ قیامت بھی خالصتًا ان کے لئے ہیں۔ اور اسی طرح ہم صاحبِ علم و شعور لوگوں کے لئے اپنی آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ وحی الٰہی نے کبھی کسی کتاب یا پیغمبر کے ذریعے نوعِ انسانی کو "رہبانیت" کی تعلیم ہرگز نہیں دی، اور نہ اس کی پیروی کے لئے کوئی حکم صادر فرمایا۔ بالفاظِ دیگر "رہبانیت" کو اصل و خالص اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں، بلکہ یہ عجمی تصوف کی پیداوار ہے۔ "بلے میوہ ز میوہ رنگ گیرد" ایک ٹھوس اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ عرب سے نکل کر عجم میں مسلمانوں کو جو فتوحات حاصل ہوئیں اور مفتوح اقوام کے ربط و اختلاط سے ان کے قلوب و اذہان نے جو تاثرات اخذ کئے، وہ متواتر قنوطی تصوف اور رہبانیت کے عقائد و تصورات پر منتج ہوئے۔ اقوامِ مغلوبہ کا معمول و مسلک اقوامِ غالبہ پر کس بری طرح اثر انداز ہوتا ہے، اس مفہوم میں "اسرارِ خودی" کی

حکایت بر صفحہ ۲۹ بغور مطالعہ فرمائیں۔ الغرض "رہبانیت" صدیوں سے مسلمانوں کے قلب و ذہن اور علوم و فنون پر بڑی شدت سے اثر انداز ہے، جس کے تحت بالفاظ اقبالؔ شیر ژیاں روباہ دیش ہو چکے ہیں، اور "خیر الامم" میں جدوجہد، سخت کوشی و جفا طلبی، اور انقلاب انگیز اقدام کا جذبہ بالکل مفقود ہو چکا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں خانقاہی نظام تمامتر رہبانیت کا داعی اور علمبردار رہا ہے اور جب تک طریقِ خانقاہی" میں صحت مند اصلاح نہیں ہوتی رہبانیت، بے عملی، اور یاس و قنوطیت کی بیخ کنی قطعی ناممکن ہے۔ اس موضوع کے تحت مندرجہ ذیل امثلہ پر بطور خاص غور و فکر فرمائیں:-

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ
مسیحیت میں زندگی کی مصلحت یہ ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کرو

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
لیکن اسلام میں زندگی کی مصلحت یہ ہے کہ جہاد کرو

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت
وہ رسولِ برحق جس نے اقوام کو رازِ عشق بتایا

جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت[۱]
اس نے "جہاد" کو اسلام کی رہبانیت قرار دیا

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
پس شہید کے علاوہ اس نکتے کو اور کوئی نہیں سمجھ سکتا

کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را (جاوید نامہ)
کیونکہ اس نے یہ نکتہ اپنی جان قربان کر کے خریدا ہے

---

[۱] تلمیح بحدیثِ نبوی:- اَلْجِهَادُ رَهْبَانِيَّةُ الْاِسْلَامِ
یعنی "اسلام کی رہبانیت جہاد ہے"

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری! (ارمغانِ حجاز)

خانقاہ

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن!
"قُم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے[1]
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن! (بالِ جبریل)

یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی (بالِ جبریل)

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی
آج اُن خانقہوں میں ہے فقط روباہی! (بالِ جبریل)

---

[1] "قُم باذن اللہ" یعنی اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑا ہو (زندہ ہو جا) — حضرت عیسیٰؑ جب اذنِ الٰہی سے مُردوں کو زندہ کرتے تھے، تو ان کی زبان پر یہی الفاظ ہوتے تھے۔ حاصلِ شعر یہ ہے کہ جو بندگانِ دین اور اولیاء اللہ اپنی روحانی قوت سے مردہ روحوں کو (باقی صفحہ ۵۵۵ پر)

تصوف

یہ حکمتِ ملکوتی[1]، یہ علمِ لاہوتی[2]
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں، تو کچھ بھی نہیں!
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں!
خرد نے کہہ بھی دیا "لا الہٰ" تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں، تو کچھ بھی نہیں! (ضربِ کلیم)

شکست

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!

(بقیہ صفحہ ۵۵۴) زندہ کر دیتے اور گم کردہ راہ لوگوں کو راہِ راست پر لے آتے تھے۔ وہ تو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، اور ان کے پیچھے خانقاہوں میں محض "مجاور" اور "گورکن" باقی رہ گئے!

[1] حکمتِ ملکوتی: فرشتوں سے تعلق رکھنے والی حکمت۔ علمِ لدنی۔

[2] علمِ لاہوتی: الہیات: ذات و صفاتِ خداوندی کا علم۔

فقیہِ شہر بھی "رہبانیت" پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست!
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی!
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟ (ضربِ کلیم)

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا! (ضربِ کلیم)

قارئینِ کرام! آج بھی تاریخ عالم کے صاحبِ عزم و ہمت، مستقل مزاج اور سخت کوش اعاظم رجال کی سوانح عمریاں مطالعہ فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی شخص گوشہ گیر، تن آسان اور آرام پسند نہیں تھا۔ وہ سب راہبانہ طریقِ حیات اور یاس و قنوطیت سے نہایت بیزار و متنفر تھے۔ بلکہ گوناگوں مصائب و مشکلات اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی وہ امید و جستجو سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور شبانہ روز جد و جہد سے اپنے نصب العین کو مسخر کر لیا، منزلِ مقصود سے ہمکنار ہوئے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنے سوانح حیات میں روشنی کے ایسے مینار چھوڑ گئے جو زندگی میں قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ان اولوالعزم اور صاحبِ ہمت و استقامت شخصیات میں مصلحینِ قوم بھی ہیں اور سپہ سالار بھی، اہلِ قلم بھی ہیں اور شعلہ نوا شاعر بھی، مجدد و مجتہد بھی ہیں اور فن کار بھی، سیاح بھی ہیں اور سائنسدان بھی، محقق بھی ہیں اور موجد بھی، مدبّر و مفکر بھی ہیں اور فاتحِ اعظم بھی، لیکن ان سب کی قدرِ مشترک "سخت کوشی" اور "سعیِ پیہم" ہے جب تک کسی قوم میں ایسے اولوالعزم

اور بے باک انسان موجود ہیں، وہ قوم زندہ و پائندہ ، باوقار اور صاحبِ عظمت ہے لیکن جس نسبت سے کسی قوم میں ایسے مایۂ ناز افراد کی قلت ہوتی ہے، اسی نسبت سے وہ قعرِ ذلت وزوال میں گرتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر ہمیں دوبارہ یہ ازلی حقیقت دہرا لینے دیجئے کہ خدا بھی صرف انہی افراد و اقوام کی مدد کرتا ہے، جو پہلے اپنی مدد آپ کریں!

جب تلک اک قوم میں جذبہ نہ ہو اصلاح کا
اس کی حالت کو بدلتا ہی نہیں ہرگز خدا
یاد رکھ سخت کوشی سے ہے ملت کا نکھار
فرد کو بھی سعیِ پیہم ہی کا ملتا ہے ثمر!
محنت و تدبیر کو صورت گرِ تقدیر کر!
عزم و استقلال سے دنیا نئی تعمیر کر!

اقبالیات

اقبال قرآن کی روشنی میں	قاضی محمد ظریف
قرآن حکیم کی روشنی میں کلامِ اقبال کا تجزیہ	قیمت -/۱۲ روپے
رموزِ اقبال	میر ولی الدین
اقبال کی فنی عظمتوں کا مطالعہ	قیمت -/۷ "
عرفانِ اقبال	بشیر مخفی
علامہ اقبال کے تصورات خودی پر اعلیٰ ترین کتاب	قیمت -/۱۰ "
اقبال اپنے آئینے میں	رئیس احمد جعفری
اقبال کا کلام اس کی شخصیت کے آئینے میں	قیمت -/۲۰ "
اشاراتِ اقبال	عبدالرحمٰن طارق
کلامِ اقبال کے اشارات و تلمیحات کی مکمل لغت	قیمت -/۱۰ "
اقبال کی پیش گوئیاں	ڈاکٹر ہاشمی
مستقبل کے متعلق کلامِ اقبال میں اشارات کا جائزہ	قیمت -/۷ "
اقبال اور عشقِ رسولؐ	رئیس احمد جعفری
"کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں" کا بسیط مطالعہ	قیمت -/۲۰ "
اقبال اور حبِ اہلِ بیت اطہار	محبوب علی زیدی
موضوع کے لحاظ سے منفرد کتاب	قیمت -/۱۲ "
مئے لالہ فام	ڈاکٹر جاوید اقبال
علامہ اقبال پر مقالات کا مرقع	قیمت -/۱۵ "

سرگذشت الفاظ — مولوی احمد دین
مطالعہ الفاظ پر اردو میں پہلی کتاب — قیمت -/۶ روپے

محاوراتِ نسواں — وزیر بیگم ضیاء
قلعہ معلی کی ٹکسالی زبان اور محاورات — زیر طبع

انتخابِ ادب

اردو ادب کے آٹھ سال — عشرت رحمانی
اردو ادب کے آٹھ سالوں کی نگارشات کا انتخاب — قیمت -/۱۸ روپے

پھول کی پتی ہیرے کا جگر — انتخاب ہیلن فیرس ترجمہ: بلال احمد زبیری
نیک سیرت نوجوان لڑکیوں کی بہادری کی کہانیاں — قیمت -/۱۰ "

اینڈرسن کی کہانیاں — ریاض جاوید
اینڈرسن کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ — قیمت -/۴ "

ادبی کہانیاں — نسیم امروہوی
تلمیحات اور ان کی وضاحت — قیمت -/۶ "

ادبستان — خلیق دہلوی
حضرت خلیق دہلوی کی نگارشات — قیمت ۴/۵۰ "

گل کدہ — رئیس احمد جعفری
مختلف موضوعات پر تحریروں کا دل کش مجموعہ — قیمت -/۱۵ "

احسن الکلام — ارمان سرحدی
متنوع موضوعات پر فکر انگیز نگارشات — قیمت -/۱۵ "

دانش کدہ — محمد صدیق خیر آبادی
اسلامی دینی موضوعات پر اچھوتی تحریریں — قیمت -/۱۵ "